رفتار سے زیادہ سمت کا درست ہونا ضروری ہے

کروڑوں لوگوں کی سوچ بدل دینے والے سٹیفن کووے کی مقبول ترین کتاب کی باتیں

ہڈیوں کے لیے 5 مفید غذائیں

نیا انداز

اُردو ڈائجسٹ

/urdudigest.pk

اکتوبر 2012

روزگار کی دُنیا

کیا آپ خوشی سے کام پر جاتے ہیں؟

PDFBOOKSFREE.PK

آن لائن شاپنگ

اب پاکستان میں بھی

عظیم پریم جی

رفاہی کاموں کی نئی پہچان

بھارت کا مسلمان بل گیٹس

پیسا آنے کے بعد بھی خاندانی کام نہیں چھوڑا

ہیئر سٹائلسٹ کی کہانی

حیران کُن عروج

Rs:90

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُردو ڈائجسٹ

اکتوبر ۲۰۱۲ء ذیقعد ۱۴۳۳ھ
جلد نمبر ۵۲ شمارہ ۱۰

www.urdudigest.pk

صدر مجلس ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ الطاف حسن قریشی
مینیجنگ ایڈیٹر طیب اعجاز قریشی

مدیر اختر عباس
مجلسِ تحریر حافظ افروغ حسن ، سید عاصم محمود ، صغیرہ بانو شیریں
نوید اسلام صدیقی ، سلمیٰ اعوان ، اظہر بن مظہر
مہتمم طباعت فاروق اعجاز قریشی انچارج کمیونیکیشن افنان کامران قریشی
ڈیزائنر عبدالوہاب پروف ریڈر کلیم اللہ فاروقی
سب ایڈیٹر ویب عاطف مرزا

مارکیٹنگ/اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ احمد فیاض 0322-7474010
لاہور ندیم حامد 0300-4242620
گجرات/گوجرانوالہ احسان اللہ بٹ 0300-9620294

سالانہ خریداری

خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے

subscription@urdu-digest.com فون: +92-42-37589957

اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

330 روپے کی شاندار بچت کے ساتھ

پاکستان 1080 کے بجائے 750 روپے میں
بیرونِ ملک 50 امریکی ڈالر

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731

editor@urdu-digest.com

مزید تفصیلات صفحہ نمبر ۷ پر

قیمت: 90 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے جسارت پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر 19-21 ایکڑ سکیم سمن آباد لاہور سے شائع کیا

مینجنگ ایڈیٹر نوٹ

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝

اور یہ کہ ہر انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی۔ (سورۃ النجم آیہ ۳۹)

جب جب میں اس آیت کو پڑھتا ہوں میرے ذہن کے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہماری ۹۹ رفیصد مشکلات کی واحد وجہ اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے رہنا ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی بدلنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے آج کے حالات کی ۱۰۰ رفیصد ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔ اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار دوسروں یعنی سیاستدانوں، جرنیلوں، ججوں، بیوروکریسی یا نظام کو ٹھہرانے سے اصلاح ممکن نہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم ہمیشہ سے اپنے حالات بدلنے کی طاقت رکھتے اور اپنے خوابوں کے مطابق مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتے تھے۔

ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، ہم ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ اگر کچھ بھی ہماری منشاء کے خلاف ہو تو ہمیں اپنے آپ ہی سے پوچھنا ہوگا کہ میں نے کیا غلط کیا؟ میں نے کیا سوچا تھا اور ایسا کیا غلط کیا کہ جس کا ایسا نتیجہ نکلا۔ میرے کن اقدام نے دوسرے شخص کو ناپسندیدہ فیصلے پر مجبور کیا؟ اگلی بار میں کیا ایسا مختلف کروں کہ نتائج میری مرضی کے مطابق ہوں؟ ہم ذمہ داری لینے کے بجائے موسم، کمزور معیشت، پیسے کی کمی، کم علمی، حکومتی نااہلی، سیاسی جماعتوں کی کمزوری اور حتیٰ کہ اپنی شریکِ حیات، بھائی، بیٹے اور کاروباری شراکت دار کو بھی اپنی اور ملک کی ناکامیوں کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ہمارے کھلاڑی بھی کبھی سہولتوں کے فقدان اور کبھی کوچ کو اپنی خراب کارکردگی کا قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سب مسائل اور عوامل ہی تمام ناکامیوں کی اصل وجہ ہیں تو پھر کوئی بھی ملک اور پاکستانی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہ کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ اور ممالک ایک جیسی مشکلات اور مسائل کے باوجود کامیاب ہو جاتے ہیں۔

نامساعد حالات کے باوجود ہم کرکٹ، ہاکی اور اسکوائش کے ورلڈ چیمپئن رہے، دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت بنے، سیلاب اور زلزلوں کی تباہ کاریوں کا یکجا ہو کر مقابلہ کیا، عدلیہ کی بحالی کے لیے متحدہ جدوجہد کی، پی آئی اے اور اسٹیل مل کو دنیا میں بہترین ماڈل بنایا، امریکا اور چین کے تعلقات میں شاندار کردار ادا کیا اور مڈل ایسٹ کے بہت سے ممالک کو معاشی اور فنی مدد فراہم کی۔ حال ہی میں ایک تندور پر نان لگانے والے طالب علم نے گریجوایشن کے امتحان میں صوبہ بھر میں اول پوزیشن حاصل کی۔ کامیاب لوگ اور ممالک اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کو پہچان کر ان پر قابو پا لیتے ہیں اور یہ مجبوریاں ان کی بیڑیاں نہیں بنتیں۔

اصل میں یہ ہم ہی ہیں جو اپنے آپ کو روک لیتے اور اپنی سوچ کو محدود کر لیتے ہیں حتیٰ کہ ہر معاملہ کے آغاز میں ہی اپنی شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔ اپنی بُری عادات مثلاً سگریٹ نوشی وغیرہ کی بھی ناقابلِ حل توجیہات پیش کرتے ہیں۔ ہم مسئلہ کے کسی بھی ممکنہ حل کے لیے تجویز اور مشورہ سننا پسند ہی نہیں کرتے۔ مسلسل علم حاصل کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کی سعی میں ناکام رہتے ہیں۔ ہمارا زیادہ تر وقت زندگی کے ادنیٰ ترین اور کم اہمیت والے پہلوؤں پر ضائع ہوتا ہے۔ غیر صحت مند غذا کھاتے ہیں، ورزش کرنا ہماری زندگیوں سے نکل چکا، آمدنی سے زیادہ خرچ کرنا ہمارا معمول بن گیا ہے اور مستقبل میں سرمایہ کاری ہمارے لیے اہم نہیں۔ سچ سننے اور بولنے کے بجائے ہم اپنی مرضی کا سچ سننے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ پھر حیران ہوتے ہیں کہ ہمارے حالات کیوں نہیں بدلتے۔ ہم ایک بہتر زندگی کے مستحق کیوں نہیں؟

ہمیں اپنے ذہن میں پہلے سے بنی شکست خوردگی کی تصویر کو مٹانے کے ساتھ اپنا ردِعمل اور رویہ بدلنا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی سے ہم میں سے اکثر اپنی منفی سوچ یا عادتوں کے مطابق ردِعمل دینے پر مجبور ہیں۔ ہم اپنے موڈ اور عادات کے مطابق ہی اپنی شریکِ حیات، بچوں، دفتر کے ساتھیوں، کسٹمرز اور اپنے سٹوڈنٹس، حتیٰ کہ دنیا کو رسپانس دیتے ہیں۔ ہم مجبوری و بے بسی کی گٹھڑی بن چکے ہیں۔

ہمیں اپنی سوچ، خیالات، خوابوں اور رویوں پر قابو پانا ہوگا۔ جو کچھ ہم سوچیں، کہیں اور کریں، وہ سب کچھ اپنی آزادانہ مرضی سے اور طے شدہ اہداف اور مقاصد کے تابع کرنا ہوگا۔

اس ماہ ۱۰۷ سال پر محیط آپ بیتی 'رائل ہیئر سیلون' کو کور سٹوری بنایا گیا ہے۔ یہ کہانی نہایت دلچسپ اور ہمارے معاشرے میں مثبت تبدیلی کی واضح نشانی ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

اس ماہ کے لیے میرا انتخاب

17 بھنور کی گرہ کیونکر کھلے
57 رفتار سے زیادہ سمت کا درست ہونا ضروری ہے
81 کام کی دنیا

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے اور لطف اُٹھائیے

tayyab.aijaz@urdu-digest.com

فہرست

بھنور کی گرہ کیونکر کھُلے

ہمارے کھیون ہار ہر سفر کے آغاز پر اُمیدوں کے جزیروں تک پہنچ جانے کے سہانے خواب دکھاتے اور کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر سالہا سال گزر جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو اپنے اعمال کے خوفناک بھنور ہی میں چکر کاٹ رہے ہیں۔ شاید اس بار فطرت ہمیں ایک بڑا موقع دینے کے لیے اسباب پیدا کر رہی ہے

17 الطاف حسن قریشی کے قلم سے

در دل پہ دستک
اعلانات کی بے اثری بے وُقعتی اور بے توقیری 284

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فہرست

اکتوبر 2012

سرِ ورق پر

اسلامی گوشہ

ناممکن حج کیسے ممکن بنا؟ 28

حضرت طلحہؓ کا ایمان افروز تذکرہ 33

حضرت علیؓ کی بیش قیمت نصیحت 41

14	کچھ اپنی زبان میں	الطاف حسن قریشی
71	باتیں دانش کی	رفیدہ کلیم فاروقی
97	موچی کا لڑکا	محمد محبوب حسن کانجو
101	جانور اور کھیل	محمد خلیل چودھری
113	۵/عظیم اساتذہ	ماہ نور فیصل
125	نمک کا اثر	نگہت یاسمین
130	خوشگوار بڑھاپا	امجد اسلام امجد
132	وہ ۲/قبریں	حبیب اشرف صبوحی
135	انسانی بم	عالیہ شاہ
139	حیرت کدہ میں ۴۲/رون	مشتاق معینی
145	محیرالعقول واقعات	پروفیسر عطاالحق سجانی
148	بارہ سنگا کا شکار (شکاریات)	صبا شفیق
153	اصلاحِ زبان	پروفیسر محمد بابر انور
157	ہم کسی سے کم نہیں	تحریم حنا صدیقی
221	میڈیا کا ایک فیصلہ	ظہیر احمد بابر
252	حاملہ خواتین کیا کھائیں؟	ڈاکٹر تحسین گیلانی
257	وزن کم کریں صحت نہیں	نوشین ناز
262	مشورہ حاضر ہے	صغیرہ بانو شیریں
265	کتابوں کی کہکشاں	نوید اسلام صدیقی
271	ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں	وصی شاہ
274	قصہ کوئز	محمد خلیل چودھری
276	ماہِ اکتوبر کی شخصیات	ادارہ
278	چمن خیال	قارئین کے مشورے، شکایات
288	اسلامی کوئز	ادارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

آپ ﷺ کا احترام

اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبیؐ کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو ان سے اس طرح نہ بولو۔ کہیں اکارت نہ ہو جائیں تمھارے (اچھے) اعمال اور تم کو خبر بھی نہ ہو O جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس دبی آواز سے بولتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو ادب کے واسطے جانچ لیا ہے اور ان کے لیے بخشش اور بڑا ثواب ہے O جو لوگ تم کو دیوار کے پیچھے سے پکارتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں O اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تم خود باہر نکلتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے O

(حجرات ۴۹: ۵۔۲)

رسول ﷺ کا فرمان

امت کی بخشش کے لیے آپؐ کی تڑپ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا ”میری اور (میری امت کے) لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص آگ روشن کرتا ہے اور جب اس کے چاروں طرف روشنی پھیل جاتی ہے اور پتنگے، پروانے جو آگ میں گرا کرتے ہیں آ آ کر اس آگ میں گرنے لگتے ہیں تو وہ شخص ان کو کھینچتا اور روکتا ہے لیکن وہ نہیں رکتے اور آگ میں گر جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میں تم کو تمھاری کمر پکڑ کر جہنم کی آگ میں گرنے سے روکتا ہوں لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ جہنم میں گرے جاتے ہیں۔“

(بخاری کتاب ۸۱۔ باب ۲۶: مسلم کتاب الفضائل۔ باب ۶

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ اپنی زباں میں

ہمہ گیر محبّت عام کرنے کی ضرورت

مسلمانوں

کے جذبات میں آگ لگا دینے والی امریکی فلم کے خلاف مراکش سے انڈونیشیا اور برطانیہ سے آسٹریلیا تک جو وسیع پیمانے پر احتجاج کا سلسلہ جاری ہے، اِس نے اہلِ مغرب کو بھی ہلا ڈالا ہے اور پاکستان میں ایک تہلکہ سا مچا دیا ہے۔ بڑی طاقتوں پر یہ بھیانک حقیقت اُجاگر ہوگئی ہے کہ یورپ اور امریکا میں آباد ایک چھوٹا سا گروہ عالمی امن کے لیے ایک مہیب خطرہ اور زمین پر فساد پھیلانے کا باعث بنتا جا رہا ہے۔ امریکی حکمرانوں تک یہ پیغام پہنچ گیا ہے کہ بیشتر مسلمان ملکوں میں اُن کے سفارت خانے غیر محفوظ ہوتے جا رہے ہیں اور دنیا کی بہت بڑی آبادی ''آزادیٔ اظہار'' کے نام پر مذہبی شخصیتوں کی توہین کے سخت خلاف ہے۔

آنکھیں کھول دینے والا یہ پہلا واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی شان میں گستاخانہ فلم کی دوسرے مذاہب کے راہنماؤں نے بھی شدید مذمت اور عالمی احتجاج میں شرکت کی ہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں پہلی بار وکلاء برادری نے فلم کی مذمت میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے اور عام شہری غیر معمولی تعداد میں حرمتِ رسولؐ پر کٹ مرنے کے لیے دیوانہ وار سڑکوں پر نکل رہے ہیں، تاہم نظم، سمت اور قیادت کے فقدان اور اربابِ اقتدار کے بعد از وقت اقدامات کے باعث اِس مقدس احتجاج میں عام آدمی کا وہ غصہ اور انتقام بھی شامل ہو گیا جو اُس کے اندر سالہا سال سے بدترین حکمرانی کے خلاف پرورش پاتا رہا ہے۔ بعض شر پسند عناصر کی طرف سے قتل اور غارت گری سے عاشقانِ نبیؐ کے اوپر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

تہذیبوں کے درمیان تصادم کو ہوا دینے والے عاقبت نااندیش دانشوروں، فنکاروں اور فلم سازوں کی فتنہ سامانیوں کا مؤثر سدِ باب اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ منصوبہ بندی سے عالمگیر محبّت عام کی جائے، بین المذاہب مکالمے کو وسعت دی جائے اور عالمی رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے عالمی سطح پر مذہبی اسکالرز، بین الاقوامی قانون اور علوم ابلاغ عامہ کے ماہرین پر مشتمل ایک مضبوط پینل تشکیل دیا جائے۔ اس طرح مربوط اور متواتر کوششوں سے جنرل اسمبلی سے یہ کنونشن منظور کرایا جا سکتا ہے کہ تمام پیغمبروں اور الہامی کتابوں کے خلاف کسی قسم کی ہرزہ سرائی ایک قانونی جرم ہوگا۔ اگر مسلم زعماء دنیا پر یہ حقیقت واضح کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ مشرق اور مغرب کے لیے رحمتِ تمام اور اپنے ساتھ پوری انسانیت کے لیے مساوات، آزادی اور معاشرتی عدل کا منشور لے کر آئے تھے اور وہ انسانیت کو اخوت کے رشتوں میں پرو دینے کا مشن اُمتِ وسط کو سونپ کر گئے ہیں، تو زیادہ تر فتنے سرد پڑ جائیں گے اور مغرب ''آزادیٔ اظہار'' کے ضرر رساں پہلوؤں کی اصلاح کے لیے یقینی طور پر آمادہ ہو جائے گا کہ اسی میں اُس کی فلاح اور حیات ہے۔

الطاف حسن قریشی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

بھنور کی گرہ کیونکر کھُلے

ہمارے کھیون ہار ہر سفر کے آغاز پر اُمیدوں کے جزیروں تک پہنچ جانے کے سہانے خواب دکھاتے اور کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں، مگر سالہا سال گزر جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو اپنے اعمال کے خوفناک بھنور ہی میں چکر کاٹ رہے ہیں شاید اس بار فطرت ہمیں ایک بڑا موقع دینے کے لیے اسباب پیدا کر رہی ہے حالات کے بہاؤ کا تجزیہ۔ الطاف حسن قریشی کے قلم سے

گزشتہ

کئی ماہ سے واقعات کے زیر و بم ہمیں ایک ایسی تعمیر کی طرف لے جا رہے ہیں جس میں خرابی کی بہت ساری صورتیں مضمر ہیں۔ سیاست کے سیلابوں نے جہاں زمین کی زرخیزی میں اضافہ کیا ہے، وہاں ناقابلِ تصور تباہی ہر سو مچا دی ہے۔ نوجوان اُمید کی نئی مشعلیں روشن کر رہے ہیں، جبکہ مفادات کے پجاری ایک نیا میدانِ کارزار تیار کرنے میں شب و روز مصروف ہیں۔ ۲۱ ستمبر کا دن کئی اعتبار سے مستقبل ساز ثابت ہو سکتا ہے اور اس کے بطن سے اَن ہونے واقعات جنم لیں گے۔ وقت سے پہلے حالات کا صحیح تجزیہ کر لیا جائے اور موقع پر درست سمت میں قدم اُٹھا لیے جائیں، تو طوفان ٹل جاتے ہیں، لیکن ہمارے منصوبہ ساز فیصلہ کن لمحات میں بھی تذبذب اور بے عقلی کی تصویر دکھائی دے رہے تھے۔ جب گستاخانہ فلم مصر میں ٹی وی پر دکھائی گئی اور لیبیا میں خوفناک ردِعمل سامنے آیا، تو ہمارے حکمرانوں کو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کر لینا چاہیے تھا۔ فوری طور پر صدر یا وزیراعظم قوم سے خطاب فرماتے، فلم کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کرتے اور امریکہ سے احتجاج کرنے کا مناسب راستہ اپناتے اور دینی، سیاسی اور سماجی قائدین سے مشاورت اور اُن کے تعاون سے قومی اور عالمی سطح پر ایک لائحہ عمل تشکیل دیتے اور او آئی سی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیتے، تو حالات قابو سے باہر نہ ہوتے۔ چند روز تک ہمارے اربابِ حل و عقد مہر بہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لب رہے، جبکہ عوامی جذبات ایک طوفان کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ جب معاملات قابو سے باہر ہو چکے تو اچانک وفاقی کابینہ کا اجلاس طلب کیا گیا۔ اس وقت اسلام آباد کے ماحول پر سراسیمگی طاری تھی اور مظاہرین ہر قیمت پر ڈپلومیٹک انکلیو میں داخل ہو کر امریکی سفارت خانے تک اپنا احتجاج پہنچانا چاہتے تھے، جبکہ پولیس اُن کے آگے ایک آہنی دیوار بنی ہوئی تھی اور عوامی جوش و خروش کے مقابلے میں غیر معمولی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس فضا میں کابینہ کے ارکان شدید تذبذب کا شکار اور امریکی طرزِ عمل کے شاکی تھے۔ بحث کے دوران شیخ وقاص اکرم نے کہا کہ ملعون فلم ساز واجب القتل ہے اور میں اسے جہنم رسید کرنے میں بہت فخر محسوس کروں گا۔ وزیرِ مملکت جناب معظم خاں جتوئی نے عندیہ دیا کہ وہ حرمتِ رسولؐ پر اپنا منصب قربان کر دینے کو بہت بڑی سعادت سمجھیں گے، جبکہ وفاقی وزیر جناب غلام احمد بلور دہشت گرد پادری کے سر کی قیمت ایک لاکھ ڈالر مقرر کر چکے ہیں جس کے باعث وزیرِاعظم اور اے این پی کے سربراہ پر امریکی دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

گہرے ذہنی تحفظات کے درمیان کابینہ نے قدرے گھبراہٹ میں ۲۱ ستمبر کو یومِ عشقِ رسولؐ منانے کے لیے تعطیل کا اعلان کر دیا جس میں خوف کا عنصر شامل تھا۔ حکومت ایک طرف یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ سرکاری سطح پر گستاخانہ فلم کے خلاف احتجاج میں حصہ لے رہی ہے، جبکہ دوسری طرف یومِ تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ کو یومِ عشقِ رسول ﷺ کا نام دے کر وہ امریکی برہمی سے بچنے کا راستہ اختیار کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ اتنی عجلت اور افراتفری میں ہوا کہ ''یومِ عشقِ رسولؐ '' کو پُرامن طریقے سے منانے کے مطلوبہ انتظامات نہیں کیے جا سکے۔ انتظامی سطح پر وزیرِاعظم کو تمام وزرائے اعلیٰ کو اعتماد میں لینا اور وزیرِ داخلہ کو صوبوں کے پولیس سربراہوں سے قریبی رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا تاکہ امنِ عامہ کا سنگین مسئلہ پیدا نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ انتہائی نازک مرحلے میں سیاسی اور دینی قائدین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا لازمی تھا۔ اِن ضروری اقدامات میں سے ایک بھی قدم نہیں اُٹھایا گیا۔ سب سے زیادہ غضب یہ ہوا کہ موبائل فون سروس بڑے بڑے شہروں میں بند کر دی گئی جس کے نتیجے میں بیشتر ارکانِ اسمبلی اور انتظامی عہدے دار اِن لوگوں سے رابطہ نہ کر سکے جو چھوٹے چھوٹے جلوسوں کی قیادت کر رہے تھے۔ ۲۱/ستمبر کے روز بلا مبالغہ دس پندرہ لاکھ شہری سڑکوں پر اُمنڈ آئے تھے، مگر وہ قیادت اور نظم کی اسپرٹ سے محروم اور بے سمتی کا شکار تھے۔ اُن کا ہدف مغربی سفارت خانے اور قونصل خانے تھے جہاں وہ اجتماعی عرضداشت پیش کرنا چاہتے تھے، مگر اُنہیں اس طرف جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہ اپنا احتجاج ریکارڈ کرانے کے لیے پارلیمنٹ ہاؤس بھی نہ جا سکے۔ جناب عمران خان کے سوا کوئی بڑا سیاسی لیڈر مظاہرین کی قیادت کرتا دکھائی نہیں دیا۔ اسی طرح عوام کو مولانا فضل الرحمٰن، مفتی منیب الرحمٰن، قاضی حسین احمد، مولانا ثروت قادری، مولانا سمیع الحق اور حافظ محمد سعید نظر نہیں آئے۔ قیادت کے اِس خلا میں دلآزار امریکی فلم کے خلاف احتجاج میں وہ غصہ اور قہر بھی شامل ہو گیا جو بدامنی، مہنگائی، بے روزگاری اور حکمرانوں کی نااہلیوں اور ناانصافیوں پر سالہا سال سے کھولتا چلا آ رہا ہے۔ لاکھوں کے اجتماعات میں وہ جرائم پیشہ عنصر بھی در آیا جو ایک مدت سے جلاؤ گھیراؤ، لوٹ مار اور ٹارگٹ کلنگ کی مشق کرتا چلا آیا ہے اور اُس کے آگے قانون نافذ کرنے والے ادارے بڑی حد تک بے بس ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

اجتماعی احتجاج کا سلسلہ ہنوز جاری ہے جس میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ، وکلاء، تاجر، سماجی تنظیمیں اور مختلف مذاہب کے پیروکار حصہ لے رہے ہیں۔ برازیل میں یہودیوں اور عیسائیوں نے اِس گستاخانہ فلم کے خلاف جلوس نکالے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچ جانے پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے، جبکہ یورپی یونین اور افریقی یونٹی کونسل نے اس شر انگیز فلم کی شدید مذمت کی ہے۔ او آئی سی نے مشاورتی اجلاس طلب کر لیا ہے اور عرب لیگ عالمی کنونشن کے انتظامات کو آخری شکل دے رہی ہے۔ امریکہ اور یورپ کے مختلف ممالک میں اسلامی تنظیمیں خاصی متحرک ہیں جو شہریوں میں یہ احساس پیدا کر رہی ہیں کہ بقائے باہمی کے لیے پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کا تقدس قائم رکھنا ازبس ضروری ہے۔ پوری دنیا میں یہ شعور روز افزوں ہے کہ ''آزادیٔ اظہار'' کے پردے میں کسی بھی فرد کے مذہبی جذبات پامال کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مختلف اسباب سے ہر ملک میں انتہا پسند طبقے فعال ہیں جو اپنی بقا کے لیے نت نئے شوشے چھوڑتے اور تشدد کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں بھی ایسے گروہ سرگرمِ عمل ہیں جو طاقت کے زور پر اپنی پسند کی شریعت نافذ کرنے کے لیے دہشت گردی پر اُتر آئے ہیں۔ صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے اُن عناصر کے مؤثر سدِ باب کے لیے اسلام کی سچی تعلیمات کا ابلاغ اور اُن کا نفوذ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ گستاخانہ فلم کے خلاف دنیا کے مختلف حصوں میں احتجاج کی جو لہر اُٹھی ہے، اس کی بدولت مغرب میں اسلام کے مطالعے کا رجحان حیرت انگیز طور پر بڑھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا ہے اور اذہان عظیم سچائی کی جستجو میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ایسے میں عالمِ اسلام پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ متوازن اور حکمت بھری منصوبہ بندی کے ذریعے اہلِ مغرب کے سامنے اسلام کا اصل چہرہ اُجاگر کرتا رہے اور جدید ترین کمیونی کیشن سسٹم کے ذریعے برتر افکار اور تعلیمات کو اذہان و قلوب میں اُتارنے کا عمل ایک تسلسل اور تواتر سے جاری رکھ سکے کہ یہ عہد فکری، علمی و سائنسی فتوحات کا ہے۔

ہمیں گستاخانہ خاکوں، کارٹونوں اور فلموں پر ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بجائے پورے مسئلے کو تاریخی پس منظر میں سمجھنا اور اِس کا موزوں حل تلاش کرنا چاہیے۔ دراصل یورپ کے عیسائی حکمران گیارہویں صدی کے آخر سے شروع ہو کر سولہویں صدی تک پھیلی ہوئی صلیبی جنگوں میں حصہ لیتے رہے۔ پہلے دور میں بیت المقدس فتح کرنے اور وہاں سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے پورا یورپ اُمڈ آیا تھا جسے آخر کار سلطان نور الدین زنگیؒ اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں شکست کھانا پڑی اور دوسرے دور میں دولتِ عثمانیہ کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی خاطر پوپ کے اُکسانے پر آسٹریا، جرمنی، ہنگری، البانیہ، بوسنیا سربیا اور ولاچیا کی متحدہ فوجیں لاکھوں کی تعداد میں ایک طوفان کی طرح بار بار حملہ آور ہوتی رہیں۔ اس طویل مہم جوئی اور پسپائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کے عیسائیوں میں اسلام کے خلاف ایک تعصّب پروان چڑھا اور اُن کی نفسیات کا حصہ بن گیا، حالانکہ مسلمان بیشتر صورتوں میں اپنے دفاع کی جنگ لڑنے پر مجبور ہوئے تھے اور اُنہوں نے اپنے دورِ حکومت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ روا رکھا اور اُنہیں جان و مال کے تحفّظ کے علاوہ مکمّل مذہبی آزادیاں دی تھیں۔ صلیبی جنگیں جو زیادہ تر پوپ کی اپیل پر لڑی گئی تھیں، اُن کے خاتمے پر یورپ میں کلیسا کے خلاف بغاوت نے زور پکڑا، کیونکہ پادریوں نے شہریوں کی زندگیاں اجیرن بنا دی تھیں۔ سائنس کی ہر دریافت کی شدید مخالفت کی تھی اور حکمرانوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں دبوچ رکھا تھا۔ تحریکِ احیائے علوم نے عوام کے اندر جو بیداری پیدا کی، اُس نے پاپائیت کو ریاست کے معاملات سے یکسر بے دخل کر دیا اور مذہبی پیشوا عوام کی گہری نفرت کی علامت بن گئے۔ اس طرح یورپ میں اسلام کے خلاف کدورت اور عیسائی پاپائیت کے بارے میں بے زاری اور حقارت پروان چڑھتی رہی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں کی سلطنتیں زوال پذیر ہوئیں تو برطانیہ، فرانس، پرتگال اور ہالینڈ نے مختلف مسلمان ملکوں میں اپنی نو آبادیات قائم کر لیں، مگر اُن کے اندر مزاحمتی تحریکیں زور پکڑتی گئیں۔ چنانچہ بدیسی حکمرانوں کو شدت سے احساس ہوا کہ مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لیے اُن کی تاریخ مسخ کرنا اور اُن کی ایمانی قوت کے اصل مراکز، قرآنِ حکیم اور پیغمبرِ اعظم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کو متنازع بنانا اور اُن پر حرف زنی کرتے رہنا بے حد ضروری ہے، لہٰذا مستشرقین (Orientalists) کی ایک جماعت اِس کام کے لیے تیار کی گئی جنہوں نے عربی زبان پر دسترس حاصل کی، مسلمانوں کی تاریخ کا منفی زاویوں سے مطالعہ کیا اور حکومتی وسائل اور اقتدار کے بل بوتے پر اسلام، قرآن اور نبی پاکؐ پر رکیک حملے شروع کر دیے۔ ایسی کتابیں

شائع کی گئیں جن میں یہ ثابت کرنے کی ناپاک جسارت کی گئی کہ نعوذ باللہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے، جبکہ احادیث کی سرے سے کوئی تاریخی حیثیت نہیں اور حضرت محمد ﷺ نے تلوار کے ذریعے اسلام پھیلایا اور اُن کی زندگی میں خوفناک تضادات پائے جاتے تھے۔

☆☆☆

برطانیہ جس نے ہندوستان میں چالبازیوں اور اسلحے کی برتری سے مسلمانوں سے حکومت چھین لی تھی، وہ اس خطے کے اسٹریٹجک اہمیت کے حامل ملک افغانستان پر قبضہ جمانا چاہتا تھا، چنانچہ اُس نے تین افغان جنگیں لڑیں اور اسے ہر بار ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ افغانستان کی دوسری جنگ میں اِس کی فوجوں کا ایسا صفایا ہوا کہ تباہی کی بپتا سنانے کے لیے صرف ایک ڈاکٹر زندہ بچا۔ برطانیہ نے اِس بدترین شکست کے اسباب معلوم کرنے کے لیے تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جس نے فقط ایک سطری سفارش کی کہ مسلمانوں کے بدن سے روحِ محمد ﷺ اور جذبۂ جہاد نکال دو۔ اِس ایک نکاتی سفارش کے بعد مرزا غلام احمد نے ہندوستان میں نبوت کا دعویٰ کیا اور اس نکتے کو اپنی تعلیمات کا بنیادی پتھر قرار دیا کہ حالات کے بدل جانے سے جہاد کا حکم ساقط ہو چکا ہے اور تاجِ برطانیہ سے تعاون مسلمانوں کے عظیم تر مفاد میں ہے۔ مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے ''احمدیوں'' کو مسترد کرتے ہوئے اِس کے خلاف زبان اور قلم سے جہاد جاری رکھا اور آخر کار ستمبر ۱۹۷۵ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے ''احمدیوں'' کو اسلام سے خارج قرار دے دیا جس کا پوری اُمتِ مسلمہ میں خیر مقدم کیا گیا۔ اِس کے بعد اقلیت کی حیثیت سے مسلمانوں پر اُن کی جان و مال کے تحفّظ کی ذمے داری عائد ہوتی ہے اور اُن کے بنیادی حقوق کی ضمانت بھی لازمی قرار پائی ہے۔

یورپ، برطانیہ اور امریکا میں وہ پس منظر بتدریج تبدیل ہو رہا ہے جسے سامراجی طاقتوں نے اپنی بالادستی برقرار رکھنے کے لیے پروان چڑھایا تھا۔ تاہم جہاد کی روح فنا کرنے کی مختلف سطح پر کوششیں زیادہ شدومد سے جاری ہیں، کیونکہ امریکا افغانستان میں اپنی بقا کی آخری جنگ لڑ رہا ہے اور اسے اپنا وہی انجام نظر آ رہا ہے جس سے ۸۰ء کے عشرے میں سویت یونین دوچار ہوا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ اور امریکا میں انتہائی محدود سطح پر وہ مائنڈ سیٹ آج بھی موجود ہے جو سرورِ کونین ﷺ کی شان میں گستاخی کو ''آزادیٔ اظہار'' کے تحت اپنا حق سمجھتا ہے۔ مگر گزشتہ پون صدی میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں اور تعصّبات کے بند ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ پہلے فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی، روسی، یونانی اور انگریزی زبانوں میں قرآنِ حکیم کے معتبر اور شفاف ترجمے دستیاب نہ تھے اور اہلِ مغرب مستشرقین کی گمراہ کن تخلیقات ہی پر انحصار کرنے پر مجبور تھے، لیکن آج اعلیٰ پائے کا اسلامی لٹریچر ہر زبان میں بکثرت موجود ہے۔ آنحضرتؐ کی سیرت پر مستند کتابیں دستیاب ہیں اور خود انگریز مصنفین کے قلم سے اُن کی زمان و مکاں سے ماورا شخصیت پر قابلِ قدر تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ مستشرقین کے اعتراضات کے مدلل جواب ہر شہر کی لائبریریوں تک پہنچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے ہیں۔ علاوہ ازیں بلند معیار کی دیدہ زیب کتابیں مغرب میں نوجوانوں، استادوں اور محققین کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں، جن کے مطالعے سے خاصی بڑی تعداد اسلام کو پورے شعور کے ساتھ قبول کر رہی ہے اور ماضی کا ذہنی قبض ٹوٹتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ آج یورپ اور امریکا میں ہنر مند اور تعلیم یافتہ مسلمان آباد ہیں جن کا سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی اثر و رسوخ تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اُن کی بصیرت اور عملی فراست سے بین المذاہب مکالمے کی اہمیت ہر سطح پر محسوس کی جا رہی ہے اور مغربی اقوام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں کہ مسلمان وحشی ہیں نہ خنجر بدست، بلکہ عصری تقاضوں کا گہرا ادراک رکھتے اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف اور بلند آفاقی تصورات کے حامل ہیں۔ مستشرقین نے مسلمانوں کی جو خوفناک تصویر کشی کی تھی، مشاہدے اور تجربے نے اُن کے جھوٹ کا پول کھول دیا ہے اور باہمی اعتماد کی فضا وجود میں آ رہی ہے۔

☆☆☆

اس فضا کو ماضی کی عصبیتوں اور کدورتوں کی آلودگی سے پاک صاف رکھنے کے لیے مسلم دانش وروں، معلموں اور حکمرانوں پر گراں قدر ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ آنے والے دور میں خیر اور شر کی جنگ اسلحے سے زیادہ افکار کی طاقت سے لڑی جائے گی جس میں پرنٹ، الیکٹرانک کے علاوہ سوشل میڈیا کلیدی کردار ادا کرے گا۔ مسلم اُمہ کو سارے مذاہب کے بلند نگاہ عناصر کے تعاون سے ایک ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیے جس میں پیغمبروں، مذہبی پیشواؤں اور مقدس کتابوں کی تضحیک عالمی جرم قرار پائے۔ یہ مقصد جنرل اسمبلی میں گستاخانہ فلم کے خلاف محض قراردادِ مذمت پیش کرنے سے حاصل نہیں ہوگا، بلکہ اِس کے لیے مستقل مزاجی اور بالغ نظری سے لابنگ کرنا اور مقتدر حلقوں کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ مسلمانوں کا اپنے ہادیٔ برحق ﷺ کے ساتھ عقیدت کا پیمانہ اُس پیمانے سے یکسر مختلف ہے جو عیسائیوں کا حضرت عیسیٰؑ سے اظہارِ محبّت کا ہے۔ اِس پیمانے پر وقفے وقفے سے ضرب لگاتے رہنے کا نتیجہ امنِ عالم کی تباہی کی صورت میں نکل سکتا ہے اور وہ توازن بھی بگڑ جائے گا جو مغرب اور مسلمانوں کے درمیان اب تک قائم ہے۔ یہودیوں نے مضبوط لابنگ اور سرمائے کی طاقت پر ''ہولوکوسٹ'' کے خلاف زبان کھولنے کو قابلِ تعزیر عالمی جرم ٹھہرایا، تو اسی طرح سارے مذاہب کے نمائندے مل کر اقوامِ متحدہ سے یہ کنونشن منظور کرا سکتے ہیں کہ کسی بھی پیغمبر اور کسی بھی الہامی کتاب کے بارے میں ہرزہ سرائی عالمی جرم ہوگا اور اِس کی سزا بہت کڑی ہوگی۔ اس کارِ عظیم کے لیے او آئی سی کو قائدانہ کردار ادا کرنا اور قانون دانوں، دانش وروں اور سیاسی قائدین کی ایک ایسی ٹیم تشکیل دینا ہوگی جو مغرب کے مقتدر اداروں اور تنظیموں میں نتیجہ خیز لابنگ کر سکے اور یورپ اور امریکا میں آباد مسلمانوں کے تجربات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اہداف حاصل کرنے تک جنگی بنیادوں پر کام کرتی رہے۔ اِس مقصد کے لیے ایک سیکرٹریٹ قائم کرنا اور بہترین صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھانا ہوگا۔

مسلم اُمہ کے زعماء کو اس ہدف سے آگے کی منزل کا ادراک اور اُس تک پہنچنے کی تیاری کا احساس کرنا ہوگا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ مسلمان میڈیا، تحقیق، جدید سائنسی علوم اور انکشافات میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اس لیے ان شعبوں میں دل کھول کر سرمایہ کاری کرنا ہوگی۔ ہماری زیادہ تر پریشانیوں کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہم اپنا مافی الضمیر اہلِ مغرب تک اُن کی زبان، اُن کے محاورے اور اُن کے نفسیاتی مزاج کے مطابق بروقت ادا نہیں کر پاتے جس کے باعث اُلجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سالہا سال کی مساعی کے بعد ہم عربی زبان میں ''الجزیرہ'' ٹی وی چینل قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جو بے حد قابلِ قدر پیش رفت ثابت ہوئی ہے، مگر ہماری پوری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ انگریزی، فرانسیسی، جاپانی اور چینی زبانوں میں بھی ٹی وی چینلز شروع کیے جائیں جن کے ذریعے حقیقی اسلامی تعلیمات کا ابلاغ وسیع پیمانے پر ہوتا رہے اور مسلمانوں نے انسانی تہذیب کی نشوونما اور ارتقاء میں جو عظیم الشان کردار ادا کیا ہے، اُسے نئی نسل کے سامنے اسی وقار اور شان کے ساتھ پیش کیا جائے کہ اسلام کی عظمت کا سکہ قائم ہو۔ ہمیں اپنی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ پائے کے مفکرّ، دانش ور اور ابلاغ ساز تیار کرنا ہوں گے جو مختلف زبانوں میں علوم و فنون، فلسفے اور تاریخ پر کامل قدرت کے ساتھ مغربی دانش وروں اور عوامی رائے عامہ کے قائدین کے ساتھ متانت اور علمی وجاہت سے مکالمہ کر سکیں۔ عہدِ حاضر کا گہرا ادراک رکھنے والے علماء کے مشوروں سے ایسی فلمیں تیار کی جانی چاہئیں جو تہذیبوں کے درمیان تصادم کے بجائے تعاون کی راہیں کشادہ کریں۔ ایک عشرہ پہلے میسج (message) کے نام سے فلم بنی تھی جس نے یورپ اور امریکا میں نوجوانوں پر اچھے اثرات مرتب کیے تھے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ قطر میں آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ پر ایک نئی فلم تیار کی جا رہی ہے۔ بفضلِ خدا ہمارے نوجوان سوشل میڈیا میں حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں، تاہم اُنہیں ایک ایسی بیدار مغز قیادت کی ضرورت ہے جو او آئی سی کے توسط سے پاکستان بھی فراہم کر سکتا ہے اور وہ تیز دماغ نوجوان بھی جو امریکا اور یورپ میں انفارمیشن ٹیکنالوجی پر بڑی دسترس رکھتے ہیں۔

☆☆☆

۲۱ ستمبر کے دن حُبِ رسولؐ کے پاکیزہ اظہار میں بے ہنگم لوٹ مار اور خون آشام غارت گری کا تجزیہ اور ذمے دار افراد کا سخت محاسبہ کرنا ضروری ہے۔ اِس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے کہ تمام عیسائی اور یہودی مسلمانوں کے دشمن اور بدخواہ نہیں۔ دراصل فساد کی جڑ وہ صیہونی ہیں جو اسلام سے شدید کد رکھتے ہیں اور ہمیں ان کے پروٹوکول کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ مزید برآں یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ یہودیوں نے چھوٹی سی اقلیت ہونے کے باوجود امریکی سیاست اور نظم و نسق میں غیر معمولی اثر و رسوخ کیسے حاصل کیا ہے۔ غائرانہ تجزیے سے معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی بھی رنگ، نسل اور علاقے سے تعلق رکھتے ہوں، ایک دوسرے کی بھلائی، ترقی اور خوشحالی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے لیے تعلیم، کاروبار اور میڈیا کا میدان منتخب کر کے اس میں بڑے بڑے معجزے تخلیق کیے ہیں۔ اُن کی مربوط کوششوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا ماحصل یہ ہے کہ بیشتر معروف امریکی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں یہودی پروفیسر بڑے نمایاں ہیں اور میڈیا اور بینکوں میں یہودی دماغ اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ یہ ایک سیاسی حقیقت ہے کہ کوئی امریکی صدر یہودیوں کی حمایت کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اُنہوں نے امریکا میں یہ مقام غیر معمولی ریاضت' بے مثل یک جہتی' کمال درجے کے نظم اور عمدہ منصوبہ بندی کی بدولت پایا ہے۔ چنانچہ ہمیں اُن پر صبح و شام تبرّیٰ بھیجنے کے بجائے اپنے اندر وہ صفات پیدا کرنی چاہئیں جو ہمیں امریکا میں وہ مقام دلاسکیں جو ایک ڈیڑھ صدی کی مسلسل محنت سے یہودیوں نے حاصل کیا ہے۔ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہم اُن سے کسی طرح کم نہیں' لیکن ہمارا مسئلہ ہر سطح پر قائدانہ صلاحیت اور منصوبہ بندی کے فقدان کا ہے۔ اِس حوصلہ شکن صورتِ حال کے باوجود ہمارے ذہین طالب علم' بلند پایہ سائنس دان' انجینئر' ڈاکٹر اور بینکار اپنی قابلیت کا گہرا نقش قائم کررہے اور مغرب کی رائے عامہ اور حکمرانوں پر اثر انداز ہو چکے ہیں۔

ہمیں آج کے عالمی تناظر میں اُس ارشادِ ربانی پر غور کرنا ہوگا جس میں یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کو اس کلمے کی طرف آنے کی دعوت دی گئی ہے جو اُن کے درمیان مشترک ہے۔ قرآن مجید میں یہ اصول بھی صراحت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے کہ نیکی اور راست روی میں ایک دوسرے سے تعاون کرو' لیکن سرکشی اور برائی کے کاموں میں دستِ تعاون دراز مت کرو۔ اسلام ہمیں انسانیت کی سطح پر اشتراکِ عمل کی تلقین کرتا ہے' کیونکہ وہ ایک ہمہ گیر دینِ فطرت ہے جو تمام بنی نوع انسان کی فلاح کا طلب گار اور پورے کرۂ ارض پر امن قائم کرنے کا علمبردار ہے۔ خیر کی طرف دعوت دینے والی عالمی تحریک انسانوں کو مستقل بنیادوں پر دوستی اور دشمنی میں تقسیم نہیں کرسکتی۔ ہمیں تو وہ دیواریں گرادینی چاہئیں جو نبی آخر الزماں ﷺ کے اسوۂ حسنہ تک پہنچنے میں حائل چلی آرہی ہیں۔ ہمیں معصیت' بے راہ روی' ظلم و زیادتی اور دلآزاری کے خلاف انسانی ضمیر کو بیدار اور تازہ دم رکھنا ہوگا کہ یہی دیرپا عالمی امن کی سب سے مضبوط بنیاد بن سکتا ہے۔

☆☆☆

زندہ قومیں اپنے اعمال کا ہر آن احتساب کرتی اور اپنے رویوں اور معاملات میں بہتری لاتی رہتی ہیں۔ پاکستان کے حکمران طبقے اور اربابِ فکر و نظر کو یومِ عشقِ رسولؐ کے دوران پیش آنے والے حادثات اور اُبھرنے والے غیر صحت مند رجحانات کا ناقدانہ جائزہ لینا اور اہم سبق اخذ کرنا ہوں گے۔ چھ آٹھ گھنٹوں میں ۳۰ر سے زائد قیمتی جانوں اور ایک کھرب روپوں کا ضیاع اور غنڈہ گردی اور غارت گری کے روح فرسا مناظر بڑے بڑے اندیشے جنم دے رہے ہیں۔ سب سے بڑا اندیشہ تو یہی ہے کہ پلک جھپکنے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور سفید کپڑوں میں ملبوس نادیدہ قوتیں حالات کے بہاؤ میں اچانک ایک بھنور پیدا کرسکتی ہیں۔ یہ تلخ حقیقت بھی پوری ہولناکیوں کے ساتھ سامنے آئی ہے کہ ہمارے سیاست دانوں اور دینی راہنماؤں نے قوم کو پُرامن احتجاج کرنے کی تربیت دی نہ پولیس اور انتظامیہ نے بپھرے ہوئے عوام پر قابو پانے کا ایک

سائنٹیفک اور مہذب طریقہ اپنایا۔ عراق پر حملے کے خلاف انگلستان میں لاکھوں شہری احتجاج کے لیے نکلے' مگر ایک چیز بھی نہیں ٹوٹی' تاہم تشدد اور گھٹیا درجے کی لوٹ مار کے واقعات اُس وقت نیو یارک میں شدید خوف و ہراس کا باعث بنے تھے جب رات کے وقت چند گھنٹوں کے لیے بجلی بند ہوگئی تھی۔ اِسی طرح انقلابِ فرانس میں بھی ہزاروں گردنیں کٹی تھیں اور ہجوم کی نفسیات بروئے کار آئی تھی۔ ہمارے مظاہرین بالعموم تشدد پر اُتر آتے ہیں اور اپنے ہی شہروں میں کچھ اس بے رحمی سے توڑ پھوڑ کرتے اور پولیس پر حملہ آور ہوتے ہیں جیسے یہ شہر اور یہ پولیس اپنی نہ ہو اور یہ دکانیں' یہ بینک' یہ پٹرول پمپ کسی دشمن کی ملکیت ہوں۔ کراچی' اسلام آباد' پشاور اور لاہور گھنٹوں میدانِ کارزار بنے رہے۔ حکومت' انتظامیہ اور پولیس بری طرح پسپا ہوگئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ عناصر نے ہجوم کی نفسیات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دانستہ یا نادانستہ کسی بڑی محاذ آرائی کی ریہرسل کی جس میں جرائم پیشہ لوگوں نے اسلحہ بھی استعمال کیا۔ اس دلفگار حادثے کا پہلا سبق یہ ہے کہ عوام کو پُرامن مظاہروں اور پولیس کو مظاہرین سے نبرد آزمائی کی جدید خطوط پر تربیت دی جائے۔

دوسرا بڑا سبق یہ کہ حکمران اپنی پالیسیوں' اپنے اقدامات اور اپنے طرزِ عمل سے عوام کو یہ باور کرائیں کہ وہی اپنے وطن کے محافظ اور پاکستان کے حقیقی مالک ہیں۔ آج وہ احساسِ ملکیت سے یکسر محروم اور امریکا سے سخت ناراض دکھائی دیتے ہیں۔ اُنہوں نے عالمِ وحشت میں ہر وہ چیز نذرِ آتش کردی ہے جو اُن کی غربت اور بے چارگی میں اضافہ کرتی ہے۔ بینک' پٹرول پمپ' سینما گھر اور گاڑیاں جو اُن کی مفلسی کا مذاق اُڑاتی ہیں اور اُن کا خون چوستی ہیں' اُن کے غیظ و غضب کا شکار ہوئیں۔ پولیس جو استحصالی نظام اور جبر کی علامت رہی ہے' اس پر لوگ پل پڑے اور ۶ر اہلکار موت کی آغوش میں چلے گئے جن کی قبروں پر اللہ تعالیٰ شبنم افشانی کرے۔ تیسرا بڑا سبق یہ ملا ہے کہ ہماری سیاسی اور دینی قیادتوں کو آزمائش کے سخت جاں مرحلے میں احتیاط اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ مطالبہ کہ مغرب سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے جائیں' سفارت کار ملک سے نکال دیے جائیں' امریکی مشروبات کا بائیکاٹ کردیا جائے اور عرب ممالک تیل کی سپلائی بند کرنے کا اعلان کردیں' وہ غیر متوازن مسلم اُمہ کو نئی مشکلات سے دوچار کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس مطالبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمیں اپنے اندر بنیادی تبدیلیاں لانا' مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حالت سنوارنا اور خود انحصاری کی منزل طے کرنا ہوگی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلم حکمرانوں کو اپنی دولت میں ایک ارب سے زائد مفلوک الحال مسلمانوں کو حصے دار بنانا ہوگا۔ گستاخانہ فلم کے خلاف اپنی آواز کو مزید مؤثر بنانے کے لیے ہمیں عالمی اور علاقائی سطح پر جاندار سفارت کاری کی ضرورت ہے جو اِس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ رابطے کے زیادہ سے زیادہ چینل کھلے رکھے جائیں اور ہم امریکی حکومت کو عالمی دباؤ سے اِس نکتے پر لاسکیں کہ اگرچہ اشتعال انگیز فلم کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر یہ توہین کا باعث بنی ہوئی ہے اور مذہبی دہشت گردی اِس کی سرزمین سے ہو رہی ہے جس کا فوری سدِ باب عالمی امن' امریکی سلامتی اور تہذیبی عمل کے فروغ کے لیے حد درجہ ناگزیر ہے۔

☆☆☆

''یومِ عشقِ رسول'' کے بطن سے مستقبل کی جو تصویر اُبھری ہے' اِس میں حکومت کی پسپائی سب سے نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ جناب زرداری سیاسی داؤ پیچ سے اپنا اقتدار قائم رکھنے اور ملکی وسائل اور اختیارات پر قابض رہنے میں بظاہر کامیاب نظر آتے ہیں' مگر اس بار یہ امکان بڑھتا جا رہا ہے کہ وہ اپنی حکومت کے چند مضبوط ستونوں سے محروم ہو جائیں گے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ معزول وزیرِاعظم سید یوسف رضا گیلانی کے حلف اُٹھانے سے چند روز پہلے جناب حسین حقانی اور جناب رحمٰن ملک وزارتِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ میں آ بیٹھے تھے اور احکام صادر کر رہے تھے۔ وہی حکومت کے سب سے مضبوط ستون سمجھے جاتے تھے۔ اِن میں ایک ستون میمو گیٹ کی نذر ہو گیا اور دوسرے ستون کی شکست و ریخت سپریم کورٹ کے فیصلے سے شروع ہو چکی ہے۔ دہری شہریت کے سلسلے میں جھوٹا حلف نامہ داخل کرانے پر اُن کے خلاف فوجداری مقدمہ قائم کرنے کا حکم صادر ہوا ہے اور اُن کی نااہلی کا ریفرنس چیئرمین سینیٹ کو بھجوا دیا گیا ہے۔ بعض حلقے سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر نکتہ چین ہیں کہ فاضل جج صاحبان نے آئین کی شق ۶۲ اور ۶۳ کے تحت یہ حکم صادر کر کے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے۔ سوال یہ اُٹھایا جا رہا ہے کہ آیا عدالتِ عظمیٰ کے فاضل جج صاحبان بھی صادق اور امین ہیں اور اُنہیں اس وقت آئین کی شقیں کیوں یاد آئی ہیں۔ محترمہ عاصمہ جہانگیر نے فاضل عدالت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ حکومت کو اسی طرح چلنے دے اور بہت زیادہ مین میخ نکالنے میں احتیاط کرے۔ وہ ایک معزز سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک بے باک اور نظریاتی خاتون ہیں' مگر ہمیں اُن کی باتوں میں کوئی وزن محسوس نہیں ہوا۔ اس ضمن میں بنیادی اصول یہ ہے کہ جب تک آئین میں ''صادق'' اور ''امین'' کے الفاظ موجود ہیں' عدالت اُن کی کسوٹی پر ارکانِ اسمبلی کی اہلیت اور عدم اہلیت کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ جناب رحمٰن ملک اور گیارہ ارکانِ اسمبلی جن میں سبھی جماعتوں کے نمائندے شامل ہیں' اُنہوں نے دہری شہریت کے حوالے سے جھوٹے حلف نامے داخل کر کے یہ ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر دیا کہ وہ صادق اور امین کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ آئین میں ''صادق'' اور ''امین'' کی پابندی فقط عوامی نمائندوں پر عائد کی گئی ہے جو قوم کی تقدیر اور ملکی خزانے اور بے حساب ایگزیکٹو اختیارات کے امانت دار ہیں۔ اِس حوالے سے جج صاحبان اِس زد میں نہیں آتے اور اُن کا تقرر بڑی چھان بین کے بعد کیا جاتا ہے۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فاضل اٹارنی جنرل جناب عرفان قادر کی قانونی ریشہ دوانیوں کے باوجود حکومت کا دوسرا اہم ستون سرنگوں ہو کر رہے گا اور جناب زرداری کے لیے انتخابات کرانے کے سوا اور کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا۔ حُسنِ ظن یہ ہے کہ ہماری بداعمالیوں کے بھنور کی گرہ کھلنے والی ہے۔

عدالتِ عظمیٰ کے حکم کے تحت اسمبلیوں کے تمام اراکین دہری شہریت نہ رکھنے کا حلف اُٹھائیں گے اور یہ انوکھا واقعہ موجودہ سیاسی سیٹ اپ کے لیے ایک بھونچال ثابت ہوگا۔ جناب رحمٰن ملک اعلان کر چکے ہیں کہ دہری شہریت رکھنے والے بہت سارے پردہ نشیں بھی ہیں۔ عدالتِ عظمیٰ کے ذریعے نااہلی کا جو سلسلہ چل نکلا ہے' اس کا دائرہ وسیع تر ہو سکتا ہے۔ اِن حالات میں عام انتخابات قریب آتے دکھائی دے رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی نے ایم کیو ایم کی مشاورت سے جو سندھ لوکل گورنمنٹ آرڈیننس جاری کیا ہے' اس کے خلاف اندرونِ سندھ شدید ردِعمل پایا جاتا ہے جو دونوں پارٹیوں کے لیے آنے والے انتخابات میں بڑی مشکلات پیدا کرے گا۔ غالباً جناب ذوالفقار مرزا کے اِسی انجانے خوف سے متحدہ نے حکومت سے علٰحدہ ہونے کی دھمکی دی ہے۔ جماعت اسلامی کی اپیل پر پورے کراچی میں بھرپور ہڑتال نے بھی اُسے کسی قدر حواس باختہ کر دیا ہے اور صاف نظر آ رہا ہے کہ اس بار سیکرٹر کمانڈر کا جادو نہیں چلے گا۔ چیف الیکشن کمشنر جناب جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم کی مجاہدانہ شخصیت کی طرف سے اِس اعلان نے کہ پاکستان کا مستقبل شفاف انتخابات کے ساتھ وابستہ ہے' سیاست دانوں کو اُن کی ذمے داریوں کا احساس دلایا ہے اور سرکاری مشینری کو حدود میں رہنے کی تنبیہ کی ہے۔ بلوچستان کے حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں' اُن کا حل بھی شفاف انتخابات ہی ہیں کیونکہ اس وقت جن اشخاص پر حکومت قائم ہے' وہ ایجنسیوں نے کامیاب کرائے تھے۔ اب انہی ایجنسیوں کا دائرہ تنگ کیا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں بت گرنے لگے ہیں اور بھنور کی گرہیں کھلتی جا رہی ہیں۔ پیپلز پارٹی جس نے امریکی خفیہ اشاروں سے این آر او کے تحت اپنا تسلط جمایا تھا' اب وہی امریکا خود امتحان گاہ میں پھنس چکا ہے۔ اس کی ایک بلند پایہ یونیورسٹی نے ڈرونز حملوں کے بارے میں ایک تحقیقاتی رپورٹ جاری کی ہے جس میں انکشاف ہوا ہے کہ یہ حملے کسی طور بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے' کیونکہ ان میں زیادہ تر سویلین ہلاک ہوئے ہیں اور قبائلی علاقوں میں شدید خوف پایا جاتا ہے' جس کے سبب ۷۴ رفیصد قبائلی امریکا سے نفرت کرتے اور دہشت گردی کی طرف مائل ہیں۔ اس رپورٹ میں سوال اُٹھایا گیا ہے کہ امریکا کس قانون کے تحت یہ حملے کر رہا ہے اور وہ عالمی برادری کا سامنا کیونکر کر سکے گا۔ ہمارے مصلحت کیش حکمران تو ڈرون حملوں کے بارے میں ایک مضبوط موقف اختیار نہیں کر سکے' مگر فطرت کی تعزیریں امریکی اسٹیبلشمنٹ کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں اور ہمارے عاقبت نااندیش حکمران اشرافیہ کی قسمت میں بھی۔ اقوامِ متحدہ میں صدر اوباما کی تقریر اعتماد اور اخلاقی طاقت سے محروم تھی اور وہ دوملی کے بھنور میں بے یارومددگار نظر آتے ہیں۔ مسلم لیگ نون کے قائد جناب نواز شریف خم ٹھونک کر صدر آصف زرداری کے مدِمقابل آن کھڑے ہوئے ہیں اور سیاست کے بھنور سے نکلنے کا عزم رکھتے ہیں جس کے باعث روایتی جمود پاش پاش ہونے والا ہے۔

■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناممکن حج کیسے ممکن بنا...؟

ایک نومسلم کے سچے اور والہانہ جذبات کی داستان

وہ حج کا خواہش مند تھا اور ہر قدم پر قانون رُکاوٹ بنا کھڑا تھا
کبھی جو ایسی صورتِ حال آپ کے ساتھ ہوتی......!

تحریر: سیف سلیمان / ترجمہ: رضی الدین سید

حج کی ادائی کی تمنا ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے۔ کوئی بھی فرد خواہ وہ پیدائشی مسلمان ہو یا نومسلم، آرزو اس کی بہرحال یہی ہوتی ہے کہ اپنے فریضۂ حج کی ادائی وہ جلد از جلد کرلے۔ تاہم ایک برطانوی نومسلم ''ڈیوڈ کیل'' (David Chale) کی کہانی اس ضمن میں بالکل ہی منفرد ہے۔ اس نے ۱۹۳۵ء میں عیسائیت کو ترک کر کے اسلام قبول کیا اور اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا تھا۔ عبدالرحمٰن نے فیصلہ کیا کہ اسے فوری طور پر حج کرلینا چاہیے۔ ابھی مذہب تبدیل کیے ہوئے محض ۶/ ہفتے ہی گزرے تھے کہ اس نے اپنی بیوی ''منیرہ'' (پیدائشی ملائیشیائی مسلم خاتون) کے ساتھ ''سراوک'' ملائیشیا سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ سراوک راجہ کے دربار میں ملازمت کے دوران عبدالرحمٰن کو اپنے ہم پیشہ دیگر ملائیشیائی مسلم ساتھیوں کے ساتھ وقت گزارنے کا خاصا موقع ملتا تھا جس کے نتیجے میں قدرتی طور پر اسے اسلام کے بارے میں بھی واقفیت حاصل ہوتی رہتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کے مسلم دوستوں میں کچھ ایسی انفرادی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو عام طور پر دیگر مذاہب کے لوگوں میں موجود نہیں ہوتیں۔ مثلاً وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ملائیشیائی مسلم دوست بڑوں کا احترام وادب کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں۔ ان کے اندر غریبوں کی امداد کا جذبہ بھی وافر ہے۔ ان کے اندر قوتِ برداشت بھی بہت ہے۔ اخلاقیات کے معاملے میں بھی وہ بلند نظر آتے ہیں اور زندگی و موت کے حقائق کے آگے وہ مکمل سر جھکا دینے کی عادت رکھتے ہیں۔ نیز وہ دیکھتا تھا کہ خدائے واحد اور اعلیٰ اخلاقی قدروں پر بھی ان کا اعتقاد غیر متزلزل ہے اور کیسی ہی مصیبت اور پریشانی کیوں نہ آجائے، اس کے دوست ہر لحاظ سے پُرسکون رہتے ہیں کیونکہ ہر خوشی وغم کو وہ منجانب خدا سمجھتے ہیں۔ یہی وہ ممتاز صفات تھیں جن کے باعث اسلام اسے دیگر مذاہب کی نسبت کچھ نمایاں سا محسوس ہونے لگا تھا۔ اگرچہ ابتدا میں وہ کوئی بڑا فیصلہ کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا، تاہم نفس وشعور کی ایک طویل کشمکش کے بعد بالآخر اس نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اس نے ملازمت سے استعفا دیا اور کلمہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔

اب اس نے تہیہ کیا کہ اپنی مسلم بیوی کے ساتھ حج کے لیے ضرور جائے گا۔ اس ضمن میں معلومات حاصل کرتے ہوئے اسے یہ سن کر کچھ صدمہ سا ہوا کہ حج کرنا بہرحال کوئی اتنا آسان کام بھی نہیں۔ لاتعداد رکاوٹیں ہیں جو اس کی راہ میں حائل ہوسکتی ہیں لیکن اس نے تہیہ کیا کہ حج کے راستے کی ہر رکاوٹ وہ لازماً عبور کرکے رہے گا۔

چنانچہ حجاز کے ویزے کے لیے اس نے سنگاپور سے درخواست دائر کی۔ (اس دور میں ملایا اور سنگاپور ایک ہی ملک تھے) لیکن اسے وہاں سے ویزا نہ مل سکا۔ تب یہ دونوں میاں بیوی عبدالرحمان کے آبائی شہر لندن چلے گئے تاکہ وہاں کے سعودی دفاتر سے مطلوبہ ویزا حاصل کرسکیں۔ تاہم عبدالرحمٰن کو یہاں بھی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اسے بتایا گیا کہ سعودی قوانین کے تحت اسلام قبول کرلینے کے کہیں ۶/ سال بعد ہی جا کر کسی غیر مسلم کو حج کا اجازت نامہ دیا جاتا ہے۔ (اُس دور میں سعودی عرب کا قانون یہی تھا)۔ جبکہ اسلام قبول کیے ہوئے اسے ابھی صرف ۶/ ہفتے ہی ہوئے تھے۔ سعودی افسر نے انہیں بتایا کہ بہرحال انھیں جدّہ کا ویزا جاری کیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ بھی اس شرط پر کہ وہ وہاں ۶/ سال کا طویل عرصہ گذارے۔ یعنی جدّہ سے مکے و مدینے جانے کا خیال وہ فوراً دل میں نہ لائے۔

عبدالرحمٰن نے افسران پر واضح کیا کہ سراوک ملائیشیا سے اپنی بیوی کے ہمراہ وہ محض حج کی ادائی کی خاطر ہی لندن پہنچا ہے۔ جب افسروں پر واضح ہوا کہ اس کے ساتھ اس کی پیدائشی مسلم خاتون (بیوی) بھی ہے تو انھوں نے اس کی بیوی کے لیے حج ویزا جاری کرنے کی منظوری دے دی۔ پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عبدالرحمٰن نے کہا کہ عورت ہونے کے باعث اس کی بیوی سفر اور فرائض حج کی ادائی تنہا نہیں کرسکتی۔ ''ہمیں تمھاری

اُس نے سوچا کہ جب تک خدا کسی کو جوتے عطا نہ کردے، اُسے اُس وقت تک بہرحال چپلوں پر گزارا کرنا چاہیے

مشکلات کا اندازہ ہے، اسی لیے ہم تمھیں جدہ کا ویزہ جاری کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد جدہ پہنچ کر یہ تمھاری ذمے داری ہوگی کہ شہر کے حکام کو اپنی مشکلات اور شوق کے بارے میں آگاہ کرو، اور بتاؤ کہ تنہا تمھاری بیوی حج کی ادائی نہیں کرسکے گی''۔ افسران نے اسے آگاہ کیا۔

عبدالرحمٰن نے انگریزی محاورے کے تحت سوچا کہ ''جب تک خدا کسی کو جوتے عطا نہ کردے، اسے اس وقت تک بہرحال چپلوں پر گذارنا کرنا چاہیے۔ عبدالرحمٰن کے نزدیک جدہ کا ویزہ حاصل کرنا اس بات سے بہت بہتر تھا کہ اسے سرے سے سعودیہ کا ویزہ ہی نہ ملے۔ چنانچہ ویزا حاصل کرتے ہی اسے جلد از جلد جدہ پہنچ جانے کی فکر لاحق ہوگئی۔ ادھر حج کی تاریخیں قریب تر آتی جارہی تھیں۔ عبدالرحمٰن کو اندازہ نہیں تھا کہ جدہ کے حکام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے اپنی بیوی کے ہمراہ حجاز جانے کی اجازت آخر کب تک دے سکیں گے۔ چنانچہ اب اس نے ایک کوشش اور کی اور وقت ضائع کیے بغیر لندن سے پیرس روانہ ہوگیا۔ وہاں سے بذریعہ ٹرین اسکندریہ (مصر) پہنچا۔ جیب میں جدہ کا ویزا موجود تھا۔ اسکندریہ میں اسے بتایا گیا کہ نہر سوئز کے راستے ایک مصری جہاز جدہ جانے کے لیے بالکل تیار کھڑا ہے۔ عبدالرحمٰن نے فوراً ۲ ٹکٹیں خریدیں اور جہاز میں سوار ہوگیا۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ سفرِ حج کے لیے جہاز میں مختلف النوع انسانوں کا ہجوم ہے جس میں ترک مسلمان بھی ہیں، شامی بھی، مراکشی بھی، اور بھارتی مسلمان بھی۔ پھر اسی ہجوم میں اسے ایسے بہادر افغانی مسلمان بھی ملے جو میلوں کا سفر طے کرتے اور چھوٹے بڑے پہاڑوں کو عبور کرتے ہوئے پیدل یہاں تک پہنچے تھے۔ نیز اس قدر طویل فاصلہ عبور کرتے ہوئے انھیں ۲ سال کا طویل عرصہ بھی گزر چکا تھا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں! جہاز پر ایک مؤذن پنج وقتہ اذان دیتا تھا اور سارے لوگ باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔

آخر کار وہ دن آہی گیا جب مصری جہاز جدہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ میاں بیوی نے جدہ کے ایک بلند و بالا ہوٹل کی پانچویں منزل پر کرائے پر کمرہ حاصل کیا۔ چاول اور کھجور کا ناشتہ کرتے ہی وہ دونوں جدہ پولیس اسٹیشن کی طرف بھاگے جہاں (اس وقت کے) دستور کے مطابق ان کے 'جوازات السفر' (پاسپورٹس) کی چھان بین کی جانی تھی۔ چند ضروری سوالات و جوابات کے بعد عبدالرحمٰن کو بتایا گیا کہ ان کے کاغذات پہلے پولیس کے سربراہ کو بھیجے جائیں گے جہاں سے پھر وہ انھیں امیرِ جدہ کے پاس روانہ کرے گا۔ تسلی کے بعد امیرِ جدہ ان کاغذات کو آگے امیرِ مکہ کو ارسال کر دیں گے تاکہ دونوں میاں بیوی کے مکہ میں داخلے کی اجازت حاصل کی جاسکے۔

''اس سارے عمل میں آپ کو کتنا عرصہ درکار ہوگا؟'' عبدالرحمٰن نے سوال کیا لیکن پولیس حکام نے جواب میں محض اپنے کندھے اُچکا دینے پر ہی اکتفا کیا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس سوال کا جواب انھیں بھی معلوم نہیں ہے۔ اسی دوران عبدالرحمٰن نے وہاں ایک مخلص عرب محمد صالح کی خدمات حاصل کیں اور اپنی اہلیہ کے ہمراہ واپس ہوٹل چلا آیا۔ محمد صالح نے اسے بتایا تھا کہ اس معاملے میں وہ مکہ میں موجود اپنے والد ''القحطان'' کا اثر رسوخ استعمال کر کے اس کی ادائی حج کو ہر حال میں ممکن بنانے کی کوشش کرے گا۔ ادھر جدّہ میں رہتے ہوئے عبدالرحمٰن نے اپنا ختنہ بھی کروالیا تھا تاکہ دین کی ایک اور ضروری سنّت پر بھی عمل درآمد ہوجائے۔

دن تیزی کے ساتھ گزرتے چلے جا رہے تھے اور اس کی تشویش میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ کاغذات کے بارے میں اب تک کوئی اطلاع اس کے سامنے نہیں آرہی تھی۔ ایک دن محمد صالح اسے لے کر براہِ راست امیرِ جدہ کے پاس پہنچ گیا جس نے عبدالرحمٰن کے جذبوں کی قدر کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے کاغذات مکہ کے حکام کے پاس بھیج دیے گئے ہیں، تاہم کاغذات کی واپسی تک اسے بہرحال انتظار کرنا ہی ہوگا۔ امیرِ جدہ نے البتہ یہ یقین دہانی اسے ضرور کرادی کہ اس معاملے میں وہ ان تک اپنی سفارش لازماً پہنچادے گا۔

حج کے دن قریب تر چلے آرہے تھے اور جدہ عازمین حج سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔ مختلف گاڑیاں حاجیوں کو لے لے کر مکہ کی جانب روانہ ہو رہی تھیں۔ اسی دوران ایک دن صالح محمد اچانک خوشی خوشی اس کے پاس آیا اور خوشخبری دی کہ شاہِ سعودیہ نے کاغذات میں اس کے مسلمان ہونے کی ذاتی تصدیق بھی کر دی ہے۔ یہ خوش خبری اپنی جگہ لیکن ان دونوں میاں بیوی کے مکہ میں داخلے کی اجازت تاحال معلق تھی۔

اب اسے عبدالرحمٰن کی خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ انہی دنوں شاہِ سعودیہ اتفاقاً جدہ آرہے تھے۔ محمد صالح نے اسے بتایا کہ بادشاہ سے صرف ایک ملاقات ہی اس کے سارے مسئلے حل کر دے گی! چنانچہ محمد صالح کی

جدوجہد کے نتیجے میں ایک دن اس کی ملاقات بادشاہ کے ساتھ بالآخر کروا ہی دی گئی۔

''بات یہ ہے۔'' شاہِ سعودیہ اس سے گویا ہوئے۔ ''شہرِ مکہ کو مشرکوں اور کافروں سے محفوظ رکھنے کی خاطر ہی ہم نے قانون بنایا ہے کہ جب تک کسی نومسلم کو اسلام قبول کیے ہوئے ۶ سال کا عرصہ نہ گزر جائے، اور یہ عرصہ بھی ہمارے حکام کے سامنے اس نے جدہ میں گزارا ہو، اس وقت تک اسے حج و عمرہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔'' شاہ نے مزید کہا ''لہٰذا جب تک میں اپنے مشیروں سے مشورہ نہ کرلوں، تمہارے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں دے سکتا، البتہ معاملہ جلد از جلد نمٹائے جانے کا وعدہ ضرور کرتا ہوں۔''

شہرِ جدہ اب حاجیوں سے تقریباً خالی ہو چکا تھا کیونکہ حج شروع ہونے میں محض ۲ دن باقی رہ گئے تھے۔ عین اسی لمحے عبدالرحمٰن کا دوست محمد صالح اس کے پاس دوڑا دوڑا آیا اور خوش خبری سنائی کہ بادشاہ نے اسے اپنی اہلیہ کے ہمراہ مکہ تک سفر کی اجازت بھی مرحمت فرما دی ہے جبکہ امیرِ جدہ نے حکامِ مکہ کو فون کر کے شاہ کے اس فیصلے سے آگاہ بھی کر دیا ہے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ عبدالرحمٰن اور منیرہ کو مکہ تک پہنچنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔ تاہم ایک بڑی رکاوٹ ان دونوں کا ابھی مزید انتظار کر رہی تھی اور وہ تھی ذریعۂ سفر کے حصول کی۔

اگلے دن فجر کے وقت روانہ ہو جانے کے لیے وہ دونوں تیار بیٹھے تھے اور جدہ اور مکہ کے درمیان کم از کم فاصلہ بھی ۷۰ میل (۱۱۲ کلومیٹر) کا تھا۔ بروقت پہنچنے کی خاطر زائرین کے پاس اگرچہ کار ہی ذریعۂ سفر تھی لیکن افسوسناک طور پر جدہ میں اس وقت کوئی ایک کار بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ہر دستیاب کار زائرین اپنے استعمال میں لے چکے تھے۔ عبدالرحمٰن سوچ میں پڑ گیا۔ ایک مشکل بڑی مشکل سے حل ہوتی تھی کہ کوئی دوسری مشکل ان کے سامنے آن کھڑی ہوتی تھی۔ مکہ کیسے پہنچا جائے؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ آخرکار اس نے ایک چھوٹا سا کھٹارا ٹرک کرائے پر حاصل کیا جس میں دونوں طرف لکڑی کی بینچیں نصب تھیں لیکن ایک مشکل یہاں بھی تھی کہ ڈرائیور کو صرف جدہ کی حدود میں ڈرائیونگ کی اجازت تھی۔ تاہم اس نے بھاگ دوڑ اور بہت منت سماجت کے بعد پولیس افسران سے بالآخر مکہ تک ڈرائیونگ کرنے کی خصوصی اجازت بھی حاصل کر ہی لی۔ چنانچہ اب میاں بیوی دونوں نے احرام باندھا، سوٹ کیس ٹرک پر لادے اور سوئے مکہ عازمِ سفر ہوگئے۔ ''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' عبدالرحمٰن نے سوچا۔

اونچے نیچے پتھریلے راستوں پر ہچکولے کھاتے ہوئے ان کا ''ٹرک'' جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا تھا، لبیک لبیک کی صدائیں لگاتے ہوئے کئی قافلے انہیں پیدل بھی رواں دواں نظر آتے تھے۔ ہمدردی کے پیشِ نظر عبدالرحمٰن نے ان میں سے بعض کمزور اور بیمار زائرین کو اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔

جب وہ سب مکہ میں داخل ہوئے تو انہیں مسجدِ حرام کے مینار دور ہی سے دکھائی دینے لگے۔ ٹرک کو کسی مناسب مقام پر کھڑا کر کے وہ دونوں میاں بیوی چھوٹی

اسی لمحے عبدالرحمٰن کا دوست محمد صالح اس کے پاس آیا اور خوشخبری سنائی کہ بادشاہ نے اسے اپنی اہلیہ کے ہمراہ مکہ تک سفر کی اجازت مرحمت فرما دی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوٹی گلیوں سے گزرتے مسجد حرام کی طرف بڑھنے لگے جو دنیا بھر کے زائرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مکہ پہنچ کر عبدالرحمٰن نے پہلے القطان کے گھر کا رخ کیا۔ القطان نے ان کے لیے ایک معلم کا بندوبست کیا تا کہ حج کے سنن و فرائض ان کے لیے آسان ہو جائیں۔ میاں بیوی کے پاس ضائع کرنے کے لیے اب وقت بالکل نہیں بچا تھا۔ چنانچہ فوری طور پر وہ ان لوگوں میں جا شامل ہوئے جو خانۂ کعبہ کے گرد طواف میں مصروف تھے۔

طواف کرتے ہوئے یہ جوڑا جب حجرِ اسود کو بوسہ دینے پہنچا تو حاجیوں کے ہجوم سے ان کا راستہ تنگ ہوگیا۔ تاہم کسی نہ کسی طرح انہوں نے حجرِ اسود کو بوسہ دے ہی دیا۔ طواف کے بعد اب وہ دوسرے زائرین کے ساتھ منیٰ اور عرفات کی طرف روانہ ہوئے جہاں انہوں نے دیکھا کہ سفید لباس میں ملبوس زائرین اونٹوں، کاروں اور چھوٹے ٹرکوں پر سوار، نیز پاپیادہ بھی چاروں طرف سے اُمڈے چلے جا رہے ہیں۔

مکہ کیسے پہنچا جائے؟ وہ سوچ میں پڑ گیا آخر کار اس نے ایک چھوٹا سا کھٹارا ٹرک کرائے پر حاصل کیا جس میں دونوں طرف لکڑی کی بینچیں نصب تھیں

میدان عرفات اب چھوٹے چھوٹے خیموں کا ایک وسیع شہر نظر آ رہا تھا۔ حاجیوں نے نمازِ فجر کے بعد ہی سے وہاں خیمے گاڑنے شروع کر دیے تھے۔ ظہر اور عصر کی مشترکہ جماعت ادا کرتے ہی حاجیوں کا ایک سمندر میدان میں آ بسا، جو ہوا میں لہراتے ہوئے اپنے سفید احراموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مسلسل معافی مانگ رہے تھے۔ تاہم حادثاتی طور پر وہاں اچانک چاروں طرف سے سخت طوفانی ہواؤں کے تھپیڑے چلنے لگے جن کے باعث ریت کا مہیب گرد و غبار حاجیوں کے چاروں طرف پھیل گیا اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ خوفناک آوازوں والی ان ہواؤں نے تمام خیمے الٹ پلٹ کے رکھ دیے۔ بانسوں اور خیموں کے بیک وقت گرنے کی آوازوں کے باعث صورتِ حال اور بھی پریشان کن ہوگئی تھی۔ وقفے وقفے سے یہ طوفان وہاں ۳ مرتبہ حملہ کرتا رہا تا آنکہ آخر طوفان بالکل تھم گیا اور ہر طرف دوبارہ سکون طاری ہوگیا۔

عرفات کے بعد حاجیوں کا یہ سمندر حج کے اگلے مرحلے کے لیے مُزدلفہ کی جانب آگے بڑھنے لگا۔ عبدالرحمٰن یہ سارا عمل انتہائی حیرت اور خوشگواری کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی منیرہ اس سارے دورانیے میں بہت بہادر عورت ثابت ہوئی تھی کیونکہ عورت ہونے کے باوجود اس نے ہمت، سکون اور دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔

حج کے اختتام پر عبدالرحمٰن نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر ایک طرف اس کا یہ سفر اپنے اختتام پر پہنچ رہا تھا تو دوسری طرف اس کی نئی زندگی کے لیے وہ آغازِ سفر بھی بن رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ حج کی خاطر برداشت کی جانے والی اس کی اب تک کی تمام تکالیف، قربانیاں اور جدوجہد اُس خوشی کے مقابلے میں بالکل ہیچ ثابت ہو رہی ہیں جو حج کے فریضے کی ادائی کے بعد اس نے اپنے قلب و روح میں محسوس کی ہے۔

پھر اس کا یہ کہنا بھی بالکل ٹھیک تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شاملِ حال نہ ہوتی تو ناممکن تھا کہ اتنے مختصر ترین وقت میں وہ تمام ترکاوٹوں کے باوجود حج کا اہم فریضہ ادا کر سکتا۔

عبدالرحمٰن کے سفرِ حج کی یہ کہانی بظاہر یہاں ختم ہوتی ہے مگر اس نومسلم کا پختہ ایمان، جوش اور ولولہ دیکھ کر ہم پیدائشی مسلمانوں کا سرد اور کمزور جذبۂ ایمان بہت کم تر دکھائی دیتا ہے۔ کوئی نسبت ہو تو ضرور بتایئے گا۔

حضرت علیؓ نے ان کی قبروں پر کھڑے ہو کر غم ناک لہجے میں کہا

"میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو کہتے سُنا جنت میں طلحہؓ اور زبیرؓ میرے ہمسائے ہوں گے"

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بن عُبیداللہؓ

آنحضورﷺ کی محبت سے سرشار اور اپنی بے انتہا سخاوت کی وجہ سے طلحہ الخیر اور طلحہ الجود اور طلحہ الفیاض کہلانے والے اس صالح فطرت صحابی کا ماجرا جو کبھی دولت کی کثرت کے باعث تکلیف اور پریشانی میں مبتلا تھے۔ اب اس سے کہیں بڑی آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے

"میں نے روئے زمین پر طلحہؓ کے علاوہ کوئی آدمی نہیں دیکھا جو بن مانگے اس قدر مال عطا کرتا ہو"

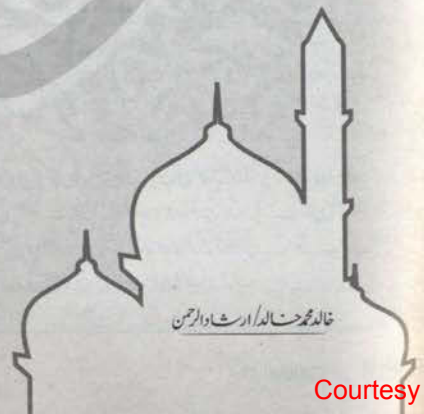

خالد محمد خالد / ارشاد الرحمٰن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حضرت

حضرت طلحہؓ کی داستانِ زندگی بھی خوب ہے کہ آپؓ سرزمین بُصریٰ میں تجارت کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے کہ وہاں انھیں ایک اچھا راہب ملا۔ اُس نے آپؓ کو بتایا کہ جس نبی کے بارے میں انبیاء نے خبر دی ہے اس کا ظہور حرم کی زمین میں ہوگا اور اس کا وقت آگیا ہے۔

یہ سن کر طلحہؓ کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں وہ اس قافلہ میں شامل ہونے سے نہ رہ جائیں کیونکہ یہ ہدایت و رحمت اور نجات کا قافلہ ہے۔

پھر کئی ماہ بعد جب آپؓ واپس اپنے شہر مکہ آئے تو اہل مکہ کے اندر کچھ اشتعال پایا۔ آپؓ جب بھی کسی شخص یا گروہ سے ملتے، تو انھیں اس وحی کے بارے میں باتیں کرتے پاتے جو جناب محمدؐ پر نازل ہوئی تھی۔ حضرت طلحہؓ نے سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے تجارتی قافلے کے ساتھ سفر سے واپس آئے ہیں اور ایک فرمانبردار و مطیع مومن کی حیثیت سے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ کھڑے ہیں۔

حضرت طلحہؓ نے اپنے دل میں کہا: محمدؐ اور ابوبکرؓ؟

اللہ کی قسم یہ دونوں کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتے! حضرت محمد ﷺ عمر کے چالیسویں برس کو پہنچ چکے ہیں اور ہم نے اس دوران ان سے ایک بھی جھوٹ نہیں سنا۔ کیا وہ آج اللہ کے بارے میں جھوٹ کہیں گے کہ اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے اور میرے اوپر وحی نازل کی ہے؟

حضرت طلحہؓ فوراً حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت طلحہؓ کے درمیان کوئی زیادہ دیر گفتگو نہیں ہوئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات اور آپؐ کے اتباع کے شوق کی رفتار حضرت طلحہؓ کے دل کی دھڑکن سے بھی تیز ہو چکی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے ان کو ساتھ لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آگئے۔ جہاں حضرت طلحہؓ مسلمان ہو کر قافلۂ ایمان میں شامل ہو گئے اور اوّلین مسلمانوں میں شمار ہونے لگے۔

حضرت طلحہؓ اپنی قوم میں اپنے مقام و مرتبہ، دولت کی فراوانی اور منافع بخش تجارت کا مالک ہونے کے باوجود قریش کی تعذیبات کا شکار ہوئے۔ جب انھیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نوفل بن خویلد کے حوالے کیا گیا جس کو ''قریش کا شیر'' کہا جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کو سزا میں مبتلا کیے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ قریش کو

''ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت کا منتظر ہے۔ انھوں نے اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔''
(احزاب: ۲۳)

رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی پھر صحابیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت طلحہؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''جو شخص اس بات پر خوش ہو کہ وہ کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو زمین پر چلتا ہو اور اس نے اپنی نذر پوری کر دی ہو تو وہ طلحہؓ کو دیکھ لے۔''

پھر حضرت طلحہؓ بن عبیداللہؓ کے علاوہ وہاں کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جس کو دیکھنے کی صحابہؓ خواہش رکھتے ہوں اور ان کے دل اس کے دیدار کا شوق فراواں رکھتے ہوں۔ حضرت طلحہؓ اپنے انجام و عاقبت کے بارے میں مطمئن ہو گئے کہ وہ زندہ رہیں یا موت کی آغوش میں چلے جائیں وہ ان لوگوں میں شمار ہوں گے جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے اپنے عہد کو سچا کر دکھایا اور وہ کسی فتنہ میں مبتلا ہوئے نہ کسی ادنیٰ سی کمزوری کا شکار ہوئے۔

حضرت طلحہؓ دولت سے بے حساب خرچ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ بھی آپؓ کی دولت کو بے حساب بڑھاتا تھا

اپنے اس عمل پر شرمندگی کا احساس ہوا اور اس کے انجام کا خوف بھی لاحق ہو گیا۔

جب مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا گیا تو حضرت طلحہؓ بھی مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سوائے غزوۂ بدر کے ہر غزوہ میں شریک رہے۔ غزوۂ بدر میں آپؓ اس لیے شریک نہ ہو سکے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ کو مدینہ سے باہر کسی مہم پر بھیجا ہوا تھا۔ جب وہ مہم سر کر کے واپس مدینہ آئے تو نبی ﷺ اور صحابہؓ غزوۂ بدر سے واپس آ رہے تھے۔ ان دونوں اصحاب کو دلی صدمہ ہوا کہ وہ پہلے ہی غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شرکت کرنے کے اجر سے محروم رہ گئے۔

اس پر رسول اللہ ﷺ نے یہ خبر دے کر انھیں مطمئن کر دیا کہ جنگ لڑنے والوں کی طرح ان کو بھی پورا پورا اجر ملے گا بلکہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں بھی مالِ غنیمت میں اسی قدر حصہ دیا جس قدر جنگ میں شرکت کرنے والوں کو دیا تھا۔

☆☆

اب غزوۂ اُحد آیا کہ قریش کی پوری طاقت اور شدت بروئے کار آئے جس طرح وہ یومِ بدر کو جوش میں آئی تھی تاکہ مسلمانوں کو آخری شکست سے دوچار کر کے نیست و نابود کر دیا جائے۔ سب کچھ پیس کر رکھ دینے والی جنگ فوراً شروع ہو گئی جس نے زمین کو اپنی المناک لپیٹ میں لے لیا اور مشرکین کی بدبختی آ گئی۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ کفار اپنا اسلحہ پھینک کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں تو پہاڑی درے پر موجود تیر انداز اپنی جگہوں سے نیچے اتر آئے تاکہ غنائمِ جنگ لوٹ سکیں۔

اُدھر قریش کا لشکر اچانک پیچھے سے حملہ آور ہوا اور عنانِ جنگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر جنگ نئے سرے سے اپنی شدت و سختی اور ہولناکی کے ساتھ شروع ہو گئی۔ اس اچانک حملہ نے مسلمانوں کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔

حضرت طلحہؓ نے اُدھر نظر ڈالی جہاں رسول اللہ ﷺ کھڑے تھے۔ دیکھا کہ آپؐ شرک و کفر کی قوتوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ حضرت طلحہؓ تیزی سے رسول اللہ ﷺ کی جانب چلے اور اس فاصلے کو عبور کرنے لگے۔ ایک ایسا فاصلہ جس میں دسیوں زہر آلود تلواریں اور جنون زدہ نیزے لہرا رہے تھے۔

حضرت طلحہؓ نے دُور سے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے رخسارِ مبارک سے لہو بہہ رہا ہے اور آپؐ سخت تکلیف میں ہیں۔ یہ صورتِ حال حضرت طلحہؓ کو کھا گئی اور آپؓ نے ہولناک فاصلے کو چند چھلانگوں میں ہی طے کر ڈالا جبکہ مشرکین کی چھائیں چھائیں کرتی تلواریں رسول اللہ ﷺ کو حصار میں لیے ہوئے تھیں اور آپ ﷺ کو کاری ضرب لگانا چاہتی تھیں۔

حضرت طلحہؓ اس خوفناک صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ کے لیے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے۔ آپؓ اپنے دائیں بائیں بوٹیاں اڑانے والی تلوار کے وار کر رہے تھے۔ آپؓ نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا خون بہہ رہا ہے اور آپؐ کی تکلیف بڑھ رہی ہے تو آپ ﷺ کو سہارا دیا اور اس گڑھے سے باہر نکالا جس میں آپؐ کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ آپؓ اپنے بائیں ہاتھ اور سینے سے رسول اللہ ﷺ کو سہارا دیے ہوئے تھے اور محفوظ مقام پر لے جا رہے تھے ساتھ ساتھ اپنے دائیں ہاتھ سے تلوار بھی چلا رہے تھے اور

urdudigest.pk
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان مشرکوں سے لڑ رہے تھے جو رسول اللہ ﷺ کو گھیرے ہوئے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

''جب اُحد کے روز کا ذکر کیا جاتا تو حضرت ابوبکرؓ فرمایا کرتے تھے یہ دن تو سارے کا سارا طلحہؓ کا تھا۔ میں پہلا شخص تھا جو نبی ﷺ کے پاس آیا تو آپؐ نے مجھے اور ابوعبیدہؓ بن جراح سے فرمایا: اپنے بھائی کی حالت کو دیکھو! ہم نے دیکھا تو طلحہؓ کے جسم پر نیزے، تلوار اور تیر کے ۸۰ رکے قریب زخم تھے۔ ان کی ایک انگلی بھی کٹ گئی تھی۔ پھر ہم نے ان کی مرہم پٹی کی۔''

☆☆

حضرت طلحہؓ تمام غزوات میں اگلی صفوں میں ہوا کرتے تھے۔ آپؓ پرچم رسول ﷺ پر قربان ہو کر اللہ کی رضامندی چاہتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد حضرت طلحہؓ مسلمان جماعت کے وسط میں زندگی گزارنے لگے۔ عبادت گزاروں کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتے رہے اور مجاہدین کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہے۔ مسلمان بھائیوں کے ساتھ مل کر دین کی بنیادیں مضبوط کرتے رہے۔ جو دین اس لیے آیا تھا کہ انسانیت...... ساری کی ساری انسانیت...... کو اندھیروں سے نکال کر روشنیوں کی طرف لے آئے۔

جب آپؓ ربّ کا حق ادا کر لیتے تو پھر اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ اپنی منافع بخش تجارت اور سودمند کاروبار میں مصروف ہوجاتے۔

حضرت طلحہؓ بہت زیادہ دولت مند اور اہل ثروت مسلمانوں میں سے تھے۔ آپؓ کی ساری دولت وثروت اس دین کی خدمت کے لیے وقف تھی جس کا علم آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں اٹھا رکھا تھا۔ آپؓ اس دولت سے بے حساب خرچ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ بھی آپؓ کی اس دولت کو بے حساب بڑھاتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے بے انتہا جود وسخا کی بنا پر آپؓ کو طلحہ الخیر، (سراپا خیر طلحہ)، طلحہ الجود (سراپا سخاوت طلحہ) اور طلحہ الفیاض (بحر سخاوت طلحہ) کا نام دے رکھا تھا۔

آپؓ کی دولت سے ایک مرتبہ جو چیز نکل جاتی اللہ اس کو کئی گنا بڑھا کر انھیں واپس کرتا۔

آپؓ کی اہلیہ سُعدیٰ بنت عوفؓ بیان کرتی ہیں ''ایک روز میں طلحہؓ کے پاس گئی، میں نے انھیں غمگین دیکھا تو ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ غمگین کیوں ہیں؟''

انھوں نے جواب دیا ''میرے پاس جو مال ہے وہ بہت زیادہ ہوگیا ہے یہاں تک کہ اس نے مجھے تکلیف دہ پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔''

میں نے ان سے کہا'' تو پھر کیا ہوا اس کو تقسیم کردیں۔''

وہ اٹھے اور لوگوں کو بلا کر ان میں دولت تقسیم کرنے

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

جب جب احد کے روز کا ذکر کیا جاتا تو حضرت ابوبکرؓ فرماتے یہ دن تو سارے کا سارا طلحہؓ کا تھا

لگ گئے یہاں تک کہ اس دولت میں سے ایک درہم بھی باقی نہ رہا۔''

ایک بار حضرت طلحہؓ نے اپنی ایک زمین بہت زیادہ قیمت پر فروخت کی۔ جب دولت کے ڈھیر کو دیکھا تو ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور کہنے لگے ''وہ شخص جس کے گھر میں اس مال کو ایک رات گزر جائے اسے نہیں معلوم کہ راتوں رات اسے کس قدر اللہ کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا جائے۔''

جنگِ جمل حقائق اور واقعات

جنگ جمل حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کی فوجوں کے درمیان، جمادی الثانی ۳۶ھ (دسمبر ۶۵۶ء) بصرہ کے قریب لڑی گئی۔ اس جنگ میں حضرت عائشہؓ ایک اونٹ پر سوار تھیں جس کا نام عسکر تھا۔ بعد میں یہی اونٹ لڑائی کا مرکز بن گیا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مہاجرین وانصار میں سے چند صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں خلافت کی پیشکش کی۔ آپؓ کے انکار کے باوجود لوگ اس بات پر بضد تھے کہ آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ ان کے اصرار پر آپؓ نے ملتِ اسلامیہ کے مفاد میں خلافت کا بوجھ اٹھانے پر آمادگی ظاہر کی اور لوگوں نے بیعت کر کے آپؓ کو خلیفہ تسلیم کرلیا۔

بارِ خلافت اٹھانے کے بعد سب سے اہم مسئلہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دینے اور قصاص لینے کا تھا لیکن قاتلوں کی نشاندہی کرنے والا کوئی نہ تھا اور انھیں گرفتار کرنا آسان نہ تھا۔ اُدھر صحابہ کرامؓ اور عام لوگوں کا اصرار بڑھ رہا تھا کہ فوری طور پر قاتلوں کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دی جائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت امیر معاویہؓ کے بھائی زیدؓ بن ابوسفیان کو شام کا گورنر بنایا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ منصب حضرت امیر معاویہؓ کو عطا ہوا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں حضرت امیر معاویہؓ ہی پورے ملک شام کے حاکم رہے۔ آپ کا رعایا پر بہت اثر تھا اور لوگ آپؓ سے بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کا المناک واقعہ وقوع پذیر ہوا تو حضرت معاویہؓ نے ان کا خون آلود لباس اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں مدینہ سے دمشق منگوا کر انھیں جامع مسجد میں آویزاں کر دیا۔ جنھیں دیکھ کر شامیوں کے جذبات بھڑک اٹھے اور حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ بہت زور وشور سے ہونے لگا۔

اس مطالبہ نے اتنی شدت اختیار کی کہ لوگوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت علیؓ کو صورتِ احوال کا پتا چلا تو انھوں نے بحیثیت خلیفہ حضرت امیر معاویہؓ کو معزول کر دیا لیکن حضرت امیر معاویہؓ نے معزول ہونے سے انکار کر دیا اور اہلِ شام نے ان کا پورا ساتھ دیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے ان سے جنگ کے لیے لشکر تیار کیا۔

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ شہادت عثمانؓ کے وقت محرم سے عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ میں قیام پذیر تھیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت اور مدینہ کے حالات کا پتا چلا۔ جب مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں تو راستے میں مقام سرف پر عبید بن ابی سلمہ نے اطلاع دی کہ حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہوگئے ہیں اور مدینہ منورہ میں ہنگامہ برپا ہوگیا ہے۔ آپؓ وہیں سے واپس مکہ روانہ ہوئیں اور حضرت عثمانؓ کا قصاص اور اصلاح فتنہ وفساد کی دعوت دی۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد ان کے گرد جمع ہوگئی۔ مکہ میں حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ عامل عبداللہ بن عامر حضرمی اور بنوامیہ کے تمام افراد نے جو ابھی مکہ پہنچے تھے آپؓ کی آواز پر لبیک کہی۔ حضرت زبیرؓ بن العوام بھی آپ کے ہمراہ تھے۔

بصرہ اور یمن کے عاملین نے لشکر کے سامان سفر کی تیاری اور فراہمی میں حصہ لیا۔ حضرت عائشہؓ کا مقصد اصلاح احوال کے سوا کچھ نہ تھا۔ بعض حلقوں میں یہ بات کہی گئی کہ حضرت علیؓ قاتلوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ اس سے خلفشار پیدا ہوگیا۔ اُدھر مصر میں محمد بن ابی حذیفہؓ نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔

حضرت عائشہؓ کی سرکردگی میں یہ لشکر بصرہ کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں حضرت علیؓ کے نامزد کردہ حاکم عثمان بن حنیف کی فوج کا ایک بڑا حصہ حضرت عائشہؓ کی حمایت میں، فوج سے الگ ہوگیا۔

جب مدینہ میں حضرت علیؓ کو ان حالات کا علم ہوا تو انھوں نے حضرت امیر معاویہؓ سے جنگ کے بجائے حضرت عائشہؓ سے مقابلہ کا عزم کیا اور بصرہ پہنچ کر امت کے خیرخواہ بزرگوں کے ذریعے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں امن کا پیغام بھیجا۔ حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زبیرؓ، اور حضرت طلحہؓ سب چاہتے تھے کہ کسی طور صلح کی کوئی صورت پیدا ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر انھوں نے اپنے کچھ دوستوں کو بلایا اور ان سے یہ مال اٹھوا کر مدینہ کی گلیوں، شاہراہوں اور گھروں میں جا کر تقسیم کرنے لگے یہاں تک کہ اِدھر صبح ہوئی اور اُدھر ان کے پاس کوئی درہم نہ رہا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ ان کی جود و سخا کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ''میں نے طلحہؓ بن عبیداللہ کے علاوہ کسی آدمی کو نہیں دیکھا جو بغیر مانگے اس قدر مال عطا کرتا ہو۔''

حضرت طلحہؓ اپنے اہل و عیال اور اقرباء کے ساتھ بہترین سلوک کرنے والوں میں سے تھے۔ آپؓ ان لوگوں کی کثرتِ تعداد کے باوجود ان کی کفالت کرتے۔

اس سلسلہ میں آپؓ کے بارے میں کہا گیا ہے:

''بنی تیم کے کسی گھرانے کا کوئی سرپرست ایسا نہیں جس کی وہ ضروریات پوری نہ کرتے ہوں اور اس کے عیال کا خیال نہ رکھتے ہوں! آپؓ بنی تیم کی بیواؤں کی شادیوں کا انتظام کرتے اور لوگوں کے تاوان ادا کرتے۔''

حضرت سائب بن یزیدؓ کہتے ہیں ''میں سفر و حضر میں طلحہؓ بن عبیداللہ کے ساتھ رہا ہوں۔ میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو طلحہؓ سے زیادہ درہم و دینار اور لباس و طعام کی سخاوت کرنے والا ہو۔''

☆☆

خلافتِ عثمانؓ میں فتنہ رونما ہوا تو حضرت طلحہؓ، حضرت عثمانؓ کا محاسبہ کرنے والوں کی تائید کر رہے تھے۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ یہ فتنہ اس افتراق و انتشار اور انتہا و انجام تک جا پہنچے گا تو وہ اس کے سدِ باب کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کے ساتھ وہ صحابہؓ بھی ہوتے جنھوں نے اس تحریک کی ابتدا میں محض اس لیے تائید کی تھی کہ یہ دباؤ اور محاسبے کی ایک تحریک ہے اور اس سے زیادہ اس کی حیثیت کچھ نہیں۔

تاہم حضرت عثمانؓ کے محاصرہ اور پھر مظلومانہ قتل کے بعد حضرت طلحہؓ کا یہ مؤقف تبدیل ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے مدینہ میں مسلمانوں سے بیعت لی تو حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ ان لوگوں میں شامل تھے۔ پھر دونوں بزرگوں نے حضرت علیؓ سے عمرہ کی ادائی کے لیے مکہ جانے کی اجازت طلب کی اور مکہ چلے گئے۔

وہاں سے بصرہ چلے گئے۔ جہاں پر حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے بہت سی قوتیں جمع تھیں۔ یعنی اس جنگ جمل کی سرزمین جس میں حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے والے لشکر اور حضرت علیؓ کے حامیوں کا آمنا سامنا ہوا۔ یہ جنگ اسلامی تاریخ کا ایک ایسا حصہ ہے جس کی کبھی صفائی نہیں دی جا سکی۔ اپنی اپنی محبت اور رائے پر شدید اصرار نے مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑا دیا۔ اس جنگ میں سازشیوں اور اپنوں کی غلطیوں سے اُمت کے بڑے ہی قیمتی لوگوں کی جانیں گئیں۔

حضرت طلحہؓ کو جیسے ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا انھوں نے اس ماحول سے نکلنے میں دیر نہیں لگائی۔

حضرت علیؓ نے جب اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کو اپنے ہَودَج میں بیٹھے اس لشکر کی قیادت کرتے ہوئے دیکھا جو جنگ کے لیے آ رہا تھا تو رو پڑے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ۲؍حواریوں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو لشکر کے وسط میں دیکھا تو دونوں کو لشکر سے باہر آنے کے لیے کہا۔ یہ دونوں حضرات باہر آئے تو حضرت علیؓ نے حضرت طلحہؓ کو مخاطب کرکے کہا ''اے طلحہؓ! تو رسول اللہ ﷺ کی بیوی کو ساتھ لے کر لڑائی کے لیے نکلا ہے اور اپنی بیوی کو گھر میں بٹھا رکھا ہے؟''

پھر حضرت زبیرؓ سے کہا:

''اے زبیرؓ! میں تجھے قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب تیرے پاس سے رسول اللہ ﷺ گزرے تھے اور ہم فلاں جگہ پر تھے اور آپؐ نے تجھ سے فرمایا تھا: اے زبیرؓ! کیا تو علیؓ سے محبت نہیں کرتا؟ تُو نے

جائے۔ ان لوگوں نے حضرت عائشہؓ کو مسلمانوں میں باہم جنگ کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیا۔ حضرت عائشہؓ کو یہ باتیں اچھی لگیں۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ اگر علیؓ بھی ان باتوں کو پسند کریں تو معاملات بہتر ہو سکتے ہیں۔ قاصد نے یہ خوشخبری حضرت علیؓ کو سنائی جسے سن کر آپؓ بہت خوش ہوئے۔ تاریخ طبری کے مطابق حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان مختلف معاملات پر بحث و مباحثہ کے بعد اتفاق رائے قائم ہو گیا۔ لوگ مطمئن اور مسرور ہوئے اور دونوں لشکر سکون سے سو گئے۔

دشمنِ اسلام یہودی ابنِ سباء اور اس کے آلۂ کار سازشیوں، منافقین اور قاتلین عثمانؓ کو کسی طور یہ منظور نہ تھا کہ مسلمان امن سے رہیں۔ انھیں اپنی مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی سازش ناکام ہوتی ہوئی نظر آئی تو وہ راتوں رات پورے لشکر میں پھیل گئے اور سوتے ہوئے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کو صورتِ حالات کی خبر نہ تھی۔ وہ اپنے اپنے لشکروں کو جنگ سے منع کرتے رہے لیکن رات کی تاریکی، اور شور شرابے کی وجہ سے کان پڑی سنائی نہ دیتی تھی۔ چنانچہ حالات قابو سے باہر ہو گئے اور صبح ہوتے ہوتے جنگ زوروں پر پہنچ گئی۔ اس جنگ کے حوالے سے تاریخ دان بہت مغالطوں کا شکار رہے ہیں۔ اکثر تحریروں نے بہت سی غلط فہمیوں کو اور بھی بڑھا وا دیا۔ یہاں تک لکھا گیا کہ ۷۰ سے ۸۰؍ہزار لوگ اس جنگ میں جاں بحق ہوئے۔

حضرت عائشہؓ کے لشکر میں ۳۰؍ہزار اور حضرت علیؓ کی فوج میں ۲۰؍ہزار سپاہی تھے۔ رات کے کسی حصے میں شروع ہونے والی جنگ اگلے دن شام تک جاری رہی۔ قبائل اور ایک ہی خاندان کے لوگ باہم مصروف پیکار تھے۔ حضرت عائشہؓ ایک اونٹ پر سوار تھیں جس کے سرپوش کو لوہے کی چادروں اور دوسرے سامان سے مضبوط بنا دیا گیا تھا۔ اونٹ کی حفاظت ایک قسم کے زرہ بکتر سے کی گئی تھی۔ لڑائی کے اختتام تک محمل میں اس قدر تیر لگ چکے تھے کہ وہ خار پشت دکھائی دیتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کے صرف بازو پر ایک خراش آئی۔ اونٹ کے اردگرد بہت شدید لڑائی ہو رہی تھی۔ محافظین قرآنی آیات کی تلاوت کرتے ہوئے شہید ہوتے جاتے تھے۔ ان محافظین کی تعداد ۴۰؍ سے ۷۰۰؍تک بتائی جاتی ہے۔

حضرت عائشہ مسلسل اپنے جنگجوؤں کے حوصلے بڑھا رہی تھیں۔ حضرت علیؓ کے ساتھیوں نے انھیں مشورہ دیا کہ کسی طرح حضرت عائشہؓ کے اونٹ کی کونچیں کاٹ دی جائیں تو کام بن سکتا ہے۔ چنانچہ امین بن ضنیہ نے حضرت علیؓ کے حکم پر حضرت عائشہؓ کے اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں اور اونٹ بلبلا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی اونٹ حضرت عائشہؓ کے لشکر کے سپاہیوں کی نظروں سے اوجھل ہوا ان میں بھگدڑ مچ گئی اور فوجی بھاگ نکلے اور حضرت علیؓ کی فوج نے اونٹ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

حضرت علیؓ نے اپنے فوجیوں کو دشمن فوج کے سپاہیوں کا پیچھا نہ کرنے اور ہتھیار پھینکنے والوں سے تعرض نہ رکھنے کا حکم دیا۔ آپؓ نے حضرت عائشہؓ کے بھائی محمد بن ابوبکرؓ کو حضرت عائشہؓ کی خیریت معلوم کرنے اور پورے عزت و احترام سے بصرہ کی سرکاری اقامت گاہ میں پہنچانے کے لیے بھیجا۔ بعد میں خود بھی ان کی مزاج پرسی کے لیے گئے۔ ملاقات ہونے پر دونوں نے مسلمانوں کے اس نقصانِ عظیم پر اللہ سے معافی مانگی۔ یکم رجب ۳۶ھ کو حضرت عائشہؓ امرائے بصرہ کی ۴۰؍خواتین کے ہمراہ مکہ روانہ ہو گئیں۔ حضرت علیؓ نے چند میل تک مشایعت کی۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ بھی حضرت عائشہؓ کے ہمراہ مکہ گئے۔ حضرت عائشہؓ نے مکہ روانہ ہوتے وقت لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، میرے بیٹو! یہ جنگ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔

اس جنگ میں حضرت عائشہؓ کی فوج کے ۹؍ہزار اور حضرت علیؓ کی فوج کے ایک ہزار ستر آدمی کام آئے۔

حضرت علیؓ نے ایک سائل کے جواب میں کہا تھا کہ طلحہؓ اور زبیرؓ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کی رضا کے لیے خروج کیا ہے تو ان کے پاس اس مؤقف کی تائید میں دلیل موجود ہے اور ہمارے پاس اپنے مؤقف کی تائید میں دلیل موجود ہے۔ اگر ہمارے اور ان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو دونوں طرف کے مقتولین جنت میں ہوں گے۔ (ادارہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا تھا: کیا میں اپنے خالہ زاد، عم زاد اور اس شخص سے محبت نہ کروں جو میرے دین پر ہے؟ پھر رسول اللہ ﷺ نے تجھ سے فرمایا تھا" اے زبیرؓ! اللہ کی قسم! تو ضرور اس سے جنگ آزما ہوگا جبکہ تو ظلم کر رہا ہوگا۔"

حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کی یہ بات سن کر جواب دیا "ہاں مجھے یاد آ گیا ہے! میں تو اسے بھول گیا تھا۔ اللہ کی قسم..... میں تم سے اب لڑائی نہیں کروں گا۔"

پھر حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ دونوں اس اندرونی جنگ سے دست بردار ہو گئے مگر اس موقع پر جنگ سے دست برداری انھیں اپنی جانیں دے کر چکانی پڑی۔

حضرت زبیرؓ کو حالتِ نماز میں عمرو بن جرموز نامی شخص نے قتل کر دیا اور حضرت طلحہؓ کو مروان بن حکم نے تیر کے نشانہ پر لے کر زندگی سے محروم کر دیا۔

☆☆

حضرت طلحہؓ جنگِ جمل کے روز حضرت علیؓ کے مقابل لشکر میں شریک ہو کر جنگ آزما ہونے کے لیے پا بہ رکاب ہوئے، تو آپؓ اُمید یہ رکھتے تھے کہ آپؓ کا یہ اقدام حضرت عثمانؓ کے محاسبے پر مبنی ان کے اس پہلے مؤقف کا کفارہ بن جائے گا جو آپؓ کے ضمیر کے لیے کانٹا بن کر رہ گیا تھا۔ آپؓ معرکہ شروع ہونے سے قبل دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتے ہیں اور آہ و زاری کے الفاظ میں دعا گو ہوتے ہیں تو آپؓ کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ آپؓ کہتے ہیں "اے اللہ آج مجھ سے عثمانؓ کا بدلہ لے لے کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔"

حضرت علیؓ نے جب انھیں اور حضرت زبیرؓ کو متوجہ فرمایا تو جناب علیؓ کے الفاظ نے ان دونوں حضرتِ گرامی کے دلوں کو بدل کر رکھ دیا۔ وہ حق پر ڈٹنے والے اور اس کے لیے لڑنے والے تھے۔ جونہی انھیں اندازہ ہوا کہ اُن کا قدم درست نہیں ہے اور اللہ کے رسولؐ نے بھی اسی بارے میں فرمایا اور سمجھایا تھا۔ انھوں نے میدان جنگ چھوڑنے کا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی مگر سازشی عناصر کو ان کا یہ فیصلہ نہ بھایا اور اُنھوں نے دونوں صحابہ کو کچھ ہی دیر بعد زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ شہادت اُن کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔

اللہ اکبر..... شہادت حضرت طلحہؓ کے مقدر میں تھی۔ وہ جہاں بھی واقع ہوتی حضرت طلحہؓ اسے پا کر رہتے اور وہ انھیں پا کر رہتی۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا نہیں تھا "یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی نذر پوری کر دی ہے اور جس کو یہ بات خوش کرے کہ وہ زمین پر کسی شہید کو چلتا ہوا دیکھے تو وہ طلحہؓ کو دیکھ لے۔"

شہید نے اپنے عظیم انجام کو پا لیا اور واقعۂ جمل اپنے اختتام کو پہنچا۔ اُم المومنین حضرت عائشہؓ کو احساس ہوا کہ انھوں نے معاملہ فہمی میں عجلت سے کام لیا ہے جس کے باعث مسلمانوں کے ہی ۲ لشکروں کا آمنا سامنا ہو گیا ہے تو اس تصادم سے کنارہ کش ہو کر فوراً بصرہ چھوڑ کر مدینہ چلی گئیں۔ حضرت علیؓ نے پوری عزت و تکریم کے ساتھ انھیں سفر کی تمام سہولیات بہم پہنچائیں۔

☆☆

حضرت علیؓ اور ان کے ساتھی اور وہ لوگ جو ان کے خلاف تھے جب شہدائے جنگ کا معاینہ کر چکے تو حضرت علیؓ نے سب کی نماز جنازہ پڑھی۔ جب حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی تدفین سے فارغ ہوئے تو ان دونوں محترم اور جلیل القدر ہستیوں کو عظیم الفاظ میں الوداع کہا۔ حضرت علیؓ کے ان الوداعی کلمات کے آخری الفاظ یہ تھے:

"مجھے امید ہے کہ میں، طلحہؓ زبیرؓ اور عثمانؓ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"ان کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کھپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں گے، وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔" (الحجر: ۴۷)

پھر دونوں حضراتؓ کی قبروں پر غم ناک اور محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے فرمایا "میرے ان کانوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے "طلحہؓ اور زبیرؓ جنت میں میرے ہمسائے ہوں گے۔"

■

خُدا سے کبھی لڑائی مول نہ لینا

کیونکہ آدمی کے لیے خُدا سے کوئی بچاؤ نہیں

مصر کے گورنر مالک بن اشتر کے نام
حیران کر دینے والی نصیحت

اختیار و اقتدار کے سرچشموں سے
وابستہ لوگوں کے لیے تحفۂ خاص

سید بہزاد شاہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ

ہے وہ نصیحت، جس کا حکم دیا اللہ کے بندے علیؓ امیر المومنین نے مالک بن الحارث اشتر کو جب اسے مصر کا گورنر بنایا تاکہ اس ملک کا خراج جمع کرے، اس کے دشمنوں سے لڑے اس کے باشندوں کی سود بہبود کا خیال رکھے اور اس کی زمین کو آباد کرے۔

مالک کو حکم دیا ہے تقویٰ الٰہی کا، اطاعت خداوندی کو مقدم رکھنے کا اور کتاب اللہ کے مقرر کیے ہوئے فرائض و سنن کی پیروی کا، اس لیے کہ آدمی کی سعادت انہی کی پیروی سے وابستہ ہے اور ان سے انکار کرنے اور انھیں گنوا دینے میں سراسر بدبختی ہے۔

اور حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت میں اپنے دل سے، اپنے ہاتھ سے، اپنی زبان سے سرگرم رہے، کیونکہ خدائے بزرگ و برتر نے ذمہ لے لیا ہے کہ جو کوئی اس کی نصرت و تائید پر کھڑا ہوگا، نصرت و تائید خداوندی اسے حاصل رہے گی۔

اور حکم دیا ہے کہ خواہشوں کے موقع پر اپنے نفس کو توڑے، سرکشی کے وقت اسے روکے، کیونکہ نفس برائی کی طرف لے جاتا ہے، مگر یہ کہ خدا کا رحم آدمی کے شامل حال ہو جائے۔

اس کے بعد اے مالک سن! میں تجھے ایسے ملک بھیج رہا ہوں جس پر تجھ سے پہلے بھی حکومتیں گزر چکی ہیں۔ عادل بھی اور ظالم بھی۔ لوگ تیری حکومت کو بھی اسی نظر سے دیکھیں گے جس نظر سے تو اگلے حاکموں کی حکومتوں کو دیکھتا رہا ہے اور تیرے حق میں وہی کہا جائے گا جو تو ان حاکموں کے حق میں کہا کرتا تھا۔

تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ نیک آدمی اس آواز سے پہچانا جاتا ہے جو خدا اپنے بندوں کی زبان پر سے اس کے لیے جاری کر دیتا ہے۔

لہٰذا تیرا دل پسند ذخیرہ عمل صالح کا ذخیرہ ہو۔ یہ ذخیرہ اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ تجھے اپنی خواہشوں پر قابو حاصل ہو۔ جو چیز حلال نہیں ہے اس کے لیے تیرا دل کتنا ہی مچلے اپنے آپ کو اس سے دور رکھ۔

یہ بھی جان لو کہ محبوبات و مکروہات میں نفس کی مخالفت کرنا ہی نفس سے انصاف کرنا ہے۔

اپنے دل میں رعایا کے لیے رحم، محبت، الفت پیدا کرنا۔ خبردار رعایا کے حق میں پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جانا کہ اسے لقمہ بنا ڈالنے ہی میں تجھے اپنی کامیابی دکھائی دے۔

رعایا میں ۲ قسم کے آدمی ہوں گے، تمھارے دینی بھائی یا مخلوق خدا ہونے کے لحاظ سے تمھارے جیسے آدمی، لوگوں سے غلطیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ جان بوجھ کر یا بھولے چوکے سے ٹھوکریں کھاتے ہی رہتے ہیں تم اپنے عفو و کرم کا دامن خطاکاروں کے لیے اس طرح پھیلا دینا، جس طرح تمھاری آرزو ہے کہ خدا تمھاری خطاؤں کے لیے اپنا دامن عفو و کرم پھیلا دے۔

کبھی نہ بھولنا کہ تم رعایا کے افسر ہو، خلیفہ تمھارا افسر ہے اور خدا خلیفہ کے اوپر حاکم ہے۔ خلیفہ نے تمھیں گورنر بنایا ہے اور مصر کی ترقی و اصلاح کی ذمہ داری تمھیں سونپ دی ہے۔

خدا سے لڑائی نہ مول لینا کیونکہ آدمی کے لیے خدا سے کوئی بچاؤ نہیں۔ خدا کے عفو و رحمت سے تم کبھی بھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

عفو پر کبھی نادم نہ ہونا۔ سزا دینے پر کبھی شیخی نہ بگھارنا، غصہ آتے ہی دوڑ نہ پڑنا بلکہ جہاں ممکن ہو غصے سے بچنا اور غصے کو پی جانا۔

خبردار رعایا سے کبھی نہ کہنا کہ میں تمھارا حاکم بنا دیا گیا ہوں اور اب میں ہی سب کچھ ہوں، سب کو میری فرمانبرداری کرنی چاہیے۔ اس ذہنیت سے دل میں فساد پیدا ہوتا ہے، دین میں کمزوری اور بربادی کے لیے بلاوا آتا ہے۔

اگر حکومت کی وجہ سے غرور پیدا ہونے لگے تو سب سے بڑے بادشاہ خدا کی طرف دیکھنا جو تمھارے اوپر ہے اور تم پر وہ قدرت رکھتا ہے جو تم خود اپنے آپ پر نہیں

رکھتے۔ ایسا کرو گے تو نفس کی طغیانی کم ہو جائے گی حدت گھٹ جائے گی بھٹکی ہوئی روح لوٹ آئے گی۔

خبردار! خدا کے ساتھ اس کی عظمت میں بازی نہ لگانا، اس کی جبروت میں تشبہ اختیار نہ کرنا، کیونکہ خدا جباروں کو ذلیل کر ڈالتا اور مغروروں کو نیچا دکھا دیتا ہے۔

اپنی ذات اور معاملے میں، اپنے خاص عزیزوں کے معاملے میں جنھیں تم اپنی رعایا میں سے چاہتے ہو، خدا سے بھی انصاف کرنا اور خدا کے بندوں سے بھی انصاف کرنا۔ یہ نہ کرو گے تو ظلم کرنے لگو گے۔

یاد رکھو جو کوئی خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے تو خدا خود اپنے مظلوم بندوں کی طرف سے ظالم کا حریف بن جاتا ہے اور معلوم ہے خدا جس کا حریف بن جائے اس کی حجت باطل ہو جاتی ہے، وہ خدا سے لڑائی ٹھاننے کا مجرم ہوتا ہے، یہاں تک کہ باز آجائے اور توبہ کرے۔ خدا کی نعمت کو اس سے بڑھ کر بدلنے والی اور خدا کی عقوبت کو اس سے زیادہ بلانے والی کوئی چیز نہیں کہ آدمی ظلم کو اختیار کر لے، یاد رہے خدا مظلوموں کی سنتا اور ظالموں کی تاک میں رہتا ہے۔

وہ سب اسباب دُور کر دینا، جو لوگوں میں بغض و کینہ پیدا کرتے ہیں۔ عداوت و غیبت کی ہر جڑ کاٹ ڈالنا۔ خبردار چغل خور کی بات ماننے میں جلدی نہ کرنا کیونکہ چغل خور دغا باز ہوتا ہے۔ اگرچہ خیر خواہ کا روپ بھر کے سامنے آتا ہے۔

اپنے مشورے میں بخیل کو شریک نہ کرنا کیونکہ وہ تمھیں احسان کرنے سے روکے اور فقر سے ڈرائے گا۔

بزدل کو بھی صلاح میں شریک نہ کرنا کیونکہ مہمات میں تمھاری ہمت کمزور کر دے گا۔ حریص کو بھی شریک نہ کرنا کیونکہ ظلم کی راہ سے دولت سمیٹنے کی ترغیب دے گا۔ یاد رکھو بخل، بزدلی اور حرص اگرچہ الگ الگ خصلتیں ہیں، مگر ان کی بنیاد خدا سے سوءظن پر ہے۔

بدترین وزیر وہ ہے جو شریروں کی طرف داری کرے اور گناہوں میں ان کا ساجھی ہو۔ ایسے آدمی کو اپنا وزیر نہ بنانا کیونکہ اس قسم کے لوگ گناہ گاروں کے مددگار اور ظالموں کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ان کی جگہ تمھیں ایسے آدمی مل جائیں گے جو عقل و تدبیر میں ان کے برابر ہوں گے مگر گناہوں سے ان کی طرح لدے نہ ہوں گے۔ نہ کسی ظالم کی اس کے ظلم میں مدد کی ہوگی نہ کسی گنہگار کا اس کے گناہ میں ساتھ دیا ہوگا۔ یہ لوگ تمھیں کم تکلیف دیں گے۔ تمھارے بہترین مددگار ثابت ہوں گے، تم سے پوری ہمدردی رکھیں گے اور غیر سے اپنے سب رشتے کاٹ لیں گے۔ ایسے ہی لوگوں کو نجی صحبتوں اور عام درباروں میں اپنا مصاحب بنانا۔

تمھاری مجلس سے سب سے زیادہ دور اور تمھاری نگاہ میں سب سے زیادہ مکروہ وہ شخص ہونا چاہیے جو لوگوں کے عیب ڈھونڈا کرتا ہے۔ لوگوں میں عیب تو ہوتے ہی ہیں، یہ کام حاکم کا ہے کہ ان کے عیب ڈھکے۔ خبردار چھپے ہوئے عیبوں کی کرید نہ کرنا۔ تمھارا منصب بس یہ ہے کہ جو عیب چھپے ہوئے ہیں، ان کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دو۔ حتی المقدور لوگوں کے ڈھکے کو ڈھکا ہی رہنے دینا۔ ایسا کرو گے تو خدا بھی تمھارے وہ عیب ڈھکے رہنے دے گا، جو تم رعایا سے چھپانا چاہتے ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر یہ بھی یاد رہے کہ خاص الخاص لوگوں میں بھی وہی تمھاری نگاہ میں سب سے زیادہ مقبول ہوں جو زیادہ سے زیادہ کڑوی بات تم سے کہہ سکتے ہوں اور ان کاموں میں تمھارا ساتھ دینے سے انکار کر سکتے ہوں جو خدا اپنے بندوں کے لیے ناپسند فرما چکا ہے۔

اہل تقویٰ وصدق کو اپنا مصاحب بنانا۔ انھیں ایسی تربیت دینا کہ تمھاری جھوٹی تعریف کبھی نہ کریں کیونکہ تعریف کی بھرمار سے آدمی میں غرور پیدا ہوتا ہے۔

اور تمھارے سامنے نیکوکار اور خطاکار برابر نہ ہوں۔ ایسا کرنے سے نیکوں کی ہمت پست ہوجائے گی۔ خطاکار اور بھی شوخ ہوجائیں گے، ہر آدمی کو وہ جگہ دینا جس کا وہ اپنے عمل کے لحاظ سے مستحق ہے۔

اور تمھیں جاننا چاہیے کہ رعایا میں اپنے حاکم کے

خبردار! کسی مصاحب یا رشتہ دار کو جاگیر نہ دینا، ایسا کرو گے تو یہ لوگ رعایا پر ظلم کریں گے، خود فائدہ اٹھائیں گے

ساتھ حسن ظن اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ حاکم رعایا پر رحم و کرم کی بارش کرتا رہے، اس کی تکلیفیں دور کرے اور کوئی ایسا مطالبہ نہ کرے جو اس کے بس سے باہر ہو۔ یہ اصول تمھارے لیے کافی ہے۔ اس طرح رعایا کا حسن ظن تمھیں بہت سی مشکلوں سے بچا دے گا۔

کسی اچھے دستور کو نہ توڑنا جو اس اُمت کے اگلے لوگ جاری کر گئے ہیں اور جس سے لوگوں میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ رعایا کی بھلائی کے لیے جاری روایات توڑ دو گے تو اچھے دستوروں کا ثواب اگلوں کے لیے باقی رہے گا اور عذاب تمھارے حصے میں آئے گا کہ بھلی راہ تم نے مٹا دی۔

دیکھو اپنی فوج کے سلسلہ میں ہوشیاری سے کام لینا انہی لوگوں کو افسر بنانا جو تمھارے خیال میں اللہ کے رسولؐ کے اور تمھارے امام کے سب سے زیادہ خیرخواہ ہوں، صاف دل ہوں، ہوش مند ہوں، جلد غصے میں نہ آجاتے ہوں، کمزوروں پر ترس کھاتے ہوں، زبردستوں پر سخت ہوں۔ نہ سختی انھیں جوش میں لے آتی ہو نہ کمزوری انھیں بٹھا دیتی ہو۔

فوج کے لیے انہی کو منتخب کرنا جن کا حسب نسب اور خاندان اچھا ہے، جن کا ماضی بے داغ ہے، جو ہمت و شجاعت، جود وسخا سے آراستہ ہیں، شرافت اور نیکی ایسے ہی لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے۔

ان فوجیوں کے معاملات کی ویسی ہی فکر کرنا جیسی والدین کو اولاد کی ہوتی ہے۔ ان کی تقویت اور درستی حال کے لیے جو بھی بن پڑے کرتے رہنا اور جو کچھ کرو اسے بہت نہ سمجھنا۔ اپنے کم سے کم لطف واحسان کو بھی معمولی نہ سمجھنا کیونکہ اس سے ان کی خیرخواہی بڑھے گی اور حسن ظن میں اضافہ ہوگا۔ ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورتوں سے بھی بے پروائی اس بھروسے پر نہ کرنا کہ بڑی ضرورتوں کا خیال کر رہے ہو کیونکہ تمھاری معمولی رعایت بھی ان کے لیے نعمت ہوگی اور بڑی ضرورتوں میں سراسر تمھارے لطف و کرم کے ہمیشہ محتاج رہیں گے۔

وہی فوجی سردار تمھارے سب سے زیادہ مقرب ہوں جو فوجیوں کی سب سے زیادہ مدد کرتے ہوں، اپنے ہاتھ کی دولت سے سپاہیوں کو ان کی ضرورتوں اور بال بچوں کی فکروں سے آزاد کرتے ہوں تاکہ ساری فوج ایک دل ہو جائے اور اس کے سامنے بس ایک ہی خیال رہے، دشمن سے جنگ۔ فوج کے سرداروں پر تمھاری توجہ فوجیوں کے دلوں کو تمھاری طرف متوجہ کر دے گی۔

حاکم کی آنکھ کی ٹھنڈک کس چیز میں ہونی چاہیے۔ اس میں کہ خود انصاف قائم کرے اور رعایا اس سے اپنی محبت ظاہر کرتی رہے۔ رعایا کی محبت ظاہر نہیں ہوتی جب

تک اس کے دل سلیم نہ ہوں اور رعایا کی خیرخواہی صحیح نہیں ہوتی جب تک اسے حاکم سے سچی محبت نہ ہو، اس کی حکومت کو بوجھ اور اس کے زوال میں دیر کو وبال نہ سمجھتی ہو۔

ہر آدمی کے کارنامہ کا اعتراف کرنا ایک کا کارنامہ دوسرے کی طرف منسوب نہ کرنا۔ انعام دینے میں کبھی کوتاہی نہ کرو۔ خاندانی ہونے کی وجہ سے کسی کے معمولی کام کو بڑھا چڑھا نہ دینا۔ اسی طرح ادنیٰ خاندان ہونے کی وجہ سے کسی کے بڑے کارنامہ کی بے قدری نہ کرنے لگنا۔

مشتبہ معاملات پیش آئیں اور تمھاری بصیرت وعلم ساتھ نہ دے تو انھیں اللہ کی طرف اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف لوٹانا کیونکہ خدا مسلمانوں کی ہدایت کے لیے فرما چکا ہے۔

اللہ کی طرف معاملے کو لوٹانا یہ ہے کہ کتاب محکم اور نص صریح کی طرف لوٹایا جائے۔ رسولؐ کی طرف لوٹانا یہ ہے کہ جامع سنت نبویؐ کو لیا جائے نہ کہ اسے جس میں اختلاف پڑ گیا ہے۔

پھر ملک میں انصاف کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کرنا جو تمھاری نظر میں سب سے افضل ہوں۔ ہجوم معاملات سے تنگ دل نہ ہوتے ہوں۔ اپنی غلطی پر اڑے رہنا ہی ٹھیک نہ سمجھتے ہوں اور حق کے ظاہر ہوجانے کے بعد باطل سے چمٹے نہ رہتے ہوں۔ طماع نہ ہوں، اپنے فیصلوں پر غور کرنے کے عادی ہوں، فیصلے کے وقت شکوک وشبہات پر رکنے والے ہوں۔ صرف دلائل کو اہمیت دیتے ہوں۔ مدعی اور مدعا علیہ سے بحث میں اکتا نہ جاتے ہوں۔ واقعات کی تہ تک پہنچنے سے جی نہ چراتے ہوں اور حقیقت کھل جانے پر اپنے فیصلہ میں بے باک اور بے لاگ ہوں۔ یہ ایسے لوگ ہوں جنھیں نہ تعریف بے خود کر دیتی ہو، نہ چاپلوسی ہی مائل کر سکتی ہو مگر ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔

تمھارا فرض ہے کہ اپنے قاضیوں کے فیصلوں کی جانچ کرتے رہو، کھلے دل سے انھیں معاوضہ دو تاکہ ان کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں اور کسی کے سامنے انھیں ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ اپنے دربار میں انھیں ایسا درجہ دو کہ تمھارے کسی مصاحب اور درباری کو ان پر دباؤ ڈالنے یا انھیں نقصان پہنچانے کی ہمت نہ ہو سکے۔ قاضیوں کو ہر قسم کے خوف سے بالکل آزاد ہونا چاہیے۔ اس بارے میں پوری توجہ سے کام لینا کیونکہ دین اشرار کے ہاتھ میں پڑ گیا تھا جو اپنی خواہشوں پر چلتے اور دین کے نام پر دنیا کمایا کرتے تھے۔

عمال حکومت کے معاملات پر بھی تمھیں نظر رکھنا ہوگی۔ جسے مقرر کرنا امتحاناً مقرر کرنا۔ رو رعایت سے یا صلاح مشورے کے بغیر کسی کو عہدہ نہ دینا کیونکہ ایسا کرنے سے ظلم وخیانت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اچھے گھرانوں اور سابق میں اسلام کے خدمت گزاروں میں تجربہ کار اور باحیا لوگوں ہی کو منتخب کرنا کہ ان کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں۔ اپنی آبرو کا خیال رکھتے، طمع کی طرف کم جھکتے اور انجام پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔

عہدہ داروں کو بہت اچھی تنخواہیں دینا، اس سے یہ لوگ اپنی حالت درست کر سکیں گے اور حکومت کے اس مال سے بے نیاز رہیں گے جو ان کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس پر بھی حکم عدولی کریں یا امانت میں خلل ڈالیں تو تمھارے پاس ان پر حجت ہوگی مگر ضروری ہے کہ ان کاموں کی جانچ پڑتال کرتے رہنا، نیک لوگوں کو مخبر بنا کر ان پر چھوڑ دینا یہ اس لیے کہ جب انھیں معلوم ہوگا کہ خفیہ نگرانی بھی ہو رہی ہے تو امانت داری اور رعایا سے مہربانی میں اور زیادہ چست ہوجائیں گے۔ پھر اگر ان میں سے کوئی شخص خیانت کی طرف ہاتھ بڑھائے اور تمھارے جاسوسوں سے تصدیق ہوجائے تو بس یہ شہادت کافی ہے۔ تم بھی سزا کا ہاتھ بڑھانا۔ جسمانی اذیت کے ساتھ خیانت کی رقم بھی اگلوا لینا۔ خائن کو ذلت کی جگہ کھڑا کرنا اور پوری طرح اسے رسوا کر ڈالنا۔

تجار اور اہل حرفت کا پورا خیال رکھنا۔ ان کا بھی، جو مقیم ہیں اور ان کا بھی جو پھیری کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ ملک کی دولت بڑھاتے اور دُور دُور سے سامان لاتے ہیں۔ خشکیوں، تریوں، میدانوں، ریگستانوں، سمندروں،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمال حکومت کے معاملات پر بھی تمھیں نظر رکھنا ہوگی جیسے مقرر کرنا امتحاناً مقرر کرنا، رو رعایت سے یا صلاح مشورے کے بغیر کسی کو عہدہ نہ دینا

دریاؤں اور پہاڑوں کو پار کر کے ضروریاتِ زندگی مہیا کرتے ہیں۔ ایسی ایسی جگہوں سے مال ڈھو لاتے ہیں، جہاں اور لوگ نہیں پہنچتے بلکہ وہاں جانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے۔

تاجر اور اہل حرفہ، امن پسند لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے شورش و بغاوت کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ اس پر بھی ضروری ہے کہ پایہ تخت میں بھی اور اطراف ملک میں بھی ان پر نگاہ رکھی جائے کیونکہ ان میں سے اکثر بڑے تنگ دل بڑے بخیل ہوتے ہیں۔ اجارہ داری سے کام لیتے اور لین دین میں کملی ڈال کر لوٹ لینا چاہتے ہیں۔

اجارہ داری کی قطعی ممانعت کر دینا کیونکہ رسول اللہ نے اسے منع فرمایا ہے لیکن ہاں خرید و فروخت خوشدلی سے ہو۔ وزن بٹے ٹھیک رہیں۔ نرخ مقرر ہوں۔ نہ بیچنے والا گھاٹے میں رہے، نہ مول لینے والا مونڈا جائے اور ممانعت پر بھی اگر کوئی اجارہ داری کا مرتکب ہو تو اعتدال کے ساتھ اسے عبرت انگیز سزا دی جائے۔

پھر اللہ اللہ، ادنیٰ طبقے کے معاملے میں یہ لوگ وہ ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں، فقیر، مسکین، محتاج، قلاش، اپاہج، ان میں ایسے بھی ہیں جو ہاتھ پھیلاتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو ہاتھ نہیں پھیلاتے مگر خود صورتِ حال ہیں۔

ان لوگوں کے بارے میں جو فرض خدا نے تمھیں سونپا ہے اس پر نگاہ رکھنا۔ اسے تلف نہ ہونے دینا۔ بیت المال میں ایک حصہ ان کے لیے خاص کر دینا اور اسلام کی جہاں جو صافی جائیداد موجود ہے اس کی آمدنی میں ان کا بھی حصہ رکھنا۔ ان میں سے کون دور، کون نزدیک ہے، یہ نہ دیکھنا۔ دور نزدیک سب کا حق برابر ہے اور ہر ایک کے حق کی ذمہ داری تمھارے سر ڈال دی گئی ہے۔

دیکھو دولت کا نشہ تمھیں ان بے چاروں سے غافل نہ کر دے۔ اگر تم نے اس بارے میں اہم و اکثر کو پورا کر دیا تو بھی اس وجہ سے تمھاری غفلت بھی معاف نہ کی جائے گی۔ لہٰذا ان کے ساتھ تکبر سے پیش نہ آنا اور اپنی توجہ سے انھیں محروم نہ کرنا۔

ان میں ایسے بھی ہوں گے جو تمھارے پاس پہنچ نہیں سکتے۔ انھیں نگاہیں ٹھکراتی ہیں اور لوگ ان سے گھن کھاتے ہیں۔ ان کی خبر گیری بھی تمھارا کام ہے۔ ان کے لیے بھروسے کے آدمیوں کی خدمات خاص کر دینا مگر یہ آدمی ایسے ہوں جو خوف خدا رکھتے اور دل کے خاکسار ہوں۔ یہ لوگ ان بے کسوں کے معاملات تمھارے سامنے لایا کریں اور تم وہ کرنا کہ قیامت میں خدا کے سامنے تمھیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ یاد رکھو رعایا میں ان غریبوں سے زیادہ انصاف کا کوئی مستحق نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کا جو حق ہے پورا پورا ادا کرتے رہنا۔

اور یتیموں کے پالنے والوں کا بھی خیال رکھنا ہوگا اور ان کا بھی جو بہت بوڑھے ہو چکے ہیں جن کا کوئی سہارا باقی نہیں جو بھیک مانگنے کے بھی لائق نہیں رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں حاکموں پر بے شک گراں ہوتی ہیں لیکن یہ بھی سوچنا چاہیے کہ پورے کا پورا حق گراں ہی ہے۔ ہاں خدا کبھی حق کو ان کے لیے آسان کر دیتا ہے جو عاقبت کی طلب میں رہتے ہیں اور اس لیے مشکلات و مکروہات میں اپنے دل کو مضبوط بنا لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا یقین اس وعدہ پر پختہ ہے جو پروردگار اپنے نیک بندوں سے کر چکا ہے۔

اور تم اپنے وقت کا ایک حصہ فریادیوں کے لیے خاص کر دینا۔ سب کام چھوڑ کر ان سے ملا کرنا۔ ایسے موقع پر تمھاری مجلس عام رہے کہ جس کا جی چاہے بے دھڑک چلا آئے۔ اس مجلس میں تم خدا کے نام پر خاکسار بن جاؤ۔ فوجیوں، افسروں اور پولیس والوں سے مجلس کو بالکل خالی رکھنا، تاکہ آنے والے دل کھول کر اپنی بات کہہ سکیں۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ کو بار بار فرماتے سنا ہے "اس امت کی بھلائی نہیں ہو سکتی جس میں کمزوروں کا طاقتور سے پورا حق دلایا نہیں جاتا۔"

یہ بھی کہ اس مجلس میں عوام ہی جمع ہوں گے اب اگر بدتمیزی سے بات کریں یا اپنا مطلب صاف بیان نہ کر سکیں تو خفا نہ ہونا، برداشت کر لینا، خبردار زجر و توبیخ نہ کرنا۔ تکبر سے پیش نہ آنا۔ میری وصیت پر عمل کرو گے تو خدا تم پر اپنی رحمت کی چادریں پھیلا دے گا اور اپنی فرماں برداری کا ثواب تمھارے لیے اٹل کر دے گا۔ جس کو کچھ دینا اس طرح کہ وہ خوش ہو جائے اور نہ دے سکنا تو اپنا عذر صفائی سے پیش کر دینا۔

> **اپنے وقت کا سب سے افضل حصہ اپنے پروردگار کے لیے خاص کر دینا اگرچہ سب وقت اللہ ہی کے ہیں بشرطیکہ نیک نیت ہو اور رعایا کو اس نیک نیت سے سلامتی ملتی ہو**

پھر ایسے معاملات بھی ہیں جنھیں خود اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا ہوگا۔ ایک معاملہ تو یہی ہے کہ عمال حکومت کے ان مراسلوں کا جواب خود لکھا کرنا۔ جو تمھارے منشی نہیں لکھ سکتے۔

ایک معاملہ یہ ہے، جس دن روپیہ آئے اسی دن مستحقوں کو بانٹ دینا۔ اس سے تمھارے درباریوں کو کوفت تو ضرور ہوگی کیونکہ ان کی مصلحتیں تقسیم میں تاخیر و تعویق چاہیں گی۔ روز کا کام روز ختم کر دینا کیونکہ ہر دن کے لیے اُسی دن کا کام بہت ہوتا ہے۔

اپنے وقت کا سب سے افضل حصہ اپنے پروردگار کے لیے خاص کر دینا اگرچہ سب وقت اللہ ہی کے ہیں بشرطیکہ نیک نیت ہو اور رعایا کو اس نیک نیت سے سلامتی ملتی ہو۔

خدا کے لیے دین کو خالص کرنے میں سب سے زیادہ یہ خیال رہے کہ فرائض بغیر کسی کمی بیشی کے کماحقہٗ بجا لائے جائیں۔ یہ فرائض صرف خدا کے لیے خاص ہیں اور ان میں کسی کا ساجھا نہیں۔

اور دیکھو جب امامت کرنا تو ایسی امامت نہیں کہ لوگ نماز ہی سے بیزار ہو جائیں اور ایسی امامت بھی نہیں کہ نماز کا کوئی رکن ضائع ہو جائے۔ یاد رکھو نمازیوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ تندرست، بیمار اور ضرورت مند بھی۔ رسول اللہ ﷺ جب مجھے یمن بھیجنے لگے تو میں نے عرض کیا تھا۔ یا رسول اللہ ﷺ امامت کس طرح کروں گا؟ جواب ملا "تیری نماز ویسی ہو جیسی سب سے کم طاقت کے نمازی کی ہو سکتی ہے اور تو مومنوں کے لیے رحیم ثابت ہونا۔"

خبردار کسی مصاحب یا رشتہ دار کو جاگیر نہ دینا۔ ایسا کرو گے تو یہ لوگ رعایا پر ظلم کریں گے، خود فائدہ اٹھائیں گے اور دنیا و آخرت میں مخلوق خدا کی بدگوئی تمھارے سر پڑے گی۔

حق کسی کے خلاف پڑے اس پر حق ضرور نافذ کرنا چاہیے، چاہے تمھارا عزیز قریب ہو یا غیر، اس بارے میں تمھیں مضبوط اور ثواب خداوندی کا آرزومند رہنا ہوگا۔ حق کا وار، خود تمھارے رشتہ داروں اور عزیز ترین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خبردار! خدا کے ساتھ اس کی عظمت میں بازی نہ لگانا، اس کی جبروت میں تشبہ اختیار نہ کرنا، کیونکہ خدا جباروں کو ذلیل کر ڈالتا اور مغروروں کو نیچا دکھا دیتا ہے

مصاحبوں ہی پر کیوں نہ پڑے تمھیں خوشدلی سے یہ گوارا کرنا ہوگا، بے شک تم بھی آدمی ہو اور تمھیں اس سے کوفت ہو سکتی ہے۔ لیکن تمھاری نگاہ ہمیشہ نتیجہ پر رہنی چاہیے۔ یقین کرو نتیجہ تمھارے حق میں اچھا ہی ہوگا۔

اور دیکھو جب دشمن ایسی صلح کی طرف بلائے جس میں خدا کی رضامندی ہو، تو انکار نہ کرنا کیونکہ صلح میں تمھاری فوج کے لیے آرام ہے اور خود تمھارے لیے بھی فکروں سے چھٹکارا اور امن کا سامان ہے۔

لیکن صلح کے بعد دشمن سے خوب چوکس، خوب ہوشیار رہنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے صلح کی راہ سے اس نے تقرب اس لیے حاصل کیا ہو کہ بے خبری میں تم پر ٹوٹ پڑے، لہٰذا بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں حسن ظن سے کام نہیں چل سکتا۔

اور جب دشمن سے معاہدہ کرنا یا اپنی زبان اسے دے دینا تو عہد کی پوری پابندی کرنا۔ عہد کو بچانے کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دینا کیونکہ سب باتوں میں لوگوں کا اختلاف رہا ہے مگر اس بات پر سب متفق ہیں کہ آدمی کو اپنا عہد پورا کرنا چاہیے۔ مشرکوں تک نے عہد کی پابندی ضروری سمجھی تھی حالانکہ مسلمانوں سے بہت نیچے تھے یا اس لیے کہ تجربوں نے انھیں بتا دیا تھا کہ عہد شکنی کا نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے۔

لہٰذا اپنے عہد، وعدے، زبان کے خلاف کبھی نہ جانا۔ دشمن سے دغابازی نہ کرنا، کیونکہ یہ خدا سے سرکشی ہے اور خدا سے سرکشی بے وقوف اور نادان ہی کیا کرتے ہیں۔

اور عہد کیا ہے؟ خدا کی طرف سے امن امان کا اعلان ہے، جو اس نے اپنی رحمت سے بندوں میں عام کر دیا ہے۔ عہد خدا کا حرم ہے جس میں سب کو پناہ ملتی ہے اور جس کی طرف سبھی دوڑتے ہیں۔

خبردار عہد و پیمان میں کوئی دھوکا، کوئی کھوٹ نہ رکھنا اور معاہدے کی عبارت ایسی نہ ہونے دینا جو گول مول، مبہم ہو، کئی کئی مطلب اس سے نکلتے ہوں۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو عہد دے چکنے کے بعد ایسی عبارت سے فائدہ نہ اٹھانا۔

اور یہ بھی یاد رہے کہ معاہدہ ہو چکنے کے بعد اگر اس کی وجہ سے پریشانی لاحق ہو، تو ناحق اسے منسوخ نہ کر دینا۔ پریشانی جھیل لینا بدعہدی کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ بدعہدی پر خدا تم سے جواب طلب کرے گا اور دنیا و آخرت میں اس کے مواخذے سے کہیں مفر نہ ہوگا۔

خبردار! ناحق خون نہ بہانا، کیونکہ خون ریزی سے بڑھ کر بدانجام، نعمت کا ڈھانے والا، مدت کو ختم کرنے والا کوئی کام نہیں۔ قیامت کے دِن جب خدا کا دربار عدالت لگے گا تو سب سے پہلے خون ناحق ہی کے مقدمے پیش ہوں گے اور خدا فیصلہ کرے گا۔ یاد رکھو خون ریزی سے حکومت طاقتور نہیں ہوتی بلکہ کمزور پڑ کر مٹ جاتی ہے۔

خبردار رعایا پر کبھی احسان نہ جتانا۔ جو کچھ اس کے لیے کرنا اسے بڑھا چڑھا کر نہ دکھانا۔ احسان جتانے سے احسان مٹ جاتا ہے۔ بھلائی کو بڑھا کر دکھانے سے حق کی روشنی چلی جاتی ہے اور وعدہ خلافی سے خدا بھی ناخوش ہوتا ہے اور حق کے بندے بھی۔ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے:

"دیکھو اپنے غصہ کو، طیش کو، ہاتھ کو، زبان کو قابو میں رکھنا۔ سزا دینے کو ملتوی کر دینا، یہاں تک کہ غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ اس وقت تمھیں اختیار ہوگا کہ جو مناسب سمجھو کرو مگر اپنے آپ پر قابو نہ پاسکو گے جب تک پروردگار کی طرف واپسی کا معاملہ تمھارے خیالات پر غالب نہ آجائے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیکنڈ

فلور پر واقع بورڈ روم میں داخل ہوا جو آج کل کے کارپوریٹ عہد میں میٹنگ روم کا ہی نیا نام ہے تو مسکراتے چہرے پر چھوٹی چھوٹی گھنی ڈاڑھی والا سمارٹ سا مہمان میرے سامنے تھا۔

شاہد اقبال خصوصی طور پر اسلام آباد سے آئے تھے۔ باہمی تعارف کے لیے وزیٹنگ کارڈز کا تبادلہ ہوا۔ میں یہی جانتا تھا کہ وہ خوشحال فیڈ اینڈ فارمز اسلام آباد کے ڈائریکٹر ہیں۔ اب پتا چلا کہ وہ نسان لمیٹڈ راولپنڈی کے علاوہ شارجہ میں واقع ای وی ایرویژن کے بھی ڈائریکٹر اور گنج گلاس حسن ابدال کے پارٹنر ہیں۔

۱۴راگست کو بھی اپنے عملے کی سالانہ انکری منٹس کے لیے دفتر بیٹھنے والے شاہد اقبال ڈی پی اے ویلیز سے ایم ایس سی ہیں۔ گزشتہ ۱۲رسال سے وہ بہت کامیابی سے خوشحال فیڈ اینڈ فارمز کو چلا رہے ہیں۔ ۱۲۔۱۵رفیصد سالانہ کی رفتار سے مسلسل ترقی کرتی یہ کمپنی آل نیٹ ورک کا حصہ بننے والی ابتدائی کمپنیوں میں سے ایک ہے۔ ان کے بھائی اور والد شیشہ بنانے کے بزنس میں ہیں۔ گلاس صنعت ایک ہائی فائی، کیمیکل انڈسٹری ہے۔ اس کے بجائے ایک ناگوار بو رکھنے والی روایتی پولٹری فیڈ بنانے کی کمپنی کو چلانا اور اس کو گروتھ اور ترقی کے اسی پیڈسٹل پر لے جانا جہاں گلاس صنعت کھڑی ہو، یقیناً ایک مشکل اور مسلسل محنت کا کام رہا ہوگا۔

قومی سطح کے ادارے مالکان کے نہیں، قوم کی ملکیت ہوتے ہیں، ان کے چلنے میں ہی سب کا فائدہ ہوتا ہے

۱۸رکروڑ کی آبادی کے لیے پولٹری سیکٹر سے تقریباً ڈیڑھ ملین لوگوں کا روزگار وابستہ ہے۔ ان میں خوشحال فیڈز میں کام کرنے والے ۱۵۰رلوگ بھی شامل ہیں جو ادارے کو ۹۰۰رملین سالانہ کمانے میں مدد دیتے ہیں۔ پاکستان میں مرغی کا گوشت، کل گوشت کی پیداوار کا ۱۹رفیصد ہے جبکہ زراعت کی گروتھ میں پولٹری کا حصہ ۸۱،۴رفیصد ہے۔ پولٹری کے سیکٹر میں ۲۰۰رملین کی سرمایہ کاری کے باعث یہ شعبہ سالانہ ۱۰رفیصد کے حساب سے ترقی کر رہا ہے۔

شاہد اقبال سمجھتے ہیں کہ مسلمان شروع سے ہی گوشت شوق سے کھاتے ہیں۔ اس لیے دنیا کے سب سے لذیذ گوشت والے کھانے انہی کے ہاں پکائے جاتے ہیں۔ جیسے دنیا میں سبزی پکانے کے سب سے اچھے ذائقے ہندو کمیونٹی کے ہاں ملتے ہیں، کہ وہ شروع سے ہی سبزی خور رہے ہیں۔

۱۲رسال پہلے ایک مشکل فیصلہ آسانی سے کر کے پولٹری بزنس میں آنے والے شاہد اقبال آج ملک بھر میں پولٹری ایسوسی ایشن کی سنٹرل ایگزیکٹو کے منتخب رکن ہیں اور اپنی پہچان رکھتے ہیں۔

شاہد اقبال، فیڈ انڈسٹری کے فوڈ انڈسٹری میں بدلنے کے گواہ ہی نہیں حصہ بھی ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ آنے والے برسوں میں پولٹری پراڈکٹ میں ویلیو ایڈ کر سکیں۔ وہ ہاف کُکڈ (Half Cooked) اور تیار شدہ چکن پراڈکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ اس شعبے میں بہت بڑے نام خلیل ستار کی محنت اور کام کے بہت قائل ہیں، جنھوں نے ملک میں KNN کی طرح ڈالی۔ خلیل کو وہ اپنا بنچ مارک قرار دیتے ہیں کیونکہ انھیں لگتا ہے آنے والے دنوں میں کے این این کا گروتھ ریٹ سب سے زیادہ ہوگا۔

بڑے اداروں کے جھرمٹ میں اب خوشحال فیڈ کی ''دو مرغیوں والا'' لوگو بھی پہچانا جانے لگا ہے۔ اس کی وجہ مسلسل غور و فکر، دیانت داری اور محنت کے ساتھ ساتھ

خاندانی بڑوں کی وہ ماہانہ بزنس ریویو میٹنگز بھی شامل ہیں جن میں ان کے والد، بھائی اور ماموں بیٹھتے ہیں اور طے شدہ معیارات کے تحت کام کی رفتار اور نتائج کو دیکھتے ہیں۔ بینک سے قرضہ اور سود کے پیسے بزنس میں شامل نہ کرنے کے فیصلے پر قائم، ان دنوں قرآن پاک کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ فارغ وقت میں جیک ویلش کی کتاب Winning زیر مطالعہ ہے۔

۷رسالہ عبداللہ اکرام اور ۵رسالہ ابراہیم اقبال کی والدہ ڈاکٹر ہیں اور شاہد اقبال کی زندگی میں آنے کے بعد بھی مریم رؤف ہیں۔ وہ اپنی شریک حیات اور اپنے والد شیخ محمد اقبال کے ساتھ اپنے نانا محمد علی کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے ہیں جنھوں نے اس خاندان کو بزنس کی راہ پر لگایا۔ نانا ۱۸رسال مسلسل اللہ کی رحمت کا شکر ادا کرنے باقاعدگی سے حرمین شریفین جاتے رہے اور آرزو کرتے رہے کہ لوگ ان کو محمد علی مکے والا کے نام سے پہچانیں اور ان کا آخری دم بھی وہیں نکلے، جہاں سے وہ حرم میں ہونے والی قرآت سنتے رہیں۔ نانا کی دونوں خواہشیں پوری ہوئیں۔ شاہد اقبال ان کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر حرم میں ہونے والی قرآت کو سنتے اور اپنے نانا کی دعا کی قبولیت کی گواہی دیتے ہیں۔ آیئے، اب ان سے ملتے ہیں

سوال: شاہد اقبال میں کیا خوبیاں نمایاں ہیں؟

شاہد: فیملی بزنس میں کام کرتے ہوئے مجھے ۱۲رسال ہوگئے ہیں۔ خود کو منکسر المزاج سمجھتا ہوں۔ کوشش ہوتی ہے کہ شکر گزار بنوں جیسے ٹھنڈے کمرے میں بیٹھنا ایک بڑی نعمت ہے، اس کا احساس رہنا چاہیے۔ بہت سے لوگوں کو یہ نعمت میسر نہیں ہوتی۔ ابھی وزیر اعلیٰ پنجاب جب سخت گرمی میں ٹینٹ آفس میں گھنٹوں بیٹھتے ہوں گے تو ان کی ٹیم کو بھی احساس ہوتا ہوگا۔

گاڑی میں بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھنا مجھے مناسب نہیں لگتا اس لیے ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھتا ہوں۔

میرے والد صاحب نے ہمیں کہا تھا ''یہ یاد رکھو کہ آپ ڈائریکٹر پیدا نہیں ہوئے۔ آپ نے فیملی بزنس سے سفر شروع کیا ہے اور آپ نے اپنی گفتگو، اپنی شخصیت، خیالات اور تعلیم سے یہاں جگہ بنانی ہے۔''

یہ بزنس میرے نانا نے شروع کیا۔ پھر ان کے بچے اس میں آئے۔ اس کے بعد میرے والد نے اس کو جوائن کیا۔ والد صاحب کا کہنا یہ تھا کہ آپ نے مجھ پر انحصار نہیں کرنا بلکہ اپنی جگہ خود بنانی ہے۔ جب کوئی شخص قابل ہوتا ہے تو سب اسے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھی ہے۔

سوال: آپ کے والد صاحب زندگی کے بارے میں بڑی واضح اور صاف سوچ کے حامل تھے۔ ان کے بارے میں کچھ اور بتایئے۔

شاہد: شیخوپورہ میں ایک جگہ ہے منڈی فیض آباد جو چاولوں کے لیے بڑی مشہور ہے۔ میرے دادا کی وہاں زمین تھی تو ہم بنیادی طور پر زمیندار ٹھہرے۔ میرے والد صاحب کا ذہن تھا کہ تعلیم میں نام پیدا کیا جائے۔ یہ شوق انھیں گورنمنٹ کالج لاہور تک لے آیا۔ یہاں وہ ۷، ۸ سال رہے۔ انھوں نے انگلش میں ایم اے کیا۔ وہ بطور طالب علم بہت نمایاں رہے۔ آج بھی کالج میں جگہ جگہ ان کا رول آف آنرز کے لیے لکھا گیا نام نظر آئے گا۔ گورنمنٹ کالج کی ایک روایت تھی کہ چیف پریفیکٹ کو علامہ اقبال کا کمرا دیا جاتا تھا۔ میرے والد صاحب کو اس کمرے میں رہنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

اس کے بعد والد صاحب سول سروس میں آگئے۔ ان کا اعتزاز احسن والا بیچ تھا۔ انھوں نے سات آٹھ سال سروس کی۔ ۱۹۷۹ء میں استعفا دے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس میں ایمانداری سے چلنا بہت مشکل ہے۔

سوال: آپ کی پڑھائی کہاں کہاں ہوئی اپنے تعلیمی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیں؟

شاہد: میں نے اسلام آباد سے بی کام کیا تھا۔ پڑھائی میں بہت زیادہ اچھا نہیں تھا۔ پھر لندن سکول آف اکنامکس سے انڈسٹریل ریلیشنز میں ماسٹرز کیا۔

سوال: فیملی بزنس کا آغاز کیسے ہوا؟ اتفاقی طور پر یا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باقاعدہ سوچی سمجھی خاندانی رائے تھی جو روایت بنی؟

شاہد: میرے نانا ۷۰ء کی دہائی میں کراچی گئے تھے۔ انھوں نے اپنا سفر اس حالت میں شروع کیا کہ فٹ پاتھ پر سوتے تھے۔ انھوں نے کئی کام شروع کیے۔ ۷۹ء میں وہ شیشے کے بزنس میں آگئے۔ یہ قومی سطح کا ایک منصوبہ تھا جس میں ان کو ایک اچھی ٹیم کی ضرورت تھی۔ انھوں نے میرے والد سے کہا کہ وہ اس بزنس میں ان کے ساتھ آ جائیں۔ اس طرح میرے والد نے اپنی سرکاری ملازمت کو خیر باد کہا اور ان کے ساتھ مل کر کام شروع کیا۔ ۱۹۸۶ء میں یہ ادارہ پروڈکشن میں آگیا۔ اس وقت ہم نے جدید ترین ٹیکنالوجی سے کام شروع کیا۔ یہ قومی سطح پر قائم ہونے والے نمایاں اداروں میں شامل تھا۔ یہ سفر گنج گلاس سے شروع ہوا تھا پھر ہم نے علی گلاس شروع کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم دونوں اداروں میں وسعت بھی لاتے گئے۔ آج ہم شیشہ کی مینوفیکچرنگ تو کر ہی رہے ہیں اس کے ساتھ Value Addition پر بھی توجہ دے رہے ہیں۔

پاکستان میں جتنی بڑی بلڈنگز ہیں ان میں استعمال ہونے والا شیشہ ہمارے ہاں سے پروسس ہو کر جاتا ہے۔ ہمارا پلانٹ حسن ابدال میں ہے، لیکن یہاں پر موجود انڈسٹریز توانائی (انرجی) کے بحران کی وجہ سے بُری طرح متاثر ہوئی ہیں۔ ہمیں بھی انرجی کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بہت سے ادارے تو بند ہی ہو گئے ہیں اس کے باوجود الحمدللہ ہم بہتر منصوبہ بندی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

سوال: غنی گلاس پاکستان میں شیشہ بنانے والا ایک بڑا ادارہ ہے۔ آپ کا ادارہ غنی گروپ سے کتنا مختلف ہے اور اس کی خاص بات کیا ہے؟

شاہد: ہمارے بزنس میں زیادہ تر لوگ فیملی سے ہی ہیں جبکہ غنی گروپ کا بزنس زیادہ تر پروفیشنل لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔

ہم بزنس کو وسعت دیتے وقت بھی فیملی کے لوگوں کو ہی شامل کرتے ہیں۔ ہم بینک سے پیسے لینے کے بجائے فیملی کے وسائل پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ ہم بینکوں سے امداد نہیں لیتے اور قرضوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ چاہے یہ ہمارا گلاس کا بزنس ہو یا پولٹری کا۔

شیشے میں اس وقت غنی گلاس ہمارا حریف ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہمارا آپس میں مقابلہ نہیں۔ ہماری سٹریٹیجی (Strategy) ان سے علٰحدہ ہے۔ ہارورڈ میں بھی ہمیں بتایا گیا کہ براہِ راست ایک دوسرے سے مقابلہ کیا

چین اور یورپ کی مشینری میں سے کس کا انتخاب کیا جائے؟

جائے تو دونوں کا نقصان ہوتا ہے۔ ہم اسی اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ بنیادی گلاس کے اوپر جتنی Value-addition ہوتی ہے، وہ ہم لوگ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم Tableware کا نیا منصوبہ شروع کرنے والے ہیں۔ اس میں پانی پینے والا گلاس اور کچن سیٹ وغیرہ کی چیزیں آتی ہیں۔ ہم بہت بڑے پراجیکٹس میں نہیں جاتے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ فیملی کے سرمائے سے کسی بزنس میں جتنی وسعت آسکتی ہے اتنی ہی لائی جائے۔

سوال: آپ چین کے بجائے یورپ سے کیوں کام کر رہے ہیں؟

شاہد: ۱۵ سال سے لوگ چین کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ہم چین کے ساتھ بہت کم کام کرتے ہیں۔ مین پاور ہو یا مشینری، ہم یورپ سے لیتے ہیں۔ یورپ کی ریسرچ

بہت ایڈوانس ہوتی ہے۔ چینی مال میں اگر تھوڑا سا بھی نقص ہو تو وہ کہتے ہیں خیر ہے لیکن یورپین اس طرح نہیں سوچتے۔ ان کی مشینری بھی بہت قابلِ اعتبار ہوتی ہے۔ ہم زیادہ تر اٹلی، جرمنی اور یوکے کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

سوال: گلاس کی صنعت باقی کاموں سے کس قدر مختلف ہے؟

شاہد: شیشے کی تیاری میں سارا خام مال ایک فرنس میں پگھلایا جاتا ہے۔ اس کا ٹمپریچر ۱۶۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ خام مال کا لاوا فرنس کے بلاکس کے اندر شہد کی صورت بہہ رہا ہوتا ہے۔

۱۶۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ پر لاوے کی طرح پگھلا ہوا خام مال فرنس کے بلاکس میں شہد کی طرح بہہ رہا ہوتا ہے

گلاس بنانے کا معاملہ ایسا ہے کہ آپ کو ہر صورت گلاس بنانے کا عمل جاری رکھنا ہے۔ زلزلہ آجائے، سیلاب آجائے یا مال نہ بک رہا ہو، آپ کسی بھی صورت میں شیشہ بنانے کا پروسیس روک نہیں سکتے۔ یہ فرنس کئی ملین ڈالر کی ہوتی ہے۔ جب آپ اس میں ایک مرتبہ آگ جلا دیتے ہیں تو اسے بند نہیں کر سکتے۔ بند کرنے کی صورت میں وہ برباد ہو جائے گی۔ جس طرح انسانی دل کا مسلسل کام کرتے رہنا ضروری ہے، اُسی طرح فرنس کا چلتے رہنا ضروری ہے۔

اس لیے ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے جب گاڑیوں کو سی این جی دی جاتی ہے اور صنعت کو گیس سے محروم رکھ کر تباہ کیا جاتا ہے۔ قومی سطح کے ادارے دراصل مالکان کی ملکیت نہیں ہوتے بلکہ یہ قوم کے لوگوں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان اداروں کے چلنے سے سب کا فائدہ ہوتا ہے۔

سوال: عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دوسری یا تیسری جنریشن میں آکر بزنس ختم ہو جاتے ہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

شاہد: ہمارے معاشرے میں لوگ بزنس اکیلے اکیلے کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میرے خیال میں مل کر کام کرنے میں ترقی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ہم اپنی علٰحدہ دکان بنا لیں گے لیکن یہ نہیں کریں گے کہ کسی کے ساتھ مل کر پلازے میں کوئی فلور لے لیں۔ ہمارے ہاں جب مل کر بزنس کیا بھی جاتا ہے تو بعض اوقات گھریلو اختلافات ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

بھارت میں ریلائنس کمپنی کو دیکھ لیں۔ بھائیوں کے ہاتھوں میں کام آیا تو کام علٰحدہ علٰحدہ کرنا پڑا۔ سام سنگ کمپنی کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ اس کے مالک نے وصیت نہیں چھوڑی تھی۔ اب وہاں اختلافات ابھر آئے ہیں۔

مغرب میں ہر بندے نے اپنا جینا اور اپنا مرنا ہے۔ وہاں ہر بندے نے ۱۶، ۱۷ سال کے بعد معاشی طور پر خود کفیل ہونا ہے۔

امریکا میں ہمارے ایک عزیز ورکشاپ میں گئے تو وہاں ایک لڑکا بھی کام کر رہا تھا۔ جب میرے عزیز نے مالک سے پوچھا کہ اس کو آپ کیا تنخواہ دیتے ہیں؟ تو اس نے کہا، یہ میرا بیٹا ہے میں اس کو تنخواہ کے ساتھ ساتھ دوپہر کا کھانا بھی دیتا ہوں۔

چین میں والدین کے لیے ایک بچہ رکھنے کی پالیسی ہے۔ اس سے رشتے ناطے ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک بچہ ہوتا ہے نہ اس کی کوئی خالہ ہوگی نہ پھوپھو نہ تایا نہ ماموں۔ ایک وقت آئے گا کہ خاندان بوڑھوں سے بھر جائیں گے۔ جوان بچہ ہی کوئی نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں مضبوط فیملی سسٹم ہوتا ہے، اس کے بے شمار فائدے ہیں لیکن فیملی بزنس میں بھی کچھ اُصول سامنے رکھنے چاہئیں۔

ہمارے ہاں ایک سسٹم بنا ہوا ہے۔ میں اپنی کمپنی سے تنخواہ لیتا ہوں۔ ہمارے آڈیٹر ہمارے پٹرول کا بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حساب مانگتے ہیں۔ میں اگر کیشیئر سے کہوں مجھے ۱۰ر ہزار دے دو تو وہ مجھے نہیں دے گا۔ وہی ملے گا جس کا میں استحقاق رکھتا ہوں۔

دوسری چیز ہم یہ کرتے ہیں کہ ہم چاہے جتنے مرضی دباؤ میں ہی کیوں نہ ہوں، ہم اپنے کاروبار کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آنے والا بچہ اپنا علیحدہ کام سنبھال سکے۔ ان کے آنے سے پہلے ان کی جگہ اور کام سوچا جا چکا ہوتا ہے۔

سوال: شیشہ بناتے بناتے مرغیوں کی فیڈ کے بزنس میں کیسے آئے؟

شاہد: وطن واپسی پر مجھے پولٹری فیڈ کے بزنس میں کام کرنے کا موقع ملا۔ پھر ہم نے ایک اور کمپنی خوشحال فیڈ اینڈ فارمز کے نام سے بنائی۔ اس وقت میں نے مشورہ دیا کہ ہمیں Integration کی طرف جانا چاہیے اور فیڈ کے ساتھ ساتھ فارمنگ کا بھی آغاز کرنا چاہیے۔ اس وقت مجھے کہا گیا تم ابھی نئے آئے ہو اس لیے خاموش رہو مگر کچھ برس بعد ہم نے فارمنگ بھی شروع کر دی۔ یہ تجربہ بہت عمدہ رہا۔ ہم نے کوئی ۵۰ر ہزار برڈز سے آغاز کیا۔

دراصل فیڈ کا بزنس میرے نانا نے کراچی میں شروع کیا تھا۔ انھوں نے سندھ فیڈ کے نام سے کمپنی بنائی۔ فیڈ میں ہمارے خاندان کے ۴ر ادارے ہیں۔ یوں سمجھیں ہم اس بزنس میں نئے نہیں ہیں۔

سوال: ہمارے ہاں مرغی کی خوراک کی کوالٹی اور کھانے والوں پر اس کے بُرے اثرات کے بارے میں خدشات پائے جاتے ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ بتائیے۔

پولٹری فیڈ میں شامل وٹامنز وہی کمپنیاں بناتی ہیں جو ہم انسانوں کے لیے دوائیاں بنا رہی ہیں

شاہد: مرغی کے گوشت کا موازنہ دوسرے گوشت کے ساتھ کیا جائے تو آپ کے علم میں یہ بات آئے گی کہ یہ صنعت زیادہ ترقی یافتہ اور اس کا گوشت زیادہ محفوظ ہے۔

پولٹری فارمز میں متوازن خوراک کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی خوراک میں جو وٹامنز وغیرہ ڈالتے ہیں وہ اچھی کمپنیوں کے ہوتے ہیں۔ یہ وہی کمپنیاں ہوتی ہیں جو ہم انسانوں کے لیے دوائیاں بنا رہی ہوتی ہیں۔

دنیا بھر میں Frozen گوشت کے بجائے Chilled گوشت کے استعمال کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ پچھلے ۱۰ر یا ۱۵ر برس میں کھانے کی تمام اشیا کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے جبکہ مرغی کے گوشت کی قیمت لوگوں کی قوتِ خرید میں ہی رہی ہے۔ آپ چاول کو دیکھ لیں جو ریٹ ایک مرتبہ بڑھے وہ واپس نہیں آئے۔ لیکن مرغی کا ریٹ کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔

سوال: مرغیوں کو جو پولٹری Waste کھانے کے لیے دیا جاتا ہے تو اس کے بارے میں لوگ خوفزدہ ہیں؟

شاہد: پولٹری Waste کو Reprocess کیا جاتا ہے۔ اس کے اپنے پلانٹس ہوتے ہیں۔ یہ کام امریکا اور جرمنی جیسے ممالک میں بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ ری پراسیس نہ ہو تو سوچیں لاکھوں ٹن ویسٹ کہاں جائے گا۔ شکر کریں کام آجاتا ہے۔ ویسٹ کے استعمال کے حوالے سے پیدا ہونے والے خدشات بے بنیاد ہیں۔

سوال: مرغی کے گوشت سے صحت پر نقصانات کے حوالے سے بھی اعتراضات سامنے آئے ہیں جیسا کہ اپریل ۲۰۰۸ء میں اینوائرمینٹل ہیلتھ پراسپیکٹو جرنل میں ایک تحقیق شائع ہوئی جس سے یہ بات سامنے آئی کہ فارمز میں مرغیوں کو ایسے کمپاؤنڈز بھی دیے جا رہے ہیں جو انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ مزید برآں مرغیوں کو پروسیسنگ کے دوران سالٹ کا انجکشن بھی لگایا جاتا ہے، جس سے گوشت میں سوڈیم کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے، اس سے حساس افراد میں صحت کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

شاہد: ان میں سے زیادہ تر اعتراضات غیر مصدقہ ہیں مثلاً میں سبزیوں کی مثال دیتا ہوں۔ پالک پر جو سپرے کیا جاتا ہے، اگر آپ کے ہاتھ پر لگ جائے تو ہاتھ جل جائے۔ اصل مسئلہ اس وقت ہوتا ہے جب احتیاط نہ برتی جائے۔ سبزیوں پر جب سپرے کیا جاتا ہے تو اس میں یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ اسے ایک خاص عرصے سے پہلے منڈی میں نہ لایا جائے۔ پولٹری کی میڈیسن کے بارے میں بھی ایسی ہی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال: لوگ اکثر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ مرغیاں کچھ دنوں میں بڑی ہو جاتی ہیں۔ کھانے والی لڑکیاں بھی اسی لیے موٹی ہو جاتی ہیں۔

شاہد: جب بھی آپ مرغی کو مکمل غذا اور اچھا ماحول دیں گے تو اس کی نشوونما لامحالہ تیزی سے ہوگی۔ یہ بات کہ مرغیوں کو جینیاتی طور پر Modified کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ جلد بڑی ہوں، بالکل غلط ہے۔

سوال: آئے دن فارمز میں بیماریاں وسیع پیمانے پر نقصان پہنچاتی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

شاہد: اس کی وجہ یہ ہے کہ احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا۔ جیسے ایک سے دوسرے فارم کے درمیان مناسب فاصلہ رکھا جانا چاہیے۔ ماحول کو بہت صاف رکھا جانا چاہیے۔ بروقت صفائی اور ادویات کا استعمال ضروری ہے۔ ان میں کمی ہوگی تو نقصان ہوگا۔

سوال: پولٹری کی صنعت میں نئے آنے والوں کے لیے ترقی کے کتنے امکانات اور کس قدر خدشات ہیں؟

شاہد: پولٹری کی صنعت دنیا کی بڑی اور تیزی سے ترقی کرنے والی زرعی صنعتوں میں شامل ہے۔ اس میں نوجوانوں کے لیے ترقی کے بے شمار امکانات موجود ہیں۔ اس کے لیے نوجوانوں کو غیر روایتی انداز سے سوچنا ہوگا۔ حکومت کو بھی انٹرپرنیورشپ (Entrepreneurship) کو فروغ دینا چاہیے اور نوجوانوں کو نئے شعبوں کی طرف لانا چاہیے۔ اس صنعت میں نوجوانوں کو بے شمار چیلنجز کا سامنا ہوگا۔ پہلی بات تو یہ

۲۵ر لاکھ کے سرمایہ سے کون سا کامیاب کاروبار شروع کیا جا سکتا ہے؟

ہے کہ یہ صنعت محنت طلب ہے۔ پولٹری کا پرندہ بڑا نازک اور لاکھوں کے حساب سے ہوتا ہے۔ اگر اس کی مناسب دیکھ بھال نہ کی جائے تو بے پناہ نقصان ہوتا ہے۔ یہ بزنس ذاتی توجہ مانگتا ہے۔ مرغیوں کو صبح سویرے ۴ر بجے خوراک دینی ہے تو آپ کو اس کا انتظام کرنا پڑے گا لیکن اس کام میں ترقی کے امکانات بہت روشن ہیں۔ پولٹری اور فیڈ کے بزنس کے چند بڑے مالکان کے حوالے سے یہ بتانا چاہوں گا کہ انھوں نے اپنا سفر بہت چھوٹے پیمانے پر شروع کیا۔ یہاں تک کہ معمولی کمرے میں چار چار لوگ رہتے اور پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر کرتے تھے۔ اس بزنس کی خوبی یہ ہے کہ آپ اسے ۲۵ر لاکھ سے شروع کر سکتے ہیں اور ۲ر ارب سے بھی۔ بہتر یہ ہے دو یا تین لوگ مل کر شروع کریں۔ کرائے کے شیڈ سے بھی آغاز کیا جا سکتا ہے۔ اس میں رسک کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے جیسے کوئی بیماری آسکتی ہے۔ یہ Live Bird کا معاملہ ہے اس لیے منڈی کے اتار چڑھاؤ زیادہ ہوتے ہیں۔ جب دو یا تین لوگ مل کر شروع کرتے ہیں تو رسک کم ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک پارٹنر نے ۵۰۰۰ر چوزہ ڈالا ہے جو یکم مارچ کو تیار ہو رہا ہوگا اور ہو سکتا ہے دوسرے نے ایک مختلف جگہ پر ۱۰۰۰۰ر چوزہ ڈالا ہو جو ۲۰ر مارچ کو تیار ہونا ہو۔ اس طرح اس میں رسک کم ہو جاتا ہے۔ اس بزنس میں فائدے اور نقصانات بھی جلد سامنے آجاتے ہیں۔ پولٹری پاکستان کی ٹیکسٹائل کے بعد دوسری بڑی صنعت ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاکستان میں اس صنعت نے بہت ترقی کی ہے اور یہ اس وقت عالمی معیار کے مطابق ہے۔ ہمارے ہاں پولٹری فارمز ایسے ہی ہیں جیسے جرمنی یا امریکا میں ہیں۔

یہ اتنی بڑی صنعت ہے اس میں کسی کی مناپلی نہیں ہے۔ K & N پولٹری کے حوالے سے کافی معروف ہے لیکن یہ پولٹری بزنس میں شاید ۲۰ ویں نمبر پر ہو، اس میں ایگ برڈ (Egg Bird) جیسے بڑے بڑے کئی ادارے ہیں۔

ہمارے ہاں اگر فارم مالکان علمی اور تحقیقی اداروں سے رابطے میں رہیں، یہ ادارے اُن مالکان کے لیے ٹریننگ پروگرامز ترتیب دیں، تو اس سے پولٹری فارمنگ میں کافی بہتری آسکتی ہے۔ پولٹری کے حوالے سے جو نئی

والد صاحب کا خیال تھا

سول سروس میں ایمان داری سے چلنا بہت مشکل ہے

تحقیق سامنے آتی رہتی ہے اس سے آگاہی بھی بہت ضروری ہے۔ ہماری زراعت کو بھی پولٹری صنعت نے سنبھالا ہوا ہے۔ زراعت میں پیدا ہونے والی فصلیں فیڈ ملز میں استعمال ہوتی ہیں۔

سوال: ملک کے سیاسی اور معاشی مستقبل کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ ہماری بزنس کمیونٹی کو پاکستان میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کرنا ہوگی۔ حالات میں بہتری اس وقت آئے گی جب ہم سیاسی عمل کا حصہ بنیں گے۔ سب لوگوں کو ووٹ کا حق استعمال کرنا چاہیے۔ چاہے جس کو مرضی ووٹ ڈالیں۔

سوال: بھارت سے تجارت کھلنی چاہیے یا نہیں؟

شاہد: بھارت سے تجارت کھلنے پر ہمیں کوئی بنیادی اختلاف نہیں، مگر حکومت ہمیں بھارت جیسی سہولتیں تو دے۔ ہمارے پاس گیس نہیں اس صورت میں ہم بھارت کے مال کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر بھارت سے تجارت کھول دی جائے تو یہ کسی صورت مناسب فیصلہ نہیں ہوگا۔

سوال: آل ورلڈنیٹ ورک میں شامل ہونے کا تجربہ کیسا رہا؟

شاہد: آل ورلڈنیٹ ورک نے پاکستان کی تیزی سے ترقی کرنے والی ۱۰۰ انٹر پرنیورز کمپنیوں کی پاکستان ۱۰۰ کے نام سے درجہ بندی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان ۱۰۰ کے بزنس لیڈرز اس ملک کے بہترین سفیر ہیں۔ اس سے پاکستان کو عالمی سطح پر نئی پہچان ملی ہے۔ ان کمپنیوں کی ترقی یہ ثابت کرتی ہے کہ پاکستان میں مسائل کے باوجود سرمایہ کاری اور کاروبار کے شاندار مواقع موجود ہیں۔ ان کمپنیوں نے بے شمار نئی ملازمتیں پیدا کیں۔ ہم نے آل ورلڈنیٹ ورک میں شامل ہونے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ اس سے ہمیں نئی پہچان ملے گی۔ میں نے کئی لوگوں کو اس نیٹ ورک میں آنے کے لیے قائل بھی کیا۔

سوال: اس پلیٹ فارم سے حال ہی میں آپ نے ہارورڈ یونیورسٹی کا وزٹ بھی کیا۔ اس سے کیا سیکھا؟

شاہد: وہاں کے لیکچرز سے کافی کچھ سیکھنے کو ملا۔ وہ ہمارے بارے میں بہت اچھی معلومات رکھتے ہیں۔ بعض اوقات تو حیرت ہوتی تھی کہ وہ ہماری صنعتوں کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

ملاقات ختم ہوئی تو وہ کہہ رہے تھے کہ پولٹری کا بزنس بے شک ذاتی توجہ مانگتا ہے مگر اس میں ترقی کے امکانات بہت روشن ہیں۔

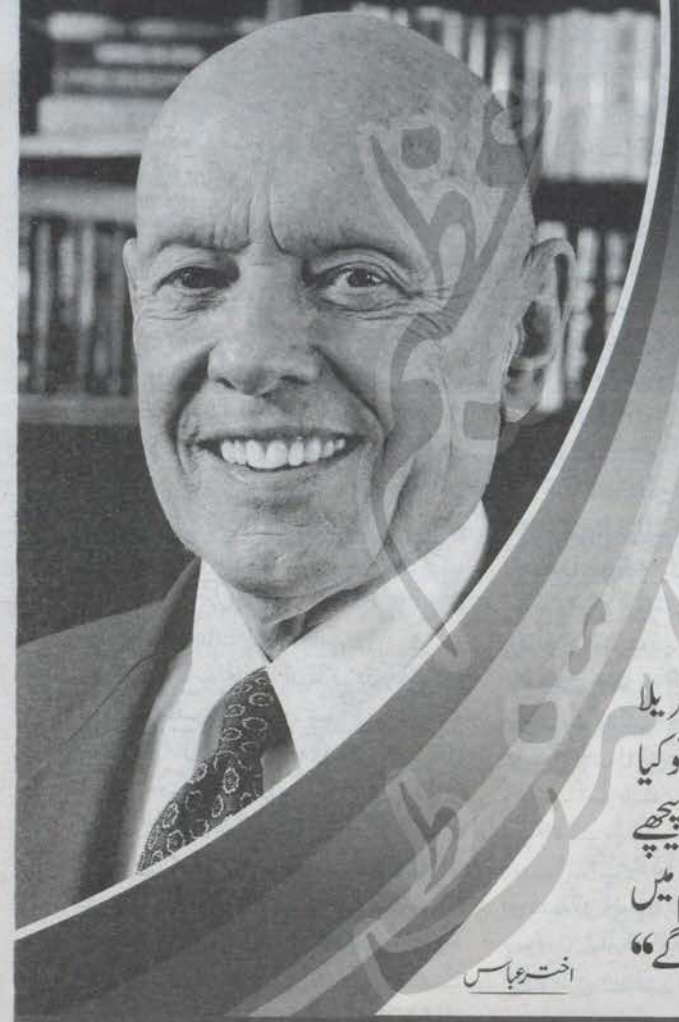

کووے کی باتیں پاکستانی نوجوانوں اور تجارتی اداروں کے منیجرز اور سربراہوں کی سوچ کو ایک نیا زاویہ دے سکتی ہیں

سٹیفن کووے کی منفرد کتابیں، اور کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرنے والی باتیں اُسے پڑھنے والوں کے دلوں میں زندہ رکھیں گی

"اگر آپ کو کوئی زہریلا سانپ کاٹ لے تو کیا غصے میں اُس کے پیچھے بھاگیں گے یا جسم میں پھیلتے زہر کو روکیں گے"

اختر عباس

رفتار سے زیادہ سمت کا درست ہونا ضروری ہے

ایک کروڑ سے زائد بکنے والی کامیاب لوگوں کی ۷ عادتوں والی باکمال کتاب لکھنے والے مصنف، ٹرینر سٹیفن آر کووے کا تذکرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُن

دنوں سٹیفن کووے اور سانڈرا کووے اپنے بچوں کے ساتھ امریکا کی ریاست یوٹاہ کے شہر پرووو میں تھے جب پہلی بار میں نے اس کا نام سنا، یہ ۲۰۰۰ء کے ابتدائی دن تھے، میں روزنامہ نوائے وقت کے رسالے پھول سے وابستہ تھا اور ہم نے ہر ماہ ایک لیڈر شپ ٹریننگ کورس کا آغاز کیا تھا۔ اس کورس کے شرکاء میں سے فیصل آباد کی زرعی یونیورسٹی سے آنے والی مہمان سمیعہ عارف نے شرارت سے یا سنجیدگی سے پوچھا ''بھیا! آپ کو انگریزی کا کون سا مصنف پسند ہے؟'' میرے پاس ٹالنے کے علاوہ کوئی جواب نہ تھا۔ اسی شام میں شادمان میں ارشد جاوید صاحب کے پاس پہنچا، ان کے پاس انگریزی کی بڑی عمدہ کتابوں کا انتخاب تھا۔ میں نے جاتے ہی پوچھا کسی مشہور انگریزی کتاب کا نام بتائیے جسے میں پسند بھی کرلوں۔ بولے ''سیون ہیبٹس آف ہائیلی افیکٹو پیپل (Seven Habits of Highly Effective People)''۔

میں نے کتاب اٹھائی۔ اچھی خاصی موٹی کتاب تھی۔ سرِورق پر صاف ماتھے اور دور تک چمکتی چندیا والے مصنف کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی، بلیک اینڈ وائٹ۔ یہی سٹیفن آر کووے تھے جن کی یہ کتاب ۲۰ رویں صدی کی ۲ راہم ترین کتابوں میں سے ایک گنی جاتی تھی۔ ۳۲ رسے زائد زبانوں میں ترجمہ کا پڑھ کر میں نے بڑی بے تابی سے پوچھا ''اُردو میں دستیاب ہے؟'' جواب ملا، ابھی مشکل ہے، ہو جائے گا۔ جب سورج کچھ زیادہ ہی چڑھ جائے تو ہمارے ہاں اطلاع تب پہنچتی ہے۔ میرے لیے یہ بات بہت حیرت کی تھی اور بے شک یقین کرنے کو دل فوری طور پر آمادہ بھی نہیں تھا کہ اس کتاب کی ۷۵ رملکوں میں ایک کروڑ بیس لاکھ کاپیاں فروخت بھی ہو چکی ہیں۔ بہرحال ان ایک کروڑ ۲۰ ر لاکھ خریداروں میں تب تک میں شامل نہیں تھا۔ وہاں سے روانہ ہوا تو دل نے کہا آج خالی ہاتھ مت جاؤ۔ یوں اُس رات پہلی بار کووے میرے ساتھ گھر پہنچا۔

کووے کو پڑھنے سے پہلے اس کے بارے میں پڑھا اور حیران ہوا موصوف ایم بی اے تھے اور وہ بھی امریکا کی مشہور و معروف یونیورسٹی ہارورڈ سے۔ پھر انھوں نے برمنگھم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ ۳۰ ر برس میں ہزاروں نہیں لاکھوں افراد جن میں نہ صرف تجارتی اداروں کے سربراہان، مینیجرز، سیاسی، سماجی راہنما، بلکہ بڑی بڑی کمپنیاں شامل تھیں جنھوں نے اپنی پوری پوری ٹیمیں ان کے حوالے کرکے بہترین نتائج پائے، ان سے فیض یاب ہو چکے تھے۔ کووے کی وجۂ شہرت صرف کتاب نہیں ان کی وہ تربیت بھی بنی جو وہ اپنی ۷ ر عادتوں کی تھیوری کو بنیاد بنا کر دیتے تھے۔

''رفتار سے زیادہ سمت کا درست ہونا ضروری ہے۔'' ۱۹۳۲ء میں سالٹ لیک سٹی میں پیدا ہونے والے سٹیفن کووے کی سوچ کا مرکزی نقطہ یہی ہے۔ اسے اپنی ماں بے حد عزیز تھی جو خاندان کے ۸۷ ر سے زائد افراد کی بڑی توجہ اور محبّت سے دیکھ بھال کرتی تھی۔ اسے اپنی بیوی سانڈرا سے بہت پیار تھا کہ جس نے اس کے اپنے خاندان کے کم و بیش ۵۳ ر سے زائد پوتے، پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی تربیت اور ان سے محبّت میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ آنے والے برسوں میں ''۷ ر عادتیں'' اس کا ایک لحاظ سے ٹریڈ مارک بن گیا۔ پہلے آڈیو پروگرام، پھر کووے لیڈر شپ سینٹر اور آخر میں کووے فرینکلن کمپنی جو ان ۷ ر عادتوں کی دنیا بھر میں تربیت دیتی، بہت سی جگہوں پر وہ خود جاتے اور کبھی کبھی امریکا ہی سے ہزاروں میل دُور بیٹھے حاضرین سے خطاب کرتے۔

آٹھویں عادت مقبولیت سے محروم رہی

۱۶ ر جولائی ۲۰۱۲ء کو ۷۹ ر سال کی عمر میں وفات پانے والے سٹیفن دنیا میں نہ صرف پڑھنے لکھنے والوں بلکہ کاروباری اداروں کے مینیجرز اور مالکان کے بھی گرو (Guru) کہلائے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ۷ ر عادتوں پر کام کرتے کرتے ۲۰۰۴ء میں انھوں نے آٹھویں عادت بھی دریافت کرلی۔ کتاب کا نام تھا'' The 8th habit from effectiveness to greatness''تب تک 7th Habits کی ۱۵ ر ملین کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ آٹھویں عادت زیادہ مقبولیت سے محروم رہی۔ ایک اور کتاب جس نے مقبولیت کے جھنڈے گاڑے وہ ہے ''Principle Centered Leadership''۔ اعلیٰ درجے کے بزنس مینیجرز اور لیڈرز کے لیے یہ ایک طرح کی ہینڈ بک ثابت ہوئی۔ ۲۰۰۹ء میں نئی کتاب ''Leader in me'' لکھی۔ یہ بچوں کے لیے تھی اور خوب تھی۔

۷ ر یونیورسٹیوں سے اعزازی ڈگریوں کا اعزاز

ڈاکٹر کووے جنھیں امریکا کی ۷ ر یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریوں سے نوازا اور دوسرے بے شمار ایوارڈز ملے، ایک موقع پر کہنے لگے ''۹ ر بچوں کے باپ اور ۴۴ ر بچوں کے دادا نانا ہونے اور ان کی عمدہ تربیت کرنے پر ۲۰۰۳ء میں نیشنل فادر ہڈ انیشی ایٹو (National Fatherhood Initiative) نے جو فادر ہڈ ایوارڈ دیا وہ مجھے ملنے والے تمام ایوارڈز سے زیادہ بڑا اثاثہ ہے۔''

کووے کی تربیت کا ذاتی مشاہدہ

۲۰۰۳ء میں مَیں دی یونیورسٹی آف لاہور میں شعبہ ایچ آر ڈی (ہیومین ریسورس ڈویلپمنٹ) کے سربراہ کے طور پر خدمات انجام دینا شروع کر چکا تھا اور پرسنل گروتھ اینڈ ڈویلپمنٹ کے نام سے ایک نیا سبجیکٹ تیار کرکے پڑھا رہا تھا میرے پہلے ۱۲۰ ر طلبہ و طالبات کو زندگی کا نیا وژن اور نئی ویلیوز کے ساتھ ساتھ کچھ عملاً کر دکھانے کا جذبہ مل رہا تھا۔ اپنی غلطیوں، کمزوریوں کو پہچاننے کا موقع مل رہا تھا۔ ۲ ر ایسے واقعات ہوئے جنھوں نے مجھے کووے سے اور بھی قریب کر دیا۔ ایک روز ایک یمنی طالب علم نے ۲ ر ہفتے کی چھٹی لی اور واپس چلا گیا۔ وہ کچھ بتانا چاہ رہا تھا مگر بتا نہیں پا رہا تھا۔ پریشان بھی تھا اور مسکرا بھی رہا تھا۔

اس کلاس میں پہلی بار میں نے سلیبس سے ہٹ کر طلبہ کو کتابیں پڑھنے، ان پر تبصرہ کرنے اور انھیں چیلنج کرنے کا ٹاسک دیا۔ یعنی مصنّف نے جو بھی نتائج نکالے ہوں، آپ خود سوچیں اور اس سے اختلاف کے لیے اپنے دلائل دیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کالم نگار یا مصنّف جو چاہے لکھ دے اور ہم کسی روبوٹ کی طرح سر ہلا کر کہہ دیں۔ ''واہ کیا بات لکھی یا کہی ہے۔'' اسی لیے اپنی سوچ اور رائے پیدا نہیں ہوتی۔ کووے کی کتاب ''Principle centered leadership'' پر خوب بحثیں ہوئیں۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ یمنی طالب علم واپس آگیا۔ وہ آفس آکر مجھے ملا اور ایک نئی ہی کہانی سنا دی۔ وہ یمن نہیں ریاض گیا تھا۔ جہاں ۱۴ ر لوگوں کے ایک گروپ نے دنیا کے مشہور و معروف ٹرینر کووے سے بنفسِ نفیس ہفتہ بھر کی ٹریننگ لی تھی اور موضوع تھا ''سیون ہیبٹس''۔

یمنی طالب علم کا سرپرائز

میرے لیے یہ خبر تو اہم تھی ہی تفصیلات اور بھی حیران کن تھیں۔ شرکاء میں سعودی حکومت کے کچھ وزرا بھی شامل تھے اور اعلیٰ سطح کے تجارتی اداروں کے سربراہ۔ یمنی طالب علم کے بارے میں پتا چلا کہ اس کے والد کا سعودی عرب اور یمن میں بہت وسیع کاروبار ہے جسے اسی نے جا کر سنبھالنا ہے، اسی لیے جونہی اسے پتا چلا کہ کووے

کووے کو امریکا کی ۷ ر یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حضرت یوسفؑ کا پرواایکٹو ہونا

کووے کو انجیل (عہدنامہ عتیق) کی ایک کہانی بہت پسند ہے۔ یہ حضرت یوسفؑ کی کہانی ہے جنھیں ان کے بھائیوں کے باعث کم عمری میں مصر میں ایک غلام کے طور پر بکنا پڑا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ اس ظلم اور زیادتی پر اپنے اوپر ترس کھاتے رہتے اور فرعون کی غلامی میں پڑے رہتے اور ان تمام آسائشوں کا ماتم کرتے رہتے جن سے ان کو محروم کر دیا گیا تھا لیکن وہ Proactive آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی خودمختاری پر کام کیا اور تھوڑی سی مدت بعد وہ فرعون (یا عزیزِ مصر) کے گھر کا سارا نظام چلا رہے تھے۔ فرعون کا سب کچھ ان کی دسترس میں تھا۔ انھوں نے اپنے کام سے اعتماد کا ایک اعلیٰ مقام اور فضا تیار کر لی تھی۔ وہ مشکل گھڑی آگئی جس کے نتیجے میں انھیں ۱۳رسال کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہاں بھی وہ پرواایکٹو رہے اور کچھ عرصے بعد جیل کا پورا نظام ان کے ہاتھ میں تھا اور بالآخر مصر کی ساری قوم فرعون کے بعد ان کی حکمرانی میں تھی۔ اپنے حالات پر بھرپور انداز سے اثرانداز ہوئے بغیر اپنے حالات بہتر بنائے ہی نہیں جا سکتے اور دنیا کے مؤثر ترین لوگ یہی کرتے ہیں۔ اپنے اندر اور باہر کا موسم ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ جو کنٹرول میں نہیں ہے اس کو مان لیتے ہیں اور اپنی کوششوں کو انھیں کنٹرول کرنے پر مرکوز کر دیتے ہیں۔

آرہا ہے تو لاکھوں روپے فیس ادا کر کے وہ اس ٹریننگ کا حصہ بنا۔ اس نے جو کچھ سیکھا تھا اس کی وجہ سے اب وہ بہت پُرجوش تھا۔ اگلے ہی روز میں نے اسے کلاس میں اس ٹریننگ کے حوالے سے اپنے احساسات بتانے کو کہا، بڑی ٹریننگ کا ویسے بھی یہ حصہ ہوتا ہے کہ شرکا واپسی پر اپنے اپنے اداروں میں ضرور پریزنٹیشن (Presentation) دیں کہ کیا سیکھ کر آئے ہیں۔ مجھے زیادہ دلچسپی یہ تھی کہ اس قدر مہنگی ٹریننگ میں آخر وہ ایسا کیا سیکھ کر آیا ہے کہ جو کتاب پڑھ کر نہیں سمجھا جا سکا ہوگا؟

کووے کی عمدہ مثال

اس نے دلچسپ بات بتائی اور کہا سر ایک مثال دیتا ہوں، اسی سے سمجھیں میرے پیسے پورے ہوگئے۔ میں کچھ Impulsive نیچر کا ہوں۔ فوری طور پر اشتعال میں آجاتا ہوں۔ ردِعمل بہت فوری اور شدید ہوتا ہے۔ ایک روز سٹیفن نے مجھے سٹیج پر بلا کر پانی کی ایک بوتل دی اور کہا اسے خوب ہلاؤ پھر اس کا ڈھکن کھول دیا۔ وہاں کچھ بھی ردِعمل نہیں تھا پھر انھوں نے پیپسی کی بوتل دی۔ اسے خوب ہلایا پھر بولے کھولو، ڈھکن کھولا تو مشروب جھاگ بناتا دور جا گرا۔ ایک دو طلبہ نے بڑی مشکل سے اچھل کر اپنے آپ کو بچایا۔ پھر انھوں نے دونوں بوتلوں میں موجود پانی کی مقدار کی طرف اشارہ کیا۔ پانی پورا تھا پیپسی کافی ضائع ہو چکی تھی۔ بولے انسانوں کے مزاج کا بھی یہی معاملہ ہے۔ یہ آپ کے بس میں ہے کہ آپ کون سی بوتل کی طرح زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتے ہو۔ بار بار اچھلنے، ضائع ہونے کا یا پانی کی طرح جتنا بھی ہلاؤ، ہلے گا مگر اختتام پر اپنی مقدار اور قوت ضائع نہیں کرے گا۔ طلبہ کو بات سمجھ آگئی، خوب تالیاں بجیں۔ کووے نے جن ۷رعادتوں کو کامیاب اور مؤثر لوگوں کی خوبی بتایا ہے وہ بھی خوب

ہیں۔ مختلف سے نام ہیں اور مختلف سی تشریح۔ ممکن ہے کچھ باتیں کامن سینس کی لگیں مگر اس نے ان عادتوں کو ایک لحاظ سے بنیادی معیار (Standard) ہی بنا ڈالا اور مزے کی بات یہ ہوئی کہ دنیا بھر کے کارپوریٹ لیڈرز اور مینیجرز نے ان کو مان بھی لیا اور اس کتاب کا حوالہ دینے والے کو کوئی حوالہ دے کر ''پڑھا لکھا'' سمجھا جاتا ہے۔

۷رعادتوں میں سے پہلی عادت

۷رعادتوں میں سے پہلی عادت ہے پرواایکٹو بنیے۔ کووے کا کہنا یہ ہے کہ زندگی میں پہلی چیزیں شروع کرنے والے بنیے ناکہ چیزوں اور باتوں پر صرف ردِعمل کرنے والے۔ مثلاً غلطی سے نپٹنے کا پرواایکٹو طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے مانا جائے، پھر اسے درست کیا جائے۔ پھر اس سے سیکھا جائے۔ اس طرح غلطی کامیابی میں بدل جاتی ہے۔ آئی بی ایم کے بانی جے واٹسن کا ایک دلچسپ قول ہے:

غلطی کو چھپانا دوسری غلطی ہے

''ناکامی کے سب سے دُور والے کنارے کے بعد ''کامیابی'' ہوتی ہے۔'' کووے کا کہنا تھا غلطی کو چھپا لینا دوسری غلطی ہے جبکہ یہ پہلی غلطی کو مزید مضبوط بنا دیتی ہے اور انسان پر مجموعی اثر زیادہ بُرا پڑتا ہے۔''

غلطی پر ردِعمل اگلے لمحے کی کوالٹی

غلطی پر ہمارا ردِعمل ہی اگلے لمحے کی کوالٹی کا تعین کرتا ہے۔ ''ہماری یا دوسروں کی غلطیاں ہمیں سب سے زیادہ تکلیف نہیں پہنچاتیں بلکہ ان غلطیوں پر ہمارا ردِعمل اس تکلیف کا باعث بنتا ہے۔''

اس بات کو واضح کرنے کے لیے اس نے ایک حیران کن مگر سادہ سی مثال دی کہ اگر آپ کو کوئی زہریلا سانپ کاٹ لے تو کیا آپ کو غصے میں اس کا پیچھا کرنا چاہیے یا فوری طور پر اس کے کاٹے کے علاج کا بندوبست کرنا ضروری ہے تاکہ جسم میں تیزی سے پھیلتے زہر کو روکا جا سکے۔

پرواایکٹو رویہ ہے کیا؟

بے شک بہت عرصہ تک پرواایکٹو کا اردو میں کوئی موزوں اور متبادل مجھے میسر نہیں آسکا مگر جس بات نے اس کا فہم آسان کر دیا اور اس لفظ کو بھی عام کر دیا، وہ صرف اتنی سی تھی کہ ہمارے رویے مستقل اصولوں کے ساتھ بندھے ہوئے چلتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ اپنے کاروبار میں بے ایمانی کا فیصلہ کرتے ہیں تو آپ اس میں آزاد ہیں۔ معاشرتی نتائج تو تب ہی سامنے آئیں گے جب آپ پکڑے جائیں گے لیکن اس کے قدرتی نتائج اور ہمارے کردار پر لازمی اثرات طے شدہ ہیں۔ اس نے بڑی خوب صورت بات کہی ''جب ہم کسی چھڑی کا ایک سرا اٹھاتے ہیں تو ساتھ ہی دوسرا سرا بھی اُٹھاتے ہیں۔'' بلاشبہ جب زندگی میں کئی بار ایسا ہوتا ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے غلط چھڑی اٹھائی تھی۔ اب اس کے نتائج تو لازمی بھگتنے پڑیں گے جو ہمیں پسند نہیں ہوں گے اور اگر ہمیں دوبارہ موقع ملے تو یقیناً ہم پہلے جیسا چناؤ نہیں کریں گے۔ یہی پرواایکٹو رویہ ہوگا۔ ایسے چناؤ کو غلط کہتے ہوئے لوگ غلطیوں پر غور کرنے کے بجائے پچھتاوے کا شکار ہو جاتے ہیں اور غلطیوں سے پیدا شدہ نتائج جو اکثر ناپسندیدہ ہوتے ہیں ان کے بارے میں کچھ نہیں کر پاتے۔ غلطی کے بعد کے لمحات پر آپ کا کنٹرول ہونا چاہیے نا یہ کہ وہ آپ کو کنٹرول کریں۔

وہ اہلیت جس سے جانور محروم ہیں

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایک بڑی کمال خوبی یا یوں سمجھیے کہ صلاحیت سے نوازا ہے۔ اس اہلیت سے جانور محروم ہیں۔ یہ ہے اپنی سوچ کے عمل اور ردِعمل کے بارے میں سوچ سکنے کی اہلیت، یہی خودآگہی ہے۔ اسی کو خودشناسی کا نام دیا جاتا ہے۔

کووے اور اس کے خیالات پر یوں تفصیل سے گفتگو کرنے کا باعث اس کے دلچسپ اور مفید خیالات ہیں جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوچنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہم برسوں بلکہ صدیوں سے ردعمل کی صلاحیت کو اتنا پروان چڑھا چکے ہیں کہ ہر چھوٹی بڑی بات پر اتنے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں کہ جیسے دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ وہی ہو۔ اس کے چند روز بعد وہ معاملہ ہماری گفتگو تو کیا زندگی سے ہی نکل گیا ہوتا ہے۔ البتہ ردعمل کے نقصانات برسوں تک سائے کی طرح پیچھا کرتے ہیں۔

وکٹر فرینکل کی کہانی

کووے کا خیال ہے جب تک ہم یہ نہیں سمجھ لیتے کہ ہم خود کو کیسے دیکھتے ہیں اس وقت تک یہ بھی نہیں جان سکتے کہ دوسرے خود کو کیا جانتے ہیں اور ان کی دنیائیں کیسی ہیں؟ ہم اپنی رائے کو سو فیصد درست سمجھ کر دوسروں کو سمجھنے اور ان کے ساتھ بامعنی تعلقات کے امکانات کو محدود کرتے جائیں گے۔ اس نے اپنی بات واضح کرنے کے لیے نازی جرمنی کی جان لیوا قید میں گرفتار ہونے والے ایک یہودی وکٹر فرینکل کی کہانی سنائی ہے۔ وکٹر، فرائیڈ کا پیروکار ایک نفسیات دان تھا اور سمجھتا تھا کہ بچپن میں ہم جن خیالات اور حالات سے گزرتے ہیں وہی ہماری شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں اور ہم ساری عمر انہی کے زیر اثر رہتے ہیں۔ یہی ہماری حدود، معیارات اور پسند و ناپسند کا تعین کرتے ہیں۔ نازی کیمپ میں اس کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ کوئی عام انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ سننے والا تھرا جاتا ہے۔ اس کے ماں باپ، بھائی، بیوی سب اس کے سامنے گیس کے تندوروں میں ڈال کر مار دیے گئے۔ خود اس کے حصے میں بہت اذیتیں اور ذلتیں آئیں۔ وہ نہیں جانتا ہوتا تھا کہ اسے تندوروں میں جلتی اپنوں کی لاشوں کی راکھ نکالنی ہے یا جلتی ہوئی لاشیں، ایک روز وہ قید خانے میں تنہا اور ننگا بیٹھا ہوا تھا جب اس نے اپنے اندر اس قید سے آزاد ہونے کا خیال پیدا ہوتے دیکھا۔ وہ اس خیال کو "انسان کی آخری اور اصلی آزادی" کہتا ہے۔

یہ ایسی آزادی تھی جسے جیلر تو نہیں چھین سکتا تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا اس کے محرک جاننے اور اس کے بارے میں ردعمل سوچنے سے اس کو یہ قوت حاصل ہوگئی کہ وہ جیسا چاہے گا، ردعمل دے گا۔ وہ اس کے جسم سے جو چاہے سلوک کریں لیکن اس بات کا فیصلہ وہ کرے گا کہ اس کا ردعمل کیسے دینا ہے۔ اسی دوران وہ فرضی طور پر یہ تصور کر لیتا ہے کہ موت کے اس کیمپ سے رہائی کے بعد وہ لیکچر دے رہا ہے۔ اپنے شاگردوں کو اپنے جان لیوا تجربات اور مشاہدات سے آگاہ کر رہا ہے۔ وکٹر کے اندر اپنے ردعمل کو چن لینے اور اختیار کرنے کی آزادی اور اختیار کا احساس مضبوط ہوا تو اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑا۔ یہاں تک کہ پہرے دار تک اس سے متاثر ہونے لگے، اس نے اپنی قید کو پُروقار اور اذیتوں کو پُرمعنی بنا دیا۔ وہ "انسان کو محرک اور ردعمل کے درمیان اپنی تمنا کے مطابق چناؤ کر لینے کی آزادی" کا نشان بن گیا۔ وکٹر فرینکل نے منزل پر پہنچنے والے صحیح راستے اور نقشے کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھایا کہ اپنے اندر پُراثر ترین لوگوں کی پہلی عادت پروایکٹو ہونا یا Proactivity کیسے پیدا کر کے ماحول پر اثرانداز ہونا ہے۔ کووے نے یہاں ایک ماڈل بنا کر آسانی پیدا کر دی کہ کسی نئی بات کا ردعمل تو عام سی بات ہے۔ اگر "چناؤ

آپ اپنی رائے کو ۱۰۰ فیصد درست سمجھ کر دوسروں کو سمجھنے اور اُن کے ساتھ بامعنی تعلّقات کے امکانات کو محدود کر لیں گے

کی آزادی" کا راستہ اختیار کریں تو ۱۔ خود آگہی، ۲۔ تخیل، ۳۔ ضمیر، ۴۔ ارادے کی خودمختاری حاصل ہوتی ہے۔ اردو میں پروایکٹو کا لفظ پہلے نہیں تھا۔ اب تو مینجمنٹ کی کتابوں میں اس کا تذکرہ بھرا ہوا ہے۔ ہر کمپنی ہی پروایکٹو مینیجرز اور لیڈرز کی متلاشی ہوتی ہے۔

پروایکٹو ہونا

(قدم اُٹھانے سے ذرا آگے کی کیفیت)

اصل میں پروایکٹو ہونا "قدم اٹھانے" سے ذرا آگے کی کیفیت ہے یعنی ذمہ داری یعنی Responsibility کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے درست رویے اور ردعمل

اپنا موسم اپنے ساتھ رکھیں بارش اور دھوپ سے فرق نہ پڑے۔ آپ نہ حالات کی پیداوار ہیں نہ محسوسات کی

(Response) کے چناؤ کی اہلیت، حالات، واقعات اور موسموں پر کوئی الزام نہیں۔ نہ آپ حالات کی پیداوار ہیں نہ محسوسات کی، اپنا موسم اپنے ساتھ رکھیں، بارش اور دھوپ سے فرق نہ پڑے۔ یہ نہیں کہ موسم اچھا ہے تو وہ اچھا محسوس کریں، ورنہ رویہ اور کارکردگی دونوں متاثر ہو جائیں گی۔ پروایکٹو لوگوں کی اقدار ہی ان کے رویوں کو چلاتی ہیں اور اقدار پر مبنی رویہ موسموں کا

۳۔ بنیادی اقدار

اس کے ثبوت کے لیے کووے نے ۳ بنیادی اقدار کا ذکر وکٹر فرینکل کی زبان سے کرایا:

۱۔ تجرباتی اقدار (یعنی جو کچھ ہمارے ساتھ ہوتا ہے)

۲۔ تخلیقاتی اقدار (جو زندگی میں ہماری وجہ سے وجود میں آتی ہیں)

۳۔ رویے پر مبنی اقدار (یہ مشکل حالات میں ہمارے ردعمل سے بنتی ہیں)

ان تمام اقدار میں ہمارے رویے پر مبنی اقدار بہت اہم ثابت ہوتی ہیں کیونکہ یہی ثابت کرتی ہیں کہ زندگی کے تجربات پر ہمارا رویہ اور ردعمل کیسا ہوتا ہے۔ نقطۂ نظر اور زاویہ نظر کی تبدیلی دراصل اعلیٰ اقدار کی غمازی کرتی ہے۔ پروایکٹو لوگ وہ ہوتے ہیں جو مسائل کا حل ہوتے ہیں خود مسئلہ نہیں بن جاتے۔

امریکا میں ایک مصنف اور ٹرینر ایسا بھی ہے جو کووے سے بھی زیادہ مشہور ہے۔ اس کا نام ہے اینتھنی رابنز، اس کی ۲ کتابیں ایسی ہیں جو کہ کروڑوں کی تعداد میں بک چکی ہیں۔ "Unlimited Power" اور "Awaken the Giant within"۔ اداروں اور خاندانوں کی اصلاح و تبدیلی کے لیے اس کا کام بھی بڑا مؤثر اور منفرد ہے۔ اُس نے ایک بار کووے کے بارے میں کہا "کامیابی کی کلید یا تنجی تو کچھ بنیادی باتیں ہی ہوتی ہیں اور کووے ان باتوں کا ماہر ہے مگر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آپ اس کی ان باتوں کو اپنی زندگی میں استعمال بھی کریں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرہونِ منت نہیں ہوتا۔

ردِعمل سے متاثر ہونے والے لوگ اپنی جذباتی زندگیاں دوسروں کے رویے پر کھڑی کرتے ہیں۔ دوسروں کی کمزوریوں کو اس قدر طاقت بخش دیتے ہیں کہ وہ انھیں ہی کنٹرول کرنے لگتے ہیں۔ لوگ اچھے طریقے سے ملیں تو خوش، اور اگر اچھے طریقے سے نہ ملیں تو فوراً مدافعتی رویہ اختیار کرلیں گے اور تحفظ ڈھونڈنے لگیں گے۔

کووے نے گاندھی کی مثال دی ہے کہ ''وہ ہم سے ہماری عزت نہیں چھین سکتے تاوقتیکہ ہم خود اسے ان کے حوالے نہ کردیں۔'' یعنی ہمارے ساتھ جو ہوتا ہے وہ ہماری رضامندی اور اجازت سے ہوتا ہے اور یہ حقیقت زیادہ تکلیف دہ ہے، نسبتاً اصل تکلیف کے۔ اسی بات کو ایلینر روزویلٹ (Eleanor Roosevelt) نے کچھ یوں کہا تھا ''کوئی آپ کو آپ کی اجازت کے بغیر تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔''

> ہر آتے جاتے مصنّف کی فکر سے چلتی بس میں سوار ہونے سے بہتر ہے کہ اپنی سوچ اور فکر کے ساتھ سفر کیا جائے

سوکھ کر کانٹا ہوتی کیرول کی کہانی

کووے نے اپنی بیوی سانڈرا کی سہیلی کیرول کی بیماری کے علاوہ حضرت یوسفؑ کی مثال سے مؤثر لوگوں کی اس کامیاب عادت کو اور گہرائی سے سمجھایا ہے مثلاً سوکھ کر کانٹا ہوتی کیرول کو کینسر تھا اور ۴ سال ہسپتال میں رہی۔ سانڈرا کی وہ ۲۵ سال سے دوست تھی۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھی تھی اور کیرول اسے اپنی یادداشتیں لکھواتی جاتی۔ کیرول نے اپنے سارے بچوں کے لیے پیغام لکھوائے جو انھیں عمر کے مختلف حصوں میں دیے جانے والے تھے۔

اس پروایکٹو خاتون نے ہسپتال کے سارے ماحول کو متاثر کیا۔ موت سے ایک دن پہلے جب کووے اس سے ملنے گیا تو اسے اس کی آنکھوں میں موت نہیں حوصلہ اور شکرگزاری ملی۔ کسی ایسے فرد کی موت جو حلیم الطبع ہو، دوسروں سے پیار کرتا ہو، دوسروں کی خدمت اس کا شعار رہا ہو۔ شکرگزاری ہمیشہ ہمیں زیادہ متاثر کرتی ہے اور ہم اسے تادیر بھلا نہیں پاتے۔

کووے کے خاندان کی دلچسپ روایت

سٹیفن کووے نے اپنے خاندان کی ایک دلچسپ روایت لکھی ہے کہ جب کوئی بڑا یا بچہ غیر ذمے دارانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ اس کو کوئی کام مشکل لگتا ہے یا یہ لگے کہ وہ ہمت ہار سکتا ہے یا یہ کہ وہ انتظار کرنے لگے کہ کوئی اور آکر اس کی ذمے داری پوری کرے اور مسئلے کا حل نکالے تو ہم اس سے کہتے ہیں اپنا R اور I استعمال کرو۔ یہ دونوں لفظ ہمارے خاندان کی روایت ہیں اور سب کے لیے جانے پہچانے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ بڑے جب کسی کو یاددہانی کرانے لگتے ہیں تو وہ پہلے ہی بول پڑتا ہے کہ اب آپ مجھے کہیں گے کہ اپنا R اور I استعمال کرو (آر سے مراد ریسورس فل نس پوری صلاحیت، تدبر اور تعلقات کا استعمال اور آئی سے مراد انیشی ایٹو یعنی پیش قدمی کرکے آگے بڑھ کر چیزوں کو اپنے ہاتھ میں لو اور قدم بڑھاؤ)۔

کووے کا خیال ہے کہ جو لوگ پہلے قدم اُٹھاتے ہیں ان میں اور سوچتے رہ جانے والے اور اس صلاحیت سے محروم لوگوں میں دن اور رات کا فرق ہے۔ نتائج میں ۲۵ یا ۵۰ رفیصد نہیں ۵۰۰۰ رفیصد کا فرق ہوتا ہے۔ یہ صلاحیت ہو تو ۷ رعادتیں اپنانے کی بات ہوسکتی ہے کیونکہ ہر عادت

دلچسپ حقیقت (It's Work)

تھوڑا غور کیا جائے تو آپ کو لگے گا کہ کووے کا سارا کام ''مذہبی فریم ورک'' میں رہ کر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس کی ایک وجہ اُس کا پادری ہونا ہو۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں وہ عیسائیت سے متاثر ہے۔ کچھ کہتے ہیں اس کی باتوں پر اسلامی تعلیمات کا بہت اثر ہے۔ مصنف اس بات پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ Self Help پر کام کرنے والے بیشتر امریکی، یورپی اور اب ہندو مصنفین بھی مذہبی تعلیمات کے زیرِاثر ہی اس موضوع پر بات کرتے ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ کچھ عرصہ پہلے دہلی میں پیش آیا جہاں Self Help کے ایک معروف ہندو رائٹر جس کا دعویٰ یہ ہے کہ میرا پروگرام ۱۰۰ رفیصد لوگوں کو بدلتا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ اتنا بڑا دعویٰ! اس نے مسکراتے ہوئے کہا میرے Self Help کے پروگرام کی خوبی یہ ہے کہ لوگوں کو لگتا ہے کہ یہ میرا اپنا ہے حالانکہ اس میں کچھ بھی میرا اپنا نہیں ہے۔ میری چالاکی کہیے یا سمجھداری، وہ یہ ہے کہ میں نے مذہب کی ساری اچھی اچھی باتیں اٹھا کر ان کو سیکولرائز کردیا ہے۔ ان کی اصطلاحات بدل دی ہیں۔ یہ سب کے لیے قابل قبول ہوگیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکیڈیمیہ والے تو دیکھتے ہی سب سے پہلے یہ ہیں کہ اس میں خرابی کہاں کہاں اور کیا کیا ہے۔ میں نے ان تعلیمات کو آزما کر دیکھا ہے۔ It works۔

گزشتہ ۳۰۰ سال سے بلکہ یوں سمجھیے کہ نیوٹن کے عہد سے سائنسز میں Procedure of Predictability کا غلبہ ہوگیا ہے۔ ساری Mind Mapping انہی کے مطابق ہورہی ہے۔ بات کو سمجھنا اور سمجھانا ایک لحاظ سے آسان بھی ہوگیا ہے مثلاً ۴۰ رکلومیٹر مشرق کی طرف جانے والا ۲۰ رکلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے ۶۰ رمنٹ بعد کہاں ہوگا؟ سورج دوپہر ۱۲ رابجے کہاں ہوگا؟ اس سوچ نے انسانی ذہن کو خوب خوب متاثر کیا اور اپنے اثر میں اس قدر لے لیا ہے کہ خود انسانی تعلقات کو بھی اسی سوچ کے پیمانے پر پرکھا جانے لگا ہے اور انسانی ذہن کی تبدیلی کو بھی۔ اس لیے نوٹ کیجیے مغرب سے آنے والی Self Help کی تمام تھیوریاں، باتیں، قصے اصل میں اسی سوچ کا تسلسل ہوتی ہیں۔ ایک منٹ مینیجر، ایک منٹ صوفی، ایک منٹ لیجر سے لے کر مینجمنٹ کی پھیلی ہوئی وسیع دنیا میں ہر چیز Calculated دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کا انحصار اسی پہلے عادت یعنی پروایکٹو ہونے پر ہے۔ اگر آپ کے پروایکٹو پٹھے مضبوط ہیں تو کامیابی کے بہترین مواقع آپ کے منتظر ہیں اور دوسری صورت میں جبکہ آپ معمول بننے کے لیے تیار رہتے ہیں، ہر عمل کی ذمے داری دوسرے پر ڈال دیتے ہیں۔

اپنی بیوی سے محبت نہ کرنے والے کا مکالمہ

ایک بار سیمینار میں ایک صاحب نے کووے کو روکا اور کہا آپ جو کچھ کہہ رہے ہو اچھا لگ رہا ہے مگر میری صورتِ حال بہت مختلف ہے۔ میں بے حد پریشان ہوں۔ میں اپنی بیوی سے پہلی سی محبت نہیں کرتا کیونکہ اس کا بھی یہی حال ہے۔ ہمارے ایک دوسرے کے بارے میں خیالات ہی بدل چکے ہیں۔ کووے نے پوچھا کیا تمھارے درمیان احساسِ محبت بالکل ختم ہوگیا ہے؟ ہاں میرا خیال ہے ایسا ہی ہے مگر ہمارے ۳ رہچے ہیں میں ان کے لیے بہت پریشان ہوں۔ کووے کے جواب سے میں خود بھی ایک لمحہ کو پریشان ہوگیا۔ اس نے قطعیت سے کہا ''اپنی بیوی سے محبت کرو''۔

اس آدمی نے غصے سے کہا بتایا ناں..... ایسا کوئی احساس ہی باقی نہیں رہا۔

کووے کا اصرار جاری تھا ''اس سے محبت کرو، جب محبت کا احساس ہی ختم ہو چکا ہے تو پھر تو زیادہ بڑی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مضبوط وجہ ہے کہ محبت کرو۔"

اس آدمی کی ناں قائم تھی اور ضدی جواب بھی کہ جب محبت ہے ہی نہیں تو کر کیسے سکتا ہوں؟

کووے کا جواب دلچسپ ہی نہیں ایک لحاظ سے نئی ڈائی مینشن لیے ہوئے تھا۔ بولا "میرے دوست محبت ایک فعل ہے اور محبت کا احساس اس فعل کا نتیجہ۔ لہٰذا محبت کرو، خدمت کرو، قربانی دو، اسے سنو، اسی کی طرح ہو کر سوچو، اعتماد بحال کرو، محبت احساس نہیں ایک قدر ہے۔ ایک فعل ہے، یہ ہمیشہ کی جاتی ہے۔

جیسے ماں بچے کو جنم دے کر بھی کرتی رہتی ہے۔ پروا ایکٹو لوگوں کے لیے کووے کا کہنا ہے کہ ہمیشہ محبت کو فعل سمجھ کر کریں اور مستقل کریں۔ قربانیاں دینا، خدمت کرتے رہنا ضروری ہے کہ ادب عالیہ میں بھی محبت کا لفظ ہمیشہ فعل کے طور پر آیا ہے۔ ہالی وڈ کی فلموں کی محبت اصل حقیقت نہیں۔ اگر ہمارے جذبات نے ہی ہمیں کنٹرول کرنا ہے تو پھر وہی ہمارے حاکم ہوئے۔ ہم تو اپنی ذمے داری اور سوچ سے خود ہی دست بردار ہو کر بیٹھ گئے۔ محبت تو محبت بھرے اقدام کرنے سے وجود میں لائی جاتی ہے۔ یہ قدر (Value) ہے۔ احساسات ویلیوز کے ماتحت ہوں تو ہی محبت کا صحیح احساس حاصل ہوتا ہے۔

کووے کی دیگر کتابیں

سیون ہیبٹس آف ہائیلی ایفیکٹو پیپل (Seven Habits of Highly Effective People) کے علاوہ کووے نے "First things first every day" لکھی۔ یہ بھی بہت مفید اور زبردست کتاب ہے۔ "Nature of leadership" کے علاوہ "Purpose" "seven habbits of highly effective families" اور "Daily reflections for highly effective people" بھی اس نے بہت عمدگی سے تحریر کی۔ ایک کتاب "Seven habbits of highly effective teens" بھی دستیاب ہے مگر یہ کووے کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اُس کے بیٹے نے تحریر کی ہے۔ یہ میں ابھی تک پڑھ نہیں سکا، اس لیے رائے نہیں دے پاؤں گا۔

کووے پہلے پادری تھا

کووے کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم مکمل کر کے بطور پادری خدمات سرانجام دیتا رہا۔ سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت نے ہی اسے پادری سے ٹرینر بننے پر اُکسایا۔

باقی کی ۶/ عادتیں

باقی ۶/ عادتوں میں سے عادت نمبر ۲/ یہ ہے کہ انجام کو ذہن میں رکھ کر کام شروع کریں۔ تیسری عادت اہم کام پہلے، چوتھی عادت ہمیشہ اپنی اور دوسروں کی جیت کا سوچیں۔ پانچویں عادت پہلے دوسروں کو سمجھیں پھر انھیں سمجھائیں۔ چھٹی عادت سینرجائز یعنی اتحادِ عمل اور ساتویں عادت اپنی آری کو تیز کریں۔

سٹیفن آر کووے کو دنیا کے معروف رسالے ٹائم میگزین نے ایک زمانے میں امریکا کی ۲۵/ موثر ترین شخصیات میں شامل کیا تھا۔

کووے کی وجۂ شہرت ایک ہی کتاب بنی گو کہ وہ درجن بھر کتابوں کا مصنف ہے۔ باکمال کتاب "Unlimited Power" کے مصنف انتھی رانبز نے کووے کے بارے میں لکھا۔ "بنیادی باتیں کامیابی کی کلید ہوتی ہیں اور سٹیفن کووے ان کا ماہر ہے۔ یہ کتاب ضرور خریدیں لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اسے استعمال بھی کریں۔"

انسانی ترقی اور اس راہ پر چلنے والوں، مینیجرز، تجارتی اداروں کے سربراہوں اور خاص طور پر بزنس ایجوکیشن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بے تابی سے کامیابی کی گزرتی ٹرینوں کو دیکھنے والے نوجوانوں کے لیے جو کہ ہر چلتی ٹرین پر چڑھنے کی مسلسل ناکام کوشش کرتے نظر آتے ہیں، کووے نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس نے ترقی کے آفاقی اصولوں پر مبنی اپنی سوچ کو ایک فکر اور ادارے کا روپ دے ڈالا۔ اسی پر بس نہیں کی، اپنی فکر اور فلسفے کو آڈیو کیسٹس اور ویڈیو ٹیپس میں اس عمدگی اور نفاست سے پیش کیا کہ وہ ہر خاص و عام کو بھا گئیں۔ کووے نے اس کامیابی کو اپنی سوچ کا نقطہ اختتام نہیں بلکہ نقطہ آغاز جانا اور دنیا میں کارپوریٹ ٹریننگ کے لیے "فرینکلن کووے

کووے کے استعمال کی عمدہ مثال

"میں اپنے آپ کو بہت طرم خاں سمجھتا تھا مگر ۱۹۹۸ء تک، تب ایک امریکی کنسلٹنٹ نے مجھے ایک کتاب کا تحفہ دیا۔ کتاب خاصی مہنگی تھی۔ میں کتاب سے زیادہ اس کی قیمت سے متاثر تھا۔ جب کووے کی لکھی "مؤثر لوگوں کی ۷/ عادات" پڑھ چکا تو مجھے سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا کروں۔ کچھ تصورات آپ کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ کا دل چاہتا ہے آپ کے سارے جاننے والے آپ کے ہم خیال ہو جائیں۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ نہیں آیا، بازار گیا تا کہ ایک دو کتابیں خرید کر اپنے دوستوں کو تحفہ دے سکوں۔ مارکیٹ جا کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہاں کتاب کا Pirated ایڈیشن موجود تھا۔ میں نے تھوڑی تھوڑی کر کے ایک دو ماہ کے اندر اندر پوری ایک سو کتابیں خرید لیں اور اپنے ہر پڑھنے لکھنے والے دوست کو تحفہ کر دیں۔"

یہ پروفیسر محمد بابر انور تھے۔ جی سی لاہور سے ایم ایس سی کرنے کے بعد لیکچرر بنے تو سرکاری کالجوں کی دنیا کو اپنے خیالوں کی دنیا سے بہت چھوٹا پایا۔ DSD ڈائریکٹوریٹ آف سٹاف ڈویلپمنٹ میں رہے۔ پھر سرکاری دنیا چھوڑ کر یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی میں لائف اینڈ لرننگ کے استاد ہو گئے۔ کئی سال بعد پاکستان کی معروف آغا خان یونیورسٹی کراچی سے منسلک ہو گئے۔ ابھی ایجوکیشنل مینجمنٹ کنسلٹنٹ کے طور پر ملائیشیا اور امریکا کے اداروں کے ساتھ بڑا مؤثر کام کر رہے ہیں۔ ELLTA (Exploring Leadership & Learning Theories in Asia) کے بورڈ ممبر ہیں۔

"اس کتاب نے کیا فرق ڈالا تھا؟" میرے سوال پر بابر کا جواب بڑا دلچسپ تھا۔ ڈائریکٹوریٹ آف سٹاف ڈویلپمنٹ لاہور جہاں سینئر سبجیکٹ سپیشلسٹ تھا، کا ڈائریکٹر ایک ماہر حیوانیات کو لگا دیا گیا تھا۔ ان دنوں صوبائی وزیرِ تعلیم حیدر وائیں تھے جنھیں اخبارات میں زیرِ تعلیم لکھا جاتا تھا۔ ہمارے سیکرٹری ایجوکیشن ریلوے سے آئے تھے۔ میں ان حالات میں اپنے آپ کو بڑا مس فٹ پاتا تھا۔ کووے نے مجھ سے کہا "Start with yourself"۔ تمھیں یہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے کہ تمھارا ڈائریکٹر ماہر حیوانیات ہے۔ تمھیں دیکھنا چاہیے کہ تم کیا ہو؟ میں نے کووے کی بات مان لی۔

پہلا ہی اثر کمال قسم کا ہوا۔ ہمارا ڈائریکٹر بے حد بدتمیز تھا۔ ۸/ بجے رجسٹر حاضری اس کے کمرے میں چلا جاتا۔ پھر جو لیٹ آتا اس کے کمرے میں جا کر حاضری لگاتا۔ وہ نظر اٹھا کر سخت بدتمیزی سے دیکھتا اور کچھ کہے بنا عزت ہاتھ میں پکڑا دیتا۔ میں ان کے پورے دور میں ایک روز بھی ۸/ بجے دفتر نہیں پہنچا۔ طے کیا کہ نہ اس کی بات سنی ہے۔ نہ اس سے ملنا ہے۔ نہ اس کی بدتمیزی کی نگاہ کا ہدف بننا ہے۔ یہاں سے میرا پرواایکٹوازم شروع ہوا۔

میں روز ساڑھے سات، سوا سات دفتر پہنچ جاتا۔ کوری ڈورز کے ساتھ لان تھا۔ وہاں مارننگ واک کرتا، چائے بناتا۔ خود پیتا، اپنے جلدی آنے والے سٹاف کو پلاتا۔ مددگار عملے کو روز چھٹی ڈال کر ملتا۔ لوگ سارا دن جس بات پر جلتے کڑھتے اور ڈس موڈ ہوتے، میرے لیے وہ ایک روز بھی مسئلہ نہ بنا۔ اپنے پورے قیام کے دوران انھوں نے مجھے ایک بار بھی بلایا نہ میں ان کے کمرے میں گیا۔ جب وہ ٹرانسفر ہوئے تو انھوں نے اپنی "بلیو بک" میں آنے والے ڈائریکٹر کے لیے لکھا "یہ بابر واحد آدمی ہے جو اس ادارے میں ٹرسٹ وردی (Trust worthy) ہے۔"

کووے کا ایک چھوٹا سا اشارہ (Clue) پروفیسر بابر انور نے پکڑ لیا تھا۔ جیسے بابر نے شیر شاہ سوری کو کھانے پر بلایا۔ دسترخوان پر چھری نہ پا کر شیر شاہ سوری نے اپنی تلوار نکالی اور سیب کاٹ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ بابر نے اس موقع پر اشارہ کیا کہ اسے روک لیا جائے۔ مگر جب تک اشارہ پا کر اس پر عمل ہوتا شیر شاہ سوری نے اشارہ دیکھ کر بھانپ لیا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمپنی'' کی بنیاد ڈالی۔ آنے والے سالوں میں اس کمپنی نے بیسیوں اداروں کے مینیجرز کی کایا پلٹ دی۔ ان کی سوچوں کو نیا رخ دے دیا۔ ان کے دلوں میں آگے بڑھنے، سوچنے اور بہت عمدگی سے کچھ کر دکھانے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ اس سے پہلے وہ ''کووے لیڈر شپ سنٹر'' بنانے کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔

کووے کی ایک اور خاص خوبی اہم لوگوں کے خاندانی معاملات کو سلجھانے، کونسلنگ اور بے حد عمدہ مشوروں کے ساتھ بگڑتی زندگیوں کو سنوارنے اور سجانے کی سعی ہے۔ ''The Road Less Travelled'' ایک بڑی زوردار کتاب ہے۔ اس کے لکھنے والے رائٹر سکاٹ پک نے کووے کی تعریف ذرا مختلف انداز میں کی۔ کہتے ہیں ''یہ کتاب اس لحاظ سے ایک تحفہ ہے کہ یہ عامیانہ ہوئے بغیر عام فہم ہے۔ کووے نے ذاتی اور پیشہ ورانہ مسائل کا حل جامع اور مربوط اصولوں پر مبنی اپروچ کی صورت پیش کیا ہے۔ پُرتاثیر قصے ہمیں سچی، دیانت دارانہ اور پُروقار زندگی گزارنے کی راہ سُجھاتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ایک دہائی میں بزنس کی دنیا میں ہی نہیں میڈیا، سیاست، علم، ٹیکنالوجی، ایجادات اور سوچ ہر چیز بدل رہی ہے۔ اچھی سوچ اور فکر والی کتاب اگر ڈیڑھ کروڑ تک بک رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کتاب کو کم سے کم ۳ کروڑ لوگوں نے تو ضرور پڑھا ہوگا۔ مطالعہ، اہلیت اور سوچ میں تازگی اب کتاب سے نکل کر آئی پیڈ، آئی فون کنڈل تک پہنچ گئی ہے۔ کہا جاتا ہے امریکا کی ایک بڑی لائبریری میں اس قدر کتابیں ہیں کہ پورے ملک کے گرد رکھی جا سکتی ہیں۔ عالم اسلام کی کل لائبریریوں کی کتابیں قریباً ۶ میل کا رقبہ گھیریں گی۔

ہمارے ہاں استاد جنھوں نے کئی دہائیاں پہلے پی ایچ ڈی کر لی تھی یا ایم اے کرنے کے بعد نوکری کی تھی، برسوں سے کسی نئی کتاب اور نئی سوچ سے آگاہ نہیں ہو پائے۔ رد کرنے، تجزیہ کرنے کی صلاحیت تو ایک نعمت ہوتی ہے جو پڑھنے اور غور کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ تب ہی آپ اپنے پڑھے اور سننے والوں کو سکھا سکتے ہیں۔ انھیں بہتر انسان بننے کے گُر سکھلا سکتے ہیں۔ مؤثر

میرے متعلق ہے۔ وہ ہاتھ دھونے کے بہانے نکلا، اپنے گھوڑے پر چھلانگ لگا کر بیٹھا، یہ جا وہ جا۔ اچھی کتاب کی خوبصورتی اس کے لفظوں کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کی سمجھداری اور تیزی سے اشارہ پکڑنے کی خوبی سے بھی جڑی ہوتی ہے۔

''سٹیفن آر کووے کو بطور ٹرینر اور کنسلٹنٹ کیسے اپنے ساتھ رکھا؟'' بابر نے بتایا ''اپنے ۹۵ فیصد پروگراموں میں اس کے خیالات کو استعمال کیا۔ سندھ بلوچستان کے اساتذہ ٹریننگ پر کراچی آغا خاں یونیورسٹی آئے ہوئے تھے۔ سرکاری ملازموں کو صرف ٹی اے ڈی اے سے غرض ہوتی ہے۔ ان کی بلا سے ورکشاپ اور سیمینار کسی موضوع پر بھی کر لیں۔

ایک روز وہ شکایات اور مسائل لکھ کر لائے تھے جو انھوں نے ڈائریکٹر کو دینے تھے کہ رہنے، کھانے کے کتنے مسائل ہیں۔ میں نے اس روز سرکل آف انفلوانس اور سرکل آف کنسرن پر بات کی اور کہا کہ یہ آپ کی دنیا ہے۔ آپ کی مرضی کہ آپ سرکل آف انفلوانس میں داخل ہو جائیں یعنی عمل کی دنیا میں یا سرکل آف کنسرن میں ہی عمر بھر بیٹھے رہیں۔ یعنی گفتگو کی دنیا میں منفی، مثبت ہر طرح کی گفتگو، کبھی نہ ختم ہونے والی گفتگو، مہمل، بے فیض، دلچسپ شکایات سے بھری، الزام آلودہ۔ کوئی ذمہ داری نہیں۔ کوئی کام خود سے ٹھیک کرنے کی آرزو نہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ بطور باپ، بطور ٹیچر، بطور محلے دار، دوست آپ کس سرکل کے آدمی ہیں۔ بات ختم ہوئی تو ان کے گروپ لیڈر نے اٹھ کر ایک کاغذ پھاڑ دیا۔ میں نے پوچھا خیریت ہے! کیا پھاڑ ڈالا؟ بولا یہ شکایات تمھیں اب نہیں کرنیں۔

کووے کے سرکل آف کنسرن کو میں نے ایک اور طرح سمجھا کہ ہر آدمی اس کو کس قدر چھوٹا کر سکتا ہے۔ جب سرکل بے حد چھوٹا ہو جاتا ہے تو آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ یعنی کسی اور پر تو کیا اپنے جسم پر بھی اس کا اثر باقی نہیں رہتا۔

ہم جیسے بھی ہوں، اچھے یا بُرے، نیکو، پازیو ہمیں اللہ کا بہت شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم پاگل ہونے سے پہلے مر

عادتوں کا ہنر، ان کی ذات کا حصہ بنا سکتے ہیں۔

ہماری نئی نسل کی خوش بختی یہ ہے کہ وہ اس عہد میں سانس لے رہی ہے جہاں چاروں طرف سے علم اور دانش کی بارش ہو رہی ہے۔ ایسے میں بھیگے بنا، جانے بنا اپنی زندگیاں سنوارنے سے محرومی کس قدر دکھ دے سکتی ہے۔ یہ سوچنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے تو ہم بھی خوب لوگ ہیں نہ اپنی دینی کتابیں پڑھتے ہیں نہ اللہ اور رسول کی پسند اور ناپسند کو جان پاتے ہیں اور نہ ہی یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ دنیا میں کامیابی کے راز کیا ہیں۔ اللہ نے کامیابی کا میوہ صرف نمبروں کے لیے تو نہیں رکھا۔ اس کی محبت کے دعوے داروں کو دعووں سے فرصت ملے تو کچھ محنت کریں، اہلیت پیدا کریں، دنیا میں آگے بڑھنے والوں کے طریق اور سلیقے کو جانیں۔ ہم خدا جانے کیوں ہمیشہ Denial کی کیفیت میں رہتے ہیں۔ خود کرتے نہیں کوئی دوسرا کرے تو فوراً کہہ دیتے ہیں یہ تو دنیا کی کامیابی کی باتیں ہیں حالانکہ خود بھی اس دنیا کے لیے مرے جاتے ہیں۔ بس کامیاب ہونے کی قیمت ادا کرنے پر تیار نہیں

مطالعہ، اہلیت اور سوچ میں تازگی اب کتاب سے نکل کر آئی پیڈ، آئی فون کنڈل تک پہنچ گئی ہے

ہوتے اور اس میں مسلمان ہونے کی بنیاد پر رعایت ڈھونڈتے اور مانگتے رہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کوئی اچھی بات لکھ دے تو پڑھے بنا انکار کر دیتے ہیں۔ پڑھ لیں تو اس کا نام، رنگ اور نسل دیکھ کر سینے کے اندر عجیب طرح گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے سوچنے سے ہی انکاری ہو جاتے ہیں۔

زندگی نعروں، باتوں اور خوابوں سے لمحاتی طور پر اچھی لگنے لگتی ہے مگر اسے مستقل اچھا بنانا ہو تو کچھ عادتوں، خوبیوں (Traits) کو اپنانا ہوگا۔ کسی مستقل پہچان کے بنا، کسی مضبوط بنیاد کے بنا کوئی فرد نہ خود شخصیت کی ترقی کی روشنی پا سکتا ہے نہ اپنے ساتھ اپنے اداروں کو نئی رفعتوں سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

جاتے ہیں ورنہ جیسے جیسے سرکل سکڑتا ہے گھر والے بھی دعا کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی غور کیجیے جتنا سرکل بڑا ہوتا ہے دعا دینے والے بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں اور زندگی میں آپ کی ماننے والے اور آپ کو ماننے والے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں آپ کے جانے کے بعد جلد ہی حافظے سے آپ کا نام ہی محو ہو جاتا ہے۔

کیا دفتر میں یا کلاس میں یہ بات سکھائی جا سکتی ہے؟

کیوں نہیں پہلی ایکٹوٹی تو یہ کریں کہ اپنے آس پاس موجود بندے پہچانیں کہ ان میں کون عمل کی دنیا کا ہے اور کون گفتگو کی دنیا کا۔ جو لوگ سارا دن شکوے ہی کرتے رہتے ہیں کہ سارا سسٹم بُرا، سارے لوگ بُرے۔ وہ گفتگو کے لوگ ہیں۔ ان کو سمجھنا اور سمجھانا بہت ضروری ہے کہ وہ عمل کی دنیا میں آئیں۔ ان کا Influence اپنے آپ بڑھنے لگے گا۔ ہم جس لمحے دوسروں کے لیے Useful ہونے لگتے ہیں ہمارا سرکل آف انفلوانس بڑھنے لگتا ہے۔ کووے کی تھیوری کا لب لباب یہی ہے۔

ہمارے ہاں ناخوشی اور ناکامی کا تناسب اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کہ پانی کسی بھی غلطی کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ کووے کہتا ہے غلطی مانو، پھر سدھارو۔ ایک صاحب جن کی زبان کی نوک پر شکوے شکایتیں دھری رہتی تھیں۔ ان سے ایک روز پوچھا آپ جوتی مرمت کر سکتے ہیں۔ بولے نہیں۔ کپڑے سی سکتے ہیں۔ UPS کی وائرنگ کر سکتے ہیں۔ CNG فٹ کر سکتے ہیں۔ جب وہ ہر بات میں ناں کہتے رہے، تو کہا بھلے آدمی.....! جس جس کو یہ کام آتا ہے اس کی فضیلت ہے۔ اس کو مان لو، تمھارے دکھ درد کم ہو جائیں گے۔ ایک مہارت سیکھنے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ انسان کی ٹریننگ کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ اچھے مصنف، اچھی کتاب اور اچھے خیال سے سوچ بدلی جا سکتی ہے۔ ■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انقلابی آفر

کیجیے اپنی بہترین تحریری صلاحیتوں کا اظہار اور پائیے ۵۰۰ سے ۵۰۰۰ تک اعزازیہ

آپ اپنی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لائیے اور اردو ڈائجسٹ کے صفحات پر جگمگائیے

آپ لکھ سکتے ہیں

☆ طنز و مزاح ☆ دلچسپ واقعہ ☆ کسی کی زندگی بدلنے والا کوئی کام کیا ہو ☆ اپنے آس پاس کی کوئی سچی کہانی

☆ حیرت انگیز مشاہدہ

لیکن

☆ تحریر طبع زاد، نئی اور خالص اپنی ہو۔ ☆ ترجمہ شدہ، ماخوذ یا چھپی ہوئی نہ ہو۔ ☆ جیسی تحریر، ویسا اعزازیہ

☆ اپنی بہترین تحریری صلاحیتوں کا اظہار کیجیے اور فخر پائیے ملک کے بہترین رسالے میں چھپنے کا

☆ آپ کی تحریر ۳۔۴ صفحات پر مشتمل ہو (۱۸۰۰ سے ۲۰۰۰ الفاظ)

☆ تحریر سفید صفحے کے ایک طرف لکھی ہو/ فوٹو کاپی نہ ہو/ آپ کا پتا، فون نمبر شروع اور آخر میں درج ہو ساتھ ۵ سطروں کا تعارف ہو اور تصویر بھی بھیج سکتے ہیں۔ نام، فون نمبر اور پتا واضح اور خوش خط لکھیں۔ صفحے کی دائیں جانب کم از کم ۱/۲ ۱/۱ انچ کا حاشیہ ضرور چھوڑیں

☆ یاد رہے یہ تحریریں واپس نہیں کی جائیں گی۔ منتخب ہونے کی صورت میں فون پر اطلاع ہو سکے گی۔ منتخب شدہ تحریریں باری آنے پر ایک سال کے دوران چھپ سکتی ہیں۔

بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

باتیں دانش کی

رفیدہ کلیم فاروقی

کہا حضرت عمر فاروقؓ نے

1 طالب دنیا کو علم پڑھانا راہزن کے ہاتھ تلوار فروخت کرنا ہے۔

2 کسی کے خُلق پر اعتماد نہ کر، تاوقتیکہ غصے کے وقت اُسے نہ دیکھ لے۔

3 کم بولنا حکمت، کم کھانا صحت، کم سونا عبادت اور عوام سے کم ملنا عافیت ہے۔

4 ظالموں کو معاف کرنا مظلوموں پر ظلم کرنا ہے۔

5 حسن سوال نصف علم اور حسن تدبیر نصف معیشت ہے۔

6 جب حلال و حرام جمع ہوں، تو حرام غالب ہوتا ہے چاہے وہ تھوڑا کیوں نہ ہو۔

7 جب عالم کو لغزش ہوتی ہے، تو اس سے ایک عالم لغزش میں پڑ جاتا ہے۔

تقریر و تحریر بلیغ، تحریر زبردست اور فصیح۔ اکثر مرتبہ برمحل اور برجستہ خطبہ دیا کرتے۔ شعری ذوق ستھرا، نکھرا ہوا اور شعراء کے اشعار کثرت سے یاد تھے۔ فیصلہ کرتے تو موزوں شعر پڑھ دیتے۔ بہت ذہین تھے۔ دقیق نکتے نکالتے۔ رائے اتنی صائب کہ کئی دفعہ رائے کے موافق آیات قرآنی نازل ہوئیں۔ تقویٰ، پرہیزگاری، اور دیگر صفات کی وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا تھا: **لو کان بعدی نبیا لکان عمر بن الخطاب** (میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے)۔

حضور ﷺ نے فرمایا "اے مسلمانو..... یہ عمرؓ ابن خطاب ہے..... میں اسے اپنا نائب اور مشیر نامزد کرتا ہوں۔ یہ سچ بولتا ہے خواہ کتنا ہی تلخ ہو، شیطان اس سے بھاگتا ہے۔ پتھر اور لوہا اس کے رعب سے پگھل جاتا ہے۔ اہل جنت اس کی توصیف کرتے ہیں۔ ابوبکرؓ دین کا ستون ہے۔ عمرؓ بدعنوانی کا تالا ہے۔ جب تک عمرؓ زندہ ہے، بدعنوانی پیدا نہیں ہو سکتی۔ شیطان عمرؓ کو دیکھ کر منہ کے بل گر جاتا ہے۔"

سیدنا عمر فاروقؓ علوم قرآن و حدیث، فقہ اور علم انساب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اخیر عمر میں متصل روزے رکھنے شروع کر دیے۔ طبیعت میں غرور و تکبر نہ تھا۔ سادگی اور تواضع بے حد تھی۔ آپ کے زمانے میں تاریخ انسانیت کا سب سے اعلیٰ نظام حکومت قائم ہوا۔ آپ نے انتظامی نکتۂ نظر سے سلطنت اسلامیہ کو ۸ صوبوں، اضلاع اور پرگنوں میں تقسیم کیا۔ مختلف محکمے قائم کیے۔ عدلیہ کا نظام وضع کیا اور حقیقی معنوں میں اسلامی رفاہی مملکت کا قیام عمل میں آیا۔

آپ کے زمانے میں اسلامی حکومت ۱۰ لاکھ مربع میل یومیہ کے حساب سے ایران، شام، عراق، فلسطین، طبرستان، اصفہان، کرمان، مکران، سیستان، آذربائیجان، آرمینیا، خراسان اور دیگر علاقوں پر قائم ہو چکی تھی۔ مزاج کے تیز تھے لیکن حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صحبت میں اعتدال پیدا ہوا۔ مغیرہؓ بن شعبہ کے مجوسی غلام فیروز کنیت "ابولولو" نے اپنے حق میں فیصلہ نہ دینے کے باعث نماز فجر کے دوران قاتلانہ حملہ کیا۔ ۳ دن بعد شہادت کے منصب پر فائز ہوئے۔ حضرت صہیبؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا ابو حامد محمد الغزالیؒ نے

1 بدخُلقی سے دشمنی پیدا ہوتی ہے اور دشمنی سے جفا کاری۔

2 گری ہوئی چیز کا بغیر اطلاع قبضے میں کر لینا، لوٹنے کے مانند ہے۔

3 تکلّف کی زیادتی محبّت کی کمی کا باعث بن جاتی ہے۔

4 غریب مہمان آجائے تو قرض لے کر بھی تکلّف کر۔

5 سب سے بڑی دولت زبان ذاکر، دل شاکر اور زنِ فرمانبردار ہے۔

6 بدعتی، ظالم، فاسق اور متکبّر کی دعوت قبول مت کرو۔

7 مالِ حرام سے صدقہ دینے والا، ناپاک کپڑا پیشاب سے دھونے والے کی مثل ہے۔

8 اہل وعیال کے لیے کسب حلال کرنا ابدالوں کا کام ہے۔ ان کو صلاحیت سے رکھنا اور ادب سکھانا جہاد سے افضل ہے۔

9 قرض ادا کرنے کے لیے زرِ نقد کا پاس ہونا ضروری نہیں، اگر مال رکھتا ہو تو اس کو فروخت کر کے ادا کرنا ضروری ہے۔

آپؒ ۱۰۵۶ء میں ایران کے صوبے خراسان کے شہر طوس میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد فوت ہو گئے تو ان کی پرورش والد کے دوست نے کی۔ ۱۰۷۰ء میں گورگان میں مدرسہ میں داخلہ لیا۔ تھیولوجی، علم کلام، فلسفہ، منطق، فقہ، اسلامی قانونیات میں مہارت حاصل کی۔ فلسفیوں کی بے ربط گفتگو، خوشی کی ماہیت پر غور و خوض کیا۔ بعض ماہرین کے مطابق اسلامی تاریخ میں حضور ﷺ کے بعد سب سے زیادہ اثر امام غزالی کا تھا۔ بعض لوگوں کے نزدیک امام غزالی اسلامی سائنسی ارتقاء کو نقصان پہنچانے والا گردانتے ہیں۔

۲۳ سال کی عمر میں ۱۰۹۰ء میں نیشاپور میں ابوالمعالی جوانی امام الحرمین کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۰۹۶ء میں آپ نے دمشق، یوروشلم پھر مدینہ اور مکہ کا سفر اختیار کیا۔ اس کے بعد طویل عرصے تک طوس میں مقیم رہے۔ نظام الملک نے ان کے علم اور شخصیت سے متاثر ہو کر جامعۂ نظامیہ میں تدریس کے فرائض سونپے۔ جہاں وہ ۳۰۰ سے زائد طلبہ کو درس دیتے تھے۔ دینی و علمی مباحث کے باعث ان کی شہرت پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئی۔ آپ نے کچھ عرصہ تک نیشاپور کے مدرسۂ نظامیہ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ ۱۰۹۵ء میں آپ کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔ اپنی دولت غریبوں میں تقسیم کر کے تصوف کی طرف مائل ہو گئے اور مکہ چلے گئے۔

امام غزالیؒ نے نو افلاطونیت (افلاطونی فکر کے ساتھ مشرقی تصوف کی آویزش جو پلوٹینس کے پیروؤں نے یونانی زبان اور تمدن کی بنیاد پر تیسری صدی میں کی) کو باطل ثابت کیا اور اس کے آگے بند باندھا۔ انھوں نے مسلمہ اسلامی عقائد کا صوفی ازم سے ارتباط پیدا کیا۔ اگرچہ اسلام کے بنیادی عقائد پر سختی سے عمل کرنے والے اور تصوف کا راستہ اختیار کرنے والے اپنے اپنے مسالک پر عمل پیرا رہے، لیکن دونوں نے ایک دوسرے کا احترام کیا۔ پھر بھی دین میں الجھنیں پیدا کرنے والے اپنا کام کرتے رہے۔

■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۷۵

سالہ "باباجی" توقیر حسین اس عمر میں بھی بڑے چاق و چوبند ہیں۔ وہ اپنے گھر کے بھی اکثر کام کرتے ہیں۔ ضرورت پڑے تو بازار بھی چلے جاتے ہیں۔ ورنہ اس عمر میں اکثر مرد وزن کی ہڈیاں اتنی کمزور ہوجاتی ہیں کہ ان کے لیے دو قدم چلنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ توقیر حسین کی ہڈیوں کی مضبوطی کا راز یہ ہے کہ وہ باقاعدگی سے ایسی غذائیں کھاتے ہیں جن میں کیلشیم اور وٹامن ڈی موجود ہو۔

ہڈیاں مضبوط کرنے میں ان دونوں غذائی عناصر کا بنیادی کردار ہے۔ کیلشیم ہماری ہڈیاں طاقتور بناتا جبکہ وٹامن ڈی کی بدولت کیلشیم انسانی جسم میں بہ سہولت جذب ہوتا ہے۔ یہ وٹامن ہڈیوں کی نشوونما میں بھی سودمند ہے۔

بچوں اور نوجوانوں کو یہ دونوں غذائی عناصر ضرور لینے چاہئیں کیونکہ تب ہڈیاں بڑھ رہی ہوتی ہیں۔ تاہم ادھیڑ عمری اور بڑھاپے میں بھی ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر بڑھاپے میں بیشتر مرد و زن ہڈیوں کی ایک بیماری "بوسیدگی استخوان" (Osteoporosis) کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اس بیماری میں ہڈیاں رفتہ رفتہ نہایت کمزور ہوجاتی ہیں۔ تاہم انسان غذاؤں یا ادویہ کے ذریعے وافر کیلشیم اور وٹامن ڈی لے، تو ہڈیاں جلد بھربھری نہیں ہوتیں اور یوں ان کے ٹوٹنے کا خطرہ کم ہوجاتا ہے۔

ماہرین طب کے مطابق ۵۰ سال کی عمر تک مرد وزن کو روزانہ ۱۰۰۰ ملی گرام کیلشیم جبکہ ۲۰۰ عالمی یونٹوں کے وٹامن ڈی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ ۵۰ سال سے زائد عمر کے مرد وزن کے لیے لازم ہے کہ وہ روزانہ ۱۲۰۰ ملی گرام کیلشیم جبکہ ۴۰۰ سے ۶۰۰ عالمی یونٹ وٹامن ڈی استعمال کریں۔

ذیل میں ایسی غذاؤں کا ذکر ہے جن میں دونوں غذائی عناصر وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ بازار میں ایسی گولیاں دستیاب ہیں جن میں کیلشیم اور وٹامن ڈی ہوتا ہے، تاہم ڈاکٹر غذاؤں میں موجود فطری غذائی عناصر کو ترجیح دیتے ہیں۔

دہی

وٹامن ڈی کے سلسلے میں قباحت یہ ہے کہ وہ بہت کم غذاؤں میں پایا جاتا ہے۔ یہ وٹامن بنیادی طور پر سورج کی روشنی سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ کوئی انسان پندرہ بیس منٹ روزانہ دھوپ میں کھڑا ہو، تو اُسے وٹامن ڈی کی مطلوبہ مقدار مل جاتی ہے۔

مغربی ممالک میں مسئلہ یہ ہے کہ موسم سرما اور برسات کے دوران وہاں اکثر سورج نہیں نکلتا۔ چنانچہ وہاں ایسا دہی سامنے آیا ہے جس میں مصنوعی وٹامن ڈی شامل کیا جاتا ہے۔ چونکہ دہی میں قدرتاً وافر کیلشیم ہوتا ہے، لہٰذا انسانی صحت کے لیے وہ سہ آتشہ بن گیا۔

اس خاص دہی کا صرف ایک پیالہ کیلشیم کی روزانہ ۳۰ فیصد جبکہ وٹامن ڈی کی ۲۰ فیصد ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ ہمارے ہاں عام دستیاب دہی میں کیلشیم تو خاصا ملتا ہے، البتہ وٹامن ڈی کی بہت کم مقدار ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے یہ سوچ کر نہ کھائیے کہ وہ وٹامن ڈی کی مطلوبہ ضرورت پوری کر دے گا۔

دُودھ

دنیا کی تمام غذاؤں میں سب سے زیادہ کیلشیم دودھ ہی میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ایک گلاس دودھ کیلشیم کی ۳۰ فیصد روزانہ ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ اگر

یہ دودھ چکنائی سے پاک ہو، تو اچھا ہے کہ یوں انسان کو محض ۹۰ حرارے (کیلوریز) ملتے ہیں۔ مغربی ممالک میں اب دودھ میں بھی مصنوعی وٹامن ڈی شامل کیا جا رہا ہے تاکہ اُسے زیادہ غذائیت بخش بنایا جا سکے۔

پنیر

پنیر دہی سے بھی زیادہ کثیف ہوتا ہے۔ اسی لیے اس میں سب سے زیادہ کیلشیم ہوتا ہے۔ اگر انسان محض ۱.۵ اونس پنیر کھالے، تو اُسے ۳۰ فیصد کیلشیم مل جاتا ہے لیکن پنیر ہضم کرنا کٹھن مرحلہ ہے، اسی لیے اُسے کثیر مقدار میں کھانے کی کوشش نہ کریں۔ پنیر کی معتدل مقدار ہی

فائدہ پہنچاتی ہے۔ پنیر میں وٹامن ڈی کی بھی معمولی مقدار ملتی ہے۔ تاہم وہ اس غذائی عنصر کی مطلوبہ ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔ لہٰذا وٹامن ڈی کے معاملے میں محض پنیر پر بھروسا مت کریں۔

مچھلی

سالمن، سارڈین اور ٹونا وہ سمندری مچھلیاں ہیں جن میں وٹامن ڈی کثیر مقدار میں ملتا ہے، تاہم پاکستانی سمندروں میں یہ مچھلیاں کم ہی ملتی ہیں۔ گو ڈبوں میں

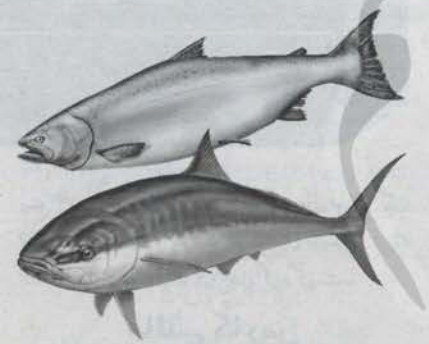

دستیاب ہیں لیکن مہنگا ہونے کے باعث امیر لوگ ہی انھیں کھا سکتے ہیں۔ دیگر مچھلیوں میں وٹامن ڈی اتنا زیادہ نہیں پایا جاتا۔

انڈے

گو ایک انڈہ ہمیں صرف ۶ فیصد وٹامن ڈی مہیا کرتا ہے، لیکن یہ ایک عام دستیاب غذا ہے۔ پھر اسے پکانا بھی آسان ہے۔ واضح رہے کہ وٹامن ڈی زردی میں ہوتا ہے، لہٰذا جو مرد وزن دو تین انڈے کھانا چاہیں، وہ سفیدی نہ کھائیں۔ یوں انھیں کم حرارے ملیں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساگ

سبزیوں میں کیلشیم سب سے زیادہ ساگ میں ملتا ہے۔ چنانچہ جو افراد دودھ پینے کے شوقین نہیں، وہ ساگ

سے مطلوبہ کیلشیم حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک پیالی ساگ ہمیں ۲۵/فیصد کیلشیم فراہم کرتا ہے نیز یہ سبزی ریشہ (فائبر)، فولاد اور وٹامن اے کی خاصی مقدار بھی رکھتی ہے۔

مالٹے کا رس

آج کل بازار میں مالٹے کے ذائقے والے ایسے ادویاتی رس دستیاب ہیں جن میں وٹامن سی کے علاوہ کیلشیم اور وٹامن ڈی بھی شامل ہوتا ہے۔ ان مشروبات میں وٹامن سی شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ غذائی عنصر بھی کیلشیم جسم انسانی میں جذب کراتا ہے۔ چنانچہ اس کی غذائی اہمیت بھی مسلم ہے۔

تھکن کی کیا وجہ ہے؟

دورِ جدید میں تھکن اور جسمانی درد سیکڑوں مرد و زن کو نشانہ بناتا ہے۔ اب ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ خصوصاً خواتین میں تھکن کی ایک وجہ فولاد کی کمی ہو سکتی ہے۔ (وہ اس لیے کہ حیض کے دوران بہت سا خون نکلنے کے بعد جسم میں فولاد کی مقدار کم ہو جاتی ہے) یاد رہے، ہر انسان کو کم از کم ۱۸/ملی گرام فولاد روزانہ درکار ہوتا ہے۔

ایک تجربے میں سوئٹزرلینڈ کی لوزین یونیورسٹی میں ۲۰۰/خواتین کو ۳/ماہ تک ۸۰/ملی گرام فولاد کی گولیاں کھلائی گئیں۔ یہ خواتین تھکن، سستی اور غنودگی کا شکار تھیں۔ ۳/ماہ بعد دیکھا گیا کہ ۹۰/فیصد خواتین میں ۵۰/فیصد تک تھکن کم ہو گئی۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایام بند ہونے سے قبل خواتین میں کمی فولاد تھکن کی ایک اہم وجہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ تھکن مختلف جسمانی وجوہ کے باعث جنم لیتی ہے، لہٰذا اصل وجہ تک پہنچنے کے لیے جسمانی معاینہ ضروری ہے۔ مزید برآں جسم میں فولاد کی زیادتی ہو جائے تو یہ بھی بڑا خطرناک امر ہے۔ ایسی صورتِ حال میں کوئی عضو بھی خراب ہو سکتا ہے۔

چکنائیاں جو کھانی چاہئیں

ماہرین غذائیات کا کہنا ہے کہ حراروں کی روزانہ انسانی ضرورت میں سے ۲۰/ تا ۳۰/فیصد حرارے چکنائیوں سے آنے چاہئیں۔ ایک عام انسان کو روزانہ ۲۰۰۰/حرارے درکار ہوتے ہیں۔ گویا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزانہ ۵۰/تا ۷۰/گرام چکنائی (Fat) غذاؤں سے حاصل کرے۔ یہ واضح رہے کہ چکنائیوں کی ۵/اقسام ہیں۔ ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

سیر شدہ چکنائی

ماہرین طب سیر شدہ (Saturated) چکنائی کو "بُری" چکنائی کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسانی جسم میں اس چکنائی کی زیادتی ہو جائے، تو انسان امراضِ قلب کا نشانہ بن جاتا ہے۔ تاہم جدید تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ بعض سیر شدہ چکنائیاں دل کی بیماریاں پیدا نہیں کرتیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان سیر شدہ چکنائیوں کو ہمارا جسم بہت جلد تحلیل کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ بدن میں لوتھڑے کی صورت نہیں جمتیں۔ ماہرین کی رو سے اب وہ چکنائی حقیقی سیر شدہ اور "بُری" ہے جو کمرے کے درجہ حرارت میں ٹھوس بن جائے۔ لہٰذا ایسی چکنائی کم ہی استعمال کیجیے۔

سیر شدہ چکنائی کی غذائیں

ایک چمچ نمکین مکھن (۱۲/گرام چکنائی، ۱۰۲/حرارے)، ایک چمچ ناریل کا تیل (۱۴/گرام چکنائی، ۱۱۷/حرارے)، ۸/اونس کم چکنائی والا دودھ (۵/گرام چکنائی، ۱۲۲/حرارے)، ۳/اونس پکا ہوا بڑا گوشت، چربی کے بغیر (۱۳/گرام چربی، ۲۱۲/حرارے)۔

یک نا سیر شدہ چکنائی تیزاب

یہ چکنائیوں کی وہ قسم ہے جو کمرے کے درجہ حرارت میں تیل کی طرح مائع بن جاتی ہے۔ یک نا سیر شدہ چکنائی تیزابوں (Mono unsaturated Fatty Acids) کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جسم میں کولیسٹرول کی سطح معمول پر لاتے ہیں۔ یوں ذیابیطس قسم دوم اور امراضِ قلب چمٹنے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔ یہ چکنائیاں عموماً نباتات میں ملتی ہیں۔

یک نا سیر شدہ چکنائی تیزابوں کی غذائیں

ایک چمچ مکئی، سورج مکھی، سویابین، مونگ پھلی اور دیگر سبزیوں و مغزیات کا تیل (۱۴/گرام چکنائی، ۱۲۰/حرارے)، ایک اونس سورج مکھی کے بھنے بیج (۱۴/گرام چکنائی، ۱۶۵/حرارے)۔

کثیر نا سیر شدہ چکنائی تیزابوں کی غذائیں

Poly unsaturated Fatty Acids

۱۰/بڑے زیتون (۴/گرام چکنائی، ۴۰/حرارے)، ایک چمچ مونگ پھلی کا مکھن (۸/گرام چکنائی، ۹۴/حرارے)، آدھی ناشپاتی (۷/گرام چکنائی، ۸۰/حرارے)۔

اومیگا-۳ چکنائی تیزاب

یہ چکنائیاں ہمیں امراض قلب سے بچاتی ہیں۔ تاہم غذا سے اومیگا-۳ چکنائی تیزاب حاصل کرنا خاصا خرچہ مانگتا ہے مثلاً امراض قلب سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ روزانہ ۵۰۰/ملی گرام یہ چکنائیاں کھائیں۔ گویا آپ کو ہر ہفتے ۳/بار کم از کم ایک کلو مچھلی کھانا ہو گی۔ یہ چکنائیاں بدن کو سوزش سے بھی پاک رکھتی ہیں۔

اومیگا-۳ چکنائی تیزاب کی غذائیں

۳/اونس پکی سالمن مچھلی (۴/گرام چکنائی، ۱۱۴/حرارے)، ایک ڈبا سارڈین مچھلی مع تیل (۱۱/گرام چکنائی، ۱۹۱/حرارے)، ایک اونس اخروٹ (۱۸/گرام چکنائی، ۱۸۵/حرارے)۔

اومیگا-۶ چکنائی تیزاب

چکنائی کی یہ قسم بھی ہمیں امراض قلب سے محفوظ رکھتی ہے۔ مگر قباحت یہ ہے کہ ہمارے جسم میں اومیگا-۳ اور اومیگا-۶ چکنائیوں کی مقدار برابر ہونا ضروری ہے۔ اگر دونوں میں توازن نہ رہے، تو اومیگا-۶ چکنائی کی زیادتی اُلٹا دل کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ امریکا، پاکستان، برطانیہ سمیت بیشتر ممالک میں لوگ اومیگا-۶ چکنائی زیادہ کھاتے ہیں۔ اسی لیے وہ ہمہ قسم کے امراض قلب کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اگر بدن میں اومیگا-۶ اور اومیگا-۳ کی مقدار برابر ہو، تو اول الذکر چکنائی غذا سے زیادہ حیاتین جسم میں جذب کراتی ہے۔

اومیگا-۶ چکنائی تیزاب کی غذائیں

ایک چمچ مارجرین (۱۱/گرام چکنائی، ۱۰۱/حرارے)، ۲/چمچ نباتی تیلوں والا سلاد (۷/گرام چکنائی، ۱۶۳/حرارے)، ایک چمچ بادام کا مکھن (۹/گرام چکنائی، ۹۸/حرارے)۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پانچ صحت بخش غذائیں

کئی غذائیں ایسی ہیں جن میں پوشیدہ غذائیت سے ہم واقف نہیں ہوتے۔ انہی میں سے بعض درج ذیل ہیں۔ انھیں استعمال کیجیے اور اپنی صحت کو فائدہ پہنچائیے۔

1 گھیاکدو کے بیج

انگریزی میں گھیا کدو کے خشک بیج پیپتاس (Pepitas) کہلاتے ہیں۔ ان بیجوں میں کثیر اور یک ناسیر شدہ چکنائی، زنک، کیلشیم، بی وٹامن، فائبر اور مانع تکسید مادے (اینٹی آکسی ڈینٹ) ملتے ہیں۔ بیجوں کو سلاد پر بکھیریے، توے پر تلیے یا پھر یخنی کے اوپر چھڑکیے۔

2 تاہینی- تلوں کا خمیر

تلوں کا گندھا ہوا آٹا یا خمیر انگریزی میں تاہینی (Tahini) کہلاتا ہے۔ اس خمیر میں پروٹین، فائبر، کیلشیم، میگنیشیم، وٹامن ای، پوٹاشیم، زنک اور مانع تکسید ملتے ہیں۔ چنانچہ اسے توس پر لگا کر کھائیے۔ شہد یا کیلے آمیزے میں ڈالیے اور استعمال کیجیے۔

3 خشک آلو بخارا

اس خشک پھل میں فائبر، زنک، فولاد، پوٹاشیم اور مانع تکسید مادے بڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ مزید برآں تمام خشک پھلوں میں یہی سب سے کم حرارے رکھتا ہے۔ انھیں بھی مختلف طرح سے کھانا ممکن ہے، مثلاً چٹنی بنائیے یا پھر ناشتے میں ثابت اناج کے ساتھ کھائیے۔

4 جَو

اس میں حل پذیر فائبر یا ریشہ کثیر مقدار میں ملتا ہے۔ حل پذیر ریشے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جسم انسانی میں کولیسٹرول کم کرتا ہے۔ مزید برآں یہ لذیذ غذا بھی ہے۔ لہٰذا اسے یخنی میں شامل کیجیے، کبھی کبھی چاول کی جگہ اسے کھائیے یا پھر ناشتے میں دہی، پھلوں اور مغزیات کے ساتھ استعمال کریں۔

5 ہلدی

ہمارے ہاں سالن میں اس مسالے کا استعمال عام ہے جو اچھی بات ہے۔ ہلدی کی خاصیت یہ ہے کہ یہ مانع تکسید مادے کثیر تعداد میں رکھتی ہے۔ یہ مانع تکسید انسان میں آزاد اصلیوں (Free Radicals) کا قلع قمع کرتے ہیں۔ واضح رہے، یہی آزاد اصلیے یا برے ایٹم ہمارے بدن میں خلیوں کو مار کر ہمیں بوڑھا کرتے اور آخر کار موت کے منہ میں پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ روزمرہ غذا میں ہلدی شامل رکھیے، یہ ایک صحت بخش غذا ہے۔

■

زندگی کے بارے میں

ناظم حکمت

زندگی کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے

پوری سنجیدگی کے ساتھ زندہ رہنا چاہیے
جیسے کہ گلہری
میرا مطلب ہے زندگی سے آگے یا اوپر کی
کسی چیز کو ڈھونڈے بغیر
میرا مطلب ہے
زندگی تمہاری کل وقتی مصروفیت ہونی چاہیے
زندگی کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے
یہ مکمل سنجیدگی کی طالب ہے
اتنی سنجیدگی اور یہاں تک سنجیدگی
جیسے ہاتھ پیچھے بندھے ہوں
اور پیٹھ دیوار سے لگی ہو
یا پھر جیسے کوئی لیبارٹری ہو
ہمارا سفید کوٹ اور موٹے شیشوں کی عینک ہو
اور تم لوگوں کی خاطر زندگی قربان کرنے کو تیار ہو
اُن لوگوں کی خاطر بھی
جنھیں تم نے کبھی نہیں دیکھا
اور یہ جانتے ہوئے بھی
زندگی بہت بڑی حقیقت
اور دنیا کی خوبصورت ترین اور انمول نعمت ہے
میرا مطلب ہے تمہیں زندگی کے بارے میں
اس قدر سنجیدہ رہنا چاہیے۔
کہ ستر برس کی عمر میں زیتون کے پودے لگا سکو
اس لیے نہیں کہ یہ تمہاری اولاد کے کام آئیں گے
اس لیے کہ تم موت سے ڈرتے ہوئے بھی
موت سے نہیں گھبراتے
اس لیے کہ زندگی موت سے زیادہ وزنی ہوتی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یوں سمجھیں کہ ہم شدید بیمار ہیں
آپریشن کی ضرورت ہے
ہوسکتا ہے ہم سفید میز پر سے دوبارہ
سلامت نہ اٹھ سکیں
اتنی جلدی مرجانے کا اندیشہ تکلیف دہ ہے
اس کے باوجود
ہم لطیفوں اور شگفتہ جملوں پر ہنسیں گے
کھڑکی سے باہر دیکھیں گے
بارش تو نہیں ہو رہی؟
اور بے چینی سے انتظار کریں گے
تازہ ترین خبروں کے بلیٹن کا
یوں سمجھیں کہ ہم محاذِ جنگ پر ہیں
اور یہ جنگ اس قابل ہے کہ لڑی جائے
پہلے ہی حملے میں ہوسکتا ہے کہ
اُسی روز ہم اوندھے منہ گریں اور مرجائیں
اس اندیشے کے باوجود، غصے کے تعاقب میں
فکر ہمیں موت کے منہ تک لے جائے گی
فکر جنگ کے نتیجے کی
جنگ جو کئی سال جاری رہ سکتی ہے
یوں سمجھیں کہ ہم قید میں ہیں

عمر پچاس کے قریب پہنچ چکی ہے
آہنی دروازہ کھلنے کے لیے
ہمیں مزید اٹھارہ سال انتظار کرنا پڑے گا
اس کے باوجود ہم
باہر کی دنیا کے ساتھ زندہ ہوں گے
باہر کی دنیا کے لوگوں اور جانوروں کے ساتھ
جدوجہد اور ہوا کے ساتھ زندہ ہوں گے
میرا مطلب ہے ہم جیسے بھی ہوں، جہاں بھی ہوں
ہمیں اِس طرح زندہ رہنا چاہیے
جیسے ہم کبھی نہیں مریں گے

☆☆

زمین ٹھنڈی ہو جائے گی
ستاروں میں ایک ستارہ
سب سے چھوٹے ستاروں میں سے ایک
نیلے مخمل پر مٹی کا ایک ذرہ
جس پر سونے کا پانی چڑھا ہے
میرا مطلب ہے یہ ہماری عظیم زمین
ایک دن ٹھنڈی ہو جائے گی
مگر برف کے تودے کی طرح نہیں
مردہ بال کی طرح بھی نہیں
ایک خاکی اخروٹ کی طرح
اتھاہ تاریک خلاؤں میں لڑھک جائے گی
اس کی تمھیں ابھی سے فکر ہونی چاہیے
زمین سے اتنی محبت ہونی چاہیے
کہ کل یہ کہہ سکو کہ ''میں زندہ رہا''

ناظم حکمت

ناظم حکمت (۱۹۶۳۔۱۹۰۲ء) ترکی کے عظیم شاعر اور ناول نگار تھے۔ ان کی شاعری کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اپنی اس نظم میں وہ ہمیں پیغام دے رہے ہیں کہ زندگی اپنے تمام دکھوں اور تکلیفوں کے باوجود ایک خوبصورت چیز ہے اور اِسے انسانیت کی خدمت اور اچھے مستقبل کی اُمید کے ساتھ بسر کیا جانا چاہیے۔

کام کی دُنیا

''زندگی اِتنی مختصر ہے کہ یہ کسی طور مناسب نہیں کہ جو کام آپ سارا دن کرتے ہوں، اُسی سے نفرت کی جائے''

عاطف مرزا

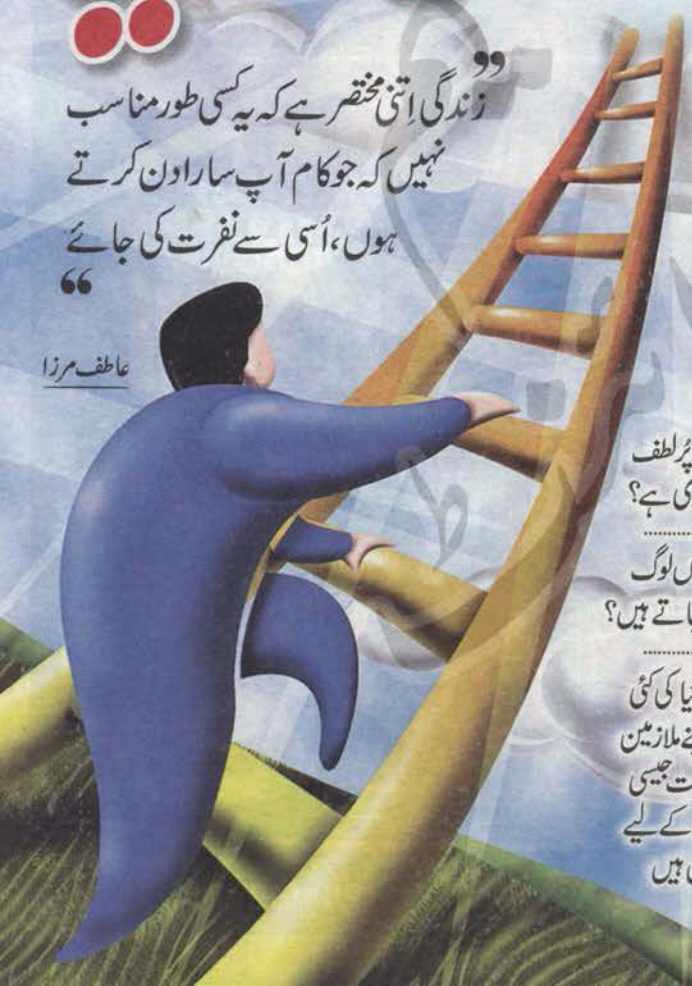

کام (Job) کو پُرلطف بنانا کیوں ضروری ہے؟

کیا ہمارے ہاں لوگ خوشی سے کام پر جاتے ہیں؟

کارپوریٹ دنیا کی کئی کمپنیاں اپنے ملازمین میں سماجی خدمت جیسی سوچ پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم اپنے وقت کا بڑا حصہ روزی کمانے کے لیے کام یا ملازمت کرتے ہوئے گزارتے ہیں۔ آج ہمیں ماضی کے لوگوں کے مقابلے میں کام کو کم وقت دینا پڑتا ہے۔ کام کے بارے میں ہمارا تصور بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کہا جاتا تھا کہ انسان روزی کمانے کے لیے کام بھی کر رہا ہو اور وہ آزاد، مطمئن اور خوش بھی ہو، یہ ۲ر باتیں ناممکن ہیں۔ آج اس تصور کو بھی فروغ مل رہا ہے کہ کام کو ایک بامعنی سرگرمی بنانا ممکن ہے۔ یہ ہماری زندگی میں خوشی، اطمینان اور مقصدیت لاسکتا ہے لیکن ہم میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جو صبح کام پر جاتے ہوئے بے دِلی، بوریت اور تناؤ سے دُور ہوں اور دُنیا کو اپنے اور دوسرے لوگوں کے لیے بہتر جگہ بنانے کے عزم سے سرشار ہوں؟ کام اگر ہمارے لیے ایک خوشگوار سرگرمی ہو تو ہماری پوری زندگی پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے جسے اپنی پسند کا کام مل گیا ہو۔

اداروں اور کمپنیوں کا کام کے بارے میں کیا تصور ہوتا ہے؟ کام کا اچھا ماحول بنانے میں اس تصور کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ اسی طرح ملازمین کام کو بامقصد بنانے کے لیے کتنے سنجیدہ ہیں، یہ چیز بھی کام کو پُرلطف بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

کام کرنے کی اچھی جگہ پر اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ملازمین کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ انھیں اپنے خیالات سامنے لانے اور تخلیقی سوچ کے اظہار کا موقع دیا جاتا ہے۔ وہاں ملازمین کو نئی چیزیں سیکھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ انھیں کچھ حاصل ہونے کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ جب ملازمین کو یہ چیزیں ملتی ہیں وہ اداروں کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

میڈیا کے کئی بڑے ادارے ایسی فہرستیں شائع کرتے ہیں جن میں ان کمپنیوں کی درجہ بندی کی جاتی ہے جو ملازمین کا خیال رکھنے میں سب سے آگے ہوں۔ بہت سی کمپنیاں اور ادارے پیداواریت (Productivity) بڑھانے پر تو زور دیتے ہیں لیکن کام کو ایک پُرلطف سرگرمی بنانا ان کی ترجیحات میں شامل نہیں ہوتا۔

کارپوریٹ دنیا پر ایک نظر دوڑائی جائے تو ہمیں ایسی کئی کمپنیاں ملیں گی جو اپنے ملازمین کے کام کو پُرلطف بنانے اور اس میں لوگوں کی خدمت جیسی مقصدیت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے آگے بڑھنے کے امکانات پیدا کرتی ہیں۔

گوگل کمپنی انٹرنیٹ کی دنیا کا بڑا نام ہے۔ یہ اپنی جدت پسندی اور ملازمین کے لیے کام کا خوشگوار ماحول پیدا کرنے کے حوالے سے سب سے آگے تسلیم کی جاتی ہے۔ ۱۳ر سال قبل اس نے ایک چھوٹی کمپنی کی حیثیت سے اپنا سفر شروع کیا۔ آج اس کے ملازمین کی تعداد ۳۰ر ہزار سے زائد ہے اور دنیا میں اس کے ۶۰ر دفاتر ہیں۔

گوگل کا ہیڈ کوارٹر وسیع و عریض رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں رنگ برنگی سائیکلیں کھڑی ہوتی ہیں تاکہ ملازمین انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے استعمال کرسکیں۔ کمپنی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے کچن بنائے گئے ہیں تاکہ جب بھی کسی ملازم کو بھوک لگے وہ کچن میں جا کر کچھ کھا پی سکے۔ کمپنی میں ۱۰۰ر سے زائد ایسے کچن موجود ہیں۔ ان کے علاوہ وہاں کئی بڑے کیفے اور ریسٹورنٹ بھی موجود ہیں۔ کمپنی میں ملازمین کے لیے ۶ر جم بھی بنائے گئے ہیں۔ وہاں ملازمین کے لیے واشنگ مشین اور ڈرائیر بھی موجود ہوتے ہیں تاکہ وہ کام کے ساتھ ساتھ اپنے کپڑے دھونا چاہیں تو انھیں استعمال کرسکیں۔ گوگل کمپنی میں کام کا ماحول بڑا لچک دار ہے۔ انجینئر ٹیبل ٹینس کھیلتے ہوئے بھی کسی نئے منصوبے پر بات چیت کرسکتے ہیں۔

گوگل کمپنی کے ۲۰ر فیصد کے قانون کے مطابق ملازمین اپنے وقت کا ۲۰ر فیصد اپنی مرضی سے کسی ایسے پروجیکٹ کو دے سکتے ہیں جو کمپنی کے لیے فائدے مند ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گوگل کا کہنا ہے کہ ہم نے اپنا آفس ایسا بنایا ہے کہ ملازمین ایک دوسرے سے اپنے خیالات کا اظہار با آسانی کر سکیں۔ گوگل کی بنیاد اس تصور پر رکھی گئی کہ کام سے ملازمین کو اپنے جوہر دکھانے کی تحریک ملے اور وہ کام کو ایک دلچسپ چیلنج سمجھیں

سکتا ہے۔ گوگل کی ای میل کی سہولت جی میل اور گوگل نیوز جیسی کئی چیزیں اسی ۲۰ رفیصد وقت میں سامنے آئی ہیں۔ کام کے اسی اچھے ماحول کی وجہ سے گوگل کمپنی کو ہر سال لاکھوں افراد ملازمت کے لیے اپنے کوائف بھیجتے ہیں۔

آئی ٹی کمپنی ان ٹیل اپنے لوگوں کو ۱۸ر یا ۲۴ر مہینوں کے بعد نئی پوزیشن پر لے جاتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف شعبوں کے بارے میں نئی نئی چیزیں جان سکیں۔ نئے آنے والوں کو کہا جاتا ہے آپ کی اگلی ۵ر ملازمتیں ہمارے ساتھ ہوں گی۔

میریٹ انٹرنیشنل ہوٹل اپنے ملازمین کے لیے ایسے مواقع پیدا کرنے کی کوشش میں رہتا ہے کہ وہ اگلی پوزیشنوں پر جاسکیں۔ اس میں ۳ر ہزار مینیجرز نے معمولی پوزیشنوں سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ ارنسٹ اینڈ ینگ (Ernst and young) نامی کمپنی کے ملازمین نے ایک دن میں ۳۸ر ہزار گھنٹے رضا کارانہ کام کے لیے صرف کیے۔

سافٹ وئیر کی معروف کمپنی سیلز فورس اپنی رفاہی خدمات کے حوالے سے مشہور ہے۔ یہ اپنے ملازمین کو سماجی خدمت کے مواقع فراہم کرتی رہتی ہے۔ ہر ملازم کو سال میں تنخواہ کے ساتھ ۶ر دن ملتے ہیں کہ وہ کسی رفاہی سرگرمی میں حصہ لے سکے۔

انٹیوٹ (Intuit) کمپنی جدت پسندی کو فروغ دینے کے لیے اپنے ملازمین کو اپنی مرضی کے منصوبے پر کام کرنے کے لیے ہفتے میں ۴ر گھنٹے دیتی ہے۔ جنرل ملز فوڈ کی کمپنی ہے۔ یہ کہتی ہے کہ ہم لوگوں کو جاب کے بجائے کیریئر فراہم کرتے ہیں۔ اس کے ۸۵ر فیصد آفیسرز نے اسی کمپنی میں چھوٹی پوزیشنوں سے کام شروع کیا تھا۔ امپکوا بینک (Umpqua) کا ادارہ اپنے ملازمین سے کہتا ہے کہ وہ سال میں ۴۰ر گھنٹے رضا کارانہ طور پر سماجی خدمت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے وقف کر سکتے ہیں اور اس کا انھیں معاوضہ بھی ملتا ہے۔

ای او جی ریسورسز (EOG) آئل کمپنی ہے جو ہر سال اپنے ملازمین کو گھر والوں کے ساتھ ایک تقریب میں مدعو کرتی ہے جہاں ان کے تعاون کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ ٹمبرلینڈ (Timberland) اور پرائس واٹر ہاؤس کوپرز بھی ۲/ایسی کمپنیاں ہیں جو ملازمین کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں کہ وہ سماجی خدمت کے کام بھی کریں۔

اداروں کے لیے اپنی اقدار اور ویژن کا تعین کرنا بہت اہم ہے۔ اس سے انھیں سوچنے کا موقع ملتا ہے کہ کیا ادارے کا مقصد محض نفع کمانا ہے اور وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ بہتر معاشرہ کیسا ہوگا اور اس میں ان کا کیا کردار ہوگا۔ اداروں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ملازمین کو ان اقدار اور ویژن کی تعلیم بھی دیتے رہیں۔ اقدار اور ویژن کے حوالے سے ایک دلچسپ مثال ہولسٹی (Holstee) کے بارے میں مشہور ہے۔ یہ کمپنی کپڑا فروخت کرتی ہے۔ یہ اپنی مشن سٹیٹمنٹ کو ایک پوسٹر کی شکل میں سامنے لے کر آئی جس میں اُس نے اپنی اقدار کے بارے میں لکھا۔ اس میں اس بات کا اظہار کیا گیا کہ کمپنی نفع کمانے کے علاوہ زندگی اور کامیابی کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ یہ مشن سٹیٹمنٹ اتنی مقبول ہوئی کہ لوگ ان کی اصل پراڈکٹ کے بجائے کمپنی کو اسی حوالے سے زیادہ جانتے ہیں۔ اسے انٹرنیٹ پر ۵۰ملین سے زائد بار دیکھا گیا اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔

ترقی پذیر ممالک کے اداروں کے پاس اگرچہ وسائل محدود ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود کام کے بارے میں اچھا ویژن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے کام ایک ایسی سرگرمی بن جاتا ہے جس سے نفع بھی حاصل ہو اور سماجی بھلائی کی سوچ کو بھی فروغ ملے۔

اگر ملازمین کو اچھا معاوضہ اور سہولتیں مل بھی جائیں تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کام ان کے لیے پُرلطف سرگرمی ہوگا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ وہ کام کے بارے میں ایک اچھا ذہنی رویہ بھی اپنائیں۔ انھیں کام کے لیے ایک

سافٹ ویئر کی کمپنی سیلزفورس اپنے ملازمین کو سماجی خدمت کے مواقع بھی فراہم کرتی رہتی ہے ہر ملازم کو سال میں تنخواہ کے ساتھ ۶/دن ملتے ہیں کہ وہ کسی رفاہی سرگرمی میں حصہ لے سکے

بڑا ویژن سامنے رکھنا ہوگا تاکہ اس میں ایک مقصدیت پیدا ہو۔ انھیں دیکھنا ہوگا کہ وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کے لیے اپنے کام کے ذریعے کتنا مفید بن رہے ہیں یا ان کی وجہ سے معاشرے کی اجتماعی تصویر میں کیا بہتری آ رہی ہے۔

بہت سے لوگ کام کو اپنے لیے ایک بوجھ سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے اختیار میں ہو تو وہ ایک دن کے لیے بھی کام پر نہ جائیں۔ درحقیقت زندگی میں مقاصد جتنے اعلیٰ ہوں اس میں پریشانی اور تناؤ اسی حد تک کم ہو جاتے ہیں۔ اس حوالہ سے روچسٹر یونیورسٹی (Rochester University) میں ایک دلچسپ تحقیق کی گئی۔ محققین نے طالب علموں سے ان کی زندگی کے مقاصد کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں۔ تقریباً ۲/سال کے بعد ان طالب علموں سے جب وہ عملی زندگی میں کام کر رہے تھے ان کے مقاصد کی کامیابی کے حوالے سے بات چیت کی گئی۔ تحقیق سے یہ سامنے آیا کہ جن طالب علموں کے مقاصد میں اپنی زندگی اور سوچ کو بہتر بنانا اور دوسروں کی زندگیوں میں مثبت تبدیلی لانا جیسے عزائم شامل تھے، وہ یونیورسٹی کے دنوں کی نسبت زیادہ مطمئن تھے اور ان کی زندگی میں تناؤ کم تھا۔ اس کے برعکس جن طالب علموں کے مقاصد دولت اکٹھی کرنا، شہرت پانا تھے، وہ دولت تو حاصل کر رہے تھے لیکن وہ یونیورسٹی کے دنوں میں جتنے خوش تھے آج اتنے خوش نہیں تھے۔ ان کی زندگی میں بے چینی اور تناؤ تھا۔ گویا وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”خود کو اتنا حقیر مت سمجھیں کہ آپ کے نزدیک ایک دن کے کام کا مطلب ایک دن کی تنخواہ ہو یعنی معاوضہ <==> کام۔ میں زندگی کے بارے میں ایسی سوچ اپنانے سے نفرت کرتا ہوں۔ یہ ہمیں بے حیثیت بنا دیتی ہے۔ اس سادہ فارمولے سے میری نفرت کی وجہ یہ ہے کہ کیا آپ خود کو بے حیثیت سمجھ کر اتنا سستا فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اپنی زندگی کا ایک پورا دن جو کبھی واپس نہیں آئے گا اتنی تھوڑی رقم کے لیے گروی رکھ دیں گے۔ جس لمحہ آپ اپنے وقت کو محض رقم کے لیے فروخت کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں تو آپ وہ آرٹسٹ نہیں رہتے جو آپ بن سکتے ہیں۔“ (سیتھ گوڈن)

اپنے مقاصد تو حاصل کر رہے تھے لیکن ان کی خوشی میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔

جب کام میں بوریت اور تناؤ ہو تو بہت کچھ بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کام اور ملازمت کا واحد مفہوم اگر تنخواہ حاصل کرنا ہو تو یہ ایک ناپسندیدہ چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ سیتھ گوڈن (Seth Godin) مارکیٹنگ کی دنیا کا بڑا نام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم خود کو ایک ایسا آرٹسٹ سمجھیں جو اپنے اندر موجود خوبیوں اور صلاحیتوں کو گفٹ کی طرح سمجھتا ہے تو ہمارے نزدیک کام کا واحد مفہوم تنخواہ حاصل کرنا نہیں ہوگا۔ اس حوالے کے لیے وہ دنیا کے ایک بڑے فوٹوگرافر کی مثال دیتا ہے جس کا کام سب کے لیے مفت دستیاب ہے۔ وہ اپنے کام کو گفٹ سمجھتا ہے جسے وہ دنیا کے ساتھ شیئر کرتا ہے۔ اس کام کے علاوہ اس کے پاس ایسے کام کی بھی کمی نہیں جس کا اسے معقول معاوضہ ملتا ہے۔ جس کام سے آمدن بھی ہو رہی ہو اور آپ اس حوالے سے اچھا محسوس کر رہے ہوں کہ اس سے معاشرے میں کوئی بہتری آ رہی ہے تو ایسا کام خوشگوار ہوتا ہے۔ ہمیں اسی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے کام کا جائزہ لینا چاہیے۔

جب کام ہمیں پسند ہو تو اس میں ہماری کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔ اچھے ملازم ڈھونڈتے ہوئے بھی اسی سوچ کو سامنے رکھنا چاہیے۔ معروف فلاسفر ہنری ڈیوڈ تھورو کا کہنا ہے کہ اُس شخص کو ملازم نہ رکھو جو دولت کے لیے کام کرے بلکہ اسے ملازم رکھو جو کام کی محبت میں کام کرنا چاہے۔ زے پوز (Zappos) جوتے فروخت کرنے والی

کوئی ایسا کام ڈھونڈ لیں جسے آپ پسند کرتے ہوں۔ اِس طرح آپ کو ایک دن کے لیے بھی کام نہیں کرنا پڑے گا

امریکی کمپنی ہے۔ یہ کمپنی Motivated لوگوں کو ڈھونڈنے پر یقین رکھتی اور اِس کے لیے ایک دلچسپ طریقہ اختیار کرتی ہے۔ کمپنی منتخب ہونے والے ملازمین کو ایک ہفتے کی ٹریننگ دیتی ہے۔ اس ٹریننگ کے بعد انھیں آپشن دی جاتی ہے کہ اگر وہ کمپنی کے ساتھ نہیں چل سکتے تو وہ کمپنی چھوڑ سکتے ہیں اور کمپنی انھیں ۲ ہزار ڈالر کی رقم بھی دیتی ہے۔

کام میں دلچسپی ہو تو انسان اسے بہتر سے بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ مقبول مصنف گبریل گارشیا مارکیز کے بارے میں جیرالڈ نے زبردست کتاب لکھی۔ جیرالڈ کی اپنے کام سے لگن ایسی تھی کہ ایک رات اس نے اُس قصبے میں ایک بچ پر بھیگتے ہوئے گزار دی جہاں مارکیز پیدا ہوا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اس علاقے کے احساس کو اپنے اندر سمو سکے۔

امریکا کے نامور مصنف نیل گیمن (Neil Gaiman) کہتے ہیں کہ جب میں کسی چیز کو ایڈونچر سمجھتا تھا تو اُسے پوری لگن سے کرتا تھا۔ جس دن مجھے لگنا تھا کہ میں کام کر رہا ہوں اسی دن میں اس سے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ ■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیل
بونس
مفت

پاکستان کے آن لائن سپر سٹور

ارشاد حسین

خریداری آسان بنانے والی دُنیائے انٹرنیٹ کی دُکانیں جہاں ہمہ رنگ سامان دستیاب ہے

آغاز میں ہمارے ہاں آن لائن شاپنگ کا تصور الیکٹرونکس آلات کی خریداری تک محدود تھا اور لوگ صرف لیپ ٹاپ، موبائل فون، کیمرے اور اسی طرح کی دیگر اشیا خریدتے تھے لیکن اب رجحان بدل رہا ہے۔ کپڑے، کاسمیٹکس اور جیولری بھی آن لائن فروخت ہو رہی ہے۔ پاکستان میں اس بزنس کا آغاز سست رفتاری سے ہوا لیکن انٹرنیٹ کی مقبولیت اور بہتر رسائی سے اب صورت حال بدل رہی ہے۔ ماضی میں لوگ آن لائن ادائی کرتے ہوئے خود کو غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ اب کوریئر کمپنیوں کی طرف سے کیش آن ڈلیوری کی سہولت سے خریداروں کا اعتماد بحال ہوا ہے اور خریدی گئی اشیا گھر کی دہلیز تک پہنچ رہی ہیں۔ ماہرین کے مطابق آن لائن سٹورز کا رجحان تیزی سے بڑھے گا۔ انٹرپرینوئیر بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے اور نئے بزنس شروع کر رہے ہیں۔ یہ بزنس مارکیٹنگ کے لیے سوشل میڈیا کی طرف بھی رخ کر رہے ہیں۔ پاکستان میں جب اے ٹی ایم مشین کا تصور متعارف کرایا گیا تو شروع میں اسے بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اب یہ ایک اہم ضرورت بن گئی ہے۔

دُنیا بھر میں انٹرنیٹ کے ذریعے اشیا کی خریداری کا رجحان بڑھ رہا ہے، کیونکہ یہ آسان طریقہ ہے اور پھر وقت بھی کم لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیائے انٹرنیٹ میں ایسے کئی سپر اسٹور یا آن لائن دکانیں وجود میں آ چکی ہیں جہاں مختلف اقسام کی ہزارہا اشیا دستیاب ہیں۔ اب منٹوں میں کوئی شے پسند کیجیے، اس کی خصوصیات کا مطالعہ کیجیے اور آرڈر دے دیجیے۔ وہ آپ کو اگلے ۲۴ گھنٹے میں مل جائے گی۔ یوں آپ ان تمام مشکلات سے چھٹکارا پالیں گے جو عموماً خریداری کرتے وقت پیش آتی ہیں۔

دوسروں کی دیکھا دیکھی پاکستان میں بھی ایسے آن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لائن سٹور وجود میں آچکے جو پاکستانیوں کو مختلف اشیا کی تفصیل فراہم کرتے، پھر آرڈر لیتے اور مطلوبہ شے گھر تک پہنچا دیتے ہیں۔ بعض سٹور کوئی بھی شے خریدنے یا فروخت کرنے کی مفت سہولت بھی فراہم کرتے ہیں۔ ایسے آن لائن سٹوروں میں دنیا بھر کا ہمہ رنگ سامان برائے فروخت موجود ہے۔ ذیل میں بڑے سٹوروں کا تعارف پیش ہے۔

ہوم شاپنگ ڈاٹ کام

اس ویب سائٹ کا دعویٰ ہے کہ یہ سب سے بڑا پاکستانی آن لائن سٹور ہے۔ ہوم شاپنگ ڈاٹ کام (Homeshopping.com) میں موبائل فونوں، گھڑیوں، کیمروں اور دیگر الیکٹرونکس آلات، ملبوسات اور زیورات کی وسیع ورائٹی موجود ہے۔ ویب سائٹ کا انٹرفیس دوستانہ اور آرڈر دینے کا طریق کار بھی بہت آسان ہے۔

ہوم شاپنگ کی خصوصیات یہ ہیں کہ پاکستان میں اس کے ارکان ایمیزن ڈاٹ کام اور ای بے (E Bay) سے بھی اشیا خرید سکتے ہیں۔ آرڈر دینا آسان ہے۔ ایک شے پسند کیجیے، اس کی قیمت ادا کیجیے اور وہ پاکستان میں کسی بھی جگہ آپ تک پہنچ جائے گی۔ آپ چاہیں، تو ڈلیوری کے وقت بھی رقم ادا کر سکتے ہیں۔

شاپ ہائیو ڈاٹ کام

پاکستانیوں میں یہ آن لائن سٹور بھی مقبول ہے جو ۲۰۰۶ء سے کام کر رہا ہے۔ اس میں زیادہ تر الیکٹرونکس سامان برائے فروخت موجود ہے۔ شاپ ہائیو ڈاٹ کام (Shophive.com) وقتاً فوقتاً بہترین ڈیل پیش کرتی ہے تاکہ گاہکوں کو رجھا سکے۔ اس میں بھی خریداری کا طریق کار سادہ ہے۔ یہ سٹور اپنے باقاعدہ گاہکوں کو کئی سہولیات فراہم کرتا ہے۔

او۔ایل۔ایکس ڈاٹ کام

یہ پاکستانی دنیائے انٹرنیٹ میں آنے والا نیا آن لائن سٹور ہے تاہم اس نے لاکھوں پاکستانیوں کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی ہے۔ او ایل ایکس ڈاٹ کام OLX.com بڑی نیٹ کمپنی ہے اور دنیا کے ۹۶ ممالک میں ۴۵ زبانوں میں اس کی ویب سائٹس موجود ہیں۔

اس سٹور کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ استعمال کنندہ کو کلاسیفائیڈ اشتہاروں کی مفت جگہ فراہم کرتا ہے۔ استعمال کنندہ تصاویر اور ویڈیو کے ذریعے اپنا اشتہار خوبصورت و جاذب نظر بناتا ہے۔ اس سٹور میں کوئی بھی اپنی شے بیچ یا دوسروں کی اشیا خرید سکتا ہے۔

مزید برآں استعمال کنندہ تلاش (Search) کے اوزاروں سے کام لے کر یہ جان سکتا ہے کہ تمام بڑے پاکستانی شہروں میں کون کون سی اشیا برائے فروخت موجود ہیں۔ او ایل ایکس ڈاٹ کام کے شعبہ جات میں کاریں، رئیل اسٹیٹ، ملازمتیں اور گھریلو سامان نمایاں ہیں۔

شاپ اے ہولک ڈاٹ کام

یہ آن لائن ویب سائٹ گاہکوں کو باورچی خانے میں استعمال ہونے والے برقی آلات، ویڈیو پلیئر، استریاں، دفتری سامان، ہار سنگھار کی چیزیں اور سپورٹس کا سامان فروخت کرتی ہے۔ شاپ اے ہولک ڈاٹ (Shopaholic.com) وقتاً فوقتاً اپنے گاہکوں کو خصوصی ڈیل کی بھی پیشکش کرتی ہے۔ تب کسی شے کی قیمت ۲۵ تا ۵۰ فیصد کم کی جاتی ہے۔

وی مارٹ ڈاٹ کام

پاکستان کے ایک اور عمدہ آن لائن سٹور وی مارٹ ڈاٹ کام (Vmart.com) کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے گاہکوں کو معیاری اشیا مناسب دام پر فروخت کرتا ہے۔ اس سٹور میں جدید ترین برقی اشیا مثلاً کیمرے، لیپ ٹاپ، پرنٹر، موبائل فون، ایم پی تھری پلیئر وغیرہ دستیاب ہیں۔ پسند کی گئی شے منگوانے اور رقم کی ادائی کا طریق کار بہت آسان ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آن لائن شاپنگ کا عالمی رُجحان پاکستان پہنچ چکا ہے جس سے صارفین کے لیے آسانی اور سہولت پیدا ہوئی ہے لیکن اِس کی ترقی میں ابھی کئی رُکاوٹیں حائل ہیں

بیلی سٹی ڈاٹ کام

یہ پاکستان کا قدیم ترین آن لائن سٹور ہے جو ۲۰۰۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس ویب سائٹ پر تقریباً ۳۰ ہزار اشیا برائے فروخت موجود ہیں۔ ان میں الیکٹرونکس سامان سے لے کر گروسری تک شامل ہے۔ بیلی سٹی ڈاٹ کام (Belicity.com) میں استعمال کنندگان ۴ مختلف طریقوں سے آرڈر دے سکتے ہیں۔ اس ویب سائٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ گاہک چاہے، تو بیلی سٹی ڈاٹ کام کے نمائندے سے چیٹ بھی کر سکتا ہے۔

شاپر ڈاٹ کام

پاکستانیوں میں مقبول ایک اور آن لائن سٹور، شاپر ڈاٹ کام (Shopper.com) میں زیادہ تر الیکٹرونکس اشیا برائے فروخت موجود ہیں مثلاً کمپیوٹر، کیمرے، موبائل فون وغیرہ۔ یہ سٹور بھی اپنے گاہکوں کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی اشیا مفت بیچ سکیں۔

ٹی سی ایس کونیکٹ ڈاٹ کام

ایک نیا آن لائن سٹور جو حال ہی میں پاکستانی منظرنامے میں داخل ہوا ہے۔ اسے سامان کی نقل و حمل کرنے والے مشہور ادارے، ٹی سی ایس (TCS) نے شروع کیا ہے۔ ابھی تجرباتی دور سے گزر رہا ہے لیکن مستحکم کمپنی کی سرپرستی کے باعث اس کی ترقی کے بہت مواقع ہیں۔

ٹی سی ایس کونیکٹ ڈاٹ کام tcsconnect.com کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ لیپ ٹاپ، ٹیبلٹوں موبائل فون اور ویڈیو گیمز پر ۹۰ دن کی حادثاتی انشورنس مفت فراہم کرتا ہے۔ اس میں بھی دستیاب بیشتر اشیا الیکٹرونکس ہی ہیں۔

سائمبوس ڈاٹ کام

ایک اور مشہور پاکستانی آن لائن سٹور۔ یہ اپنے ہاں آنے والوں کو سیکڑوں اشیا مثلاً کھلونے، ویڈیو گیمز اسلامی کتب و ملبوسات، کھیلوں کا سامان وغیرہ دکھاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر خریدار ڈیلیوری کے وقت نقد رقم ادا کرے، تو اُسے سامان مفت بھجوایا جاتا ہے۔ مزید برآں گاہک چاہے، تو اُسے پاکستان بھر میں کہیں بھی سامان ۲۴ گھنٹے کے اندر مل جاتا ہے۔

سائمبوس ڈاٹ کام (Symbios.com) رعایتی نرخوں پر بھی مخصوص اشیا فروخت کرتا ہے۔ نیز "بنڈل" پیشکش بھی اکثر ملتی ہے۔ اس پیشکش میں باورچی خانے، دفتر یا غسل خانے کی متفرق اشیا نسبتاً سستے داموں اکٹھی کر دی جاتی ہیں۔

گلیکسی ڈاٹ کام

یہ بھی پاکستان کا اہم آن لائن خریداری مرکز ہے۔ تاہم اس ویب سائٹ میں زیادہ تر ٹیکنالوجیکل اور الیکٹرونکس اشیا ہی برائے فروخت موجود ہیں۔ اس سٹور کا لے آؤٹ سادہ ہے، تاہم ہر شے کی قیمت اور خصوصیات درج ہیں۔

کسی کو کوئی چیز پسند آئے، تو وہ ایس ایم ایس یا ای میل کے ذریعے اپنا آرڈر بھجواتا ہے۔ اگر شے موجود ہو، تو گاہک کو کہا جاتا ہے کہ وہ فہرست میں درج کسی بھی بینک میں مطلوبہ رقم جمع کرا دے۔ بعدازاں ایک دو دن میں شے یا اشیا گاہک کے پاس پہنچ جاتی ہیں، تاہم منگوانے کا خرچ گاہک ہی برداشت کرتا ہے۔ ■

موچی کا لڑکا

ڈنمارک کے عظیم مصنف کرسچین اینڈرسن کی داستانِ حیات جس نے بچوں کے لیے بہترین ادب تخلیق کیا

محمد محبوب حسن کانجو

یکم دسمبر ۱۸۱۹ء کی صبح کو ایک چھوٹے سے قصبے اوڈنسے سے ایک ۱۴ سال کا لڑکا اپنے ملک ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن روانہ ہوا۔ اس دبلے پتلے اور اپنی عمر کے لحاظ سے لمبے لڑکے کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ وہ گھوڑا گاڑی میں بیٹھ سکتا۔ اس کے جسم پر پھٹا پرانا کوٹ اور پاؤں میں پرانے جوتے تھے۔ وہ بغل میں ایک پوٹلی دبائے ہوئے کوپن ہیگن کی سڑک پر پیدل چلا جا رہا تھا۔ یہ موچی کا لڑکا کوپن ہیگن میں اپنی قسمت آزمانے جا رہا تھا۔ بالکل پریوں کی کہانیوں کے شہزادوں کی طرح اسے اپنی کامیابی اور آخری فتح کا پورا پورا یقین تھا۔

کیا وہ کامیاب ہوا؟ کیا اس کی محنت ٹھکانے لگی؟ کیا وہ جس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی بیوہ ماں کو چھوڑ کر کوپن ہیگن جا رہا تھا، اُسے حاصل کرنے میں کامیاب رہا؟ یہ سوالات اس باہمت اور بہت ہی مفلس لڑکے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگی کی کہانی میں ملتے ہیں۔ وہ ایک موچی کا لڑکا تھا۔ اُس کے بچپن ہی میں اس کے باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ بیوہ ماں کی خواہش تھی کہ اس کا اکلوتا بیٹا درزی بنے۔ لیکن وہ تو ادیب اور مشہور ڈراما نویس بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ جو کتاب لگتی وہ اسے بڑی توجہ سے پڑھتا، حالانکہ اس کی تعلیم پانچویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ اُس نے کوپن ہیگن جانے کا ارادہ باندھا اور روزانہ ماں سے جانے کی اجازت مانگنے لگا۔ آخر اس کی ماں نے اس کے مرحوم باپ کا کوٹ نکالا اور چھوٹا کر کے اسے دے دیا۔ بے چاری اپنے بیٹے کو اور کچھ دے بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ یہی ان کا آخری سرمایہ تھا۔

کوپن ہیگن کو جانے والی سڑک پر چلتے چلتے جب اسے دوپہر ہوگئی تو پاس سے ایک گھوڑا گاڑی گزری۔ کوچوان کو اس کمزور لڑکے پر ترس آگیا اور اسے دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ اس زمانہ میں ریل گاڑی یا موٹریں تو تھی نہیں۔ ان گھوڑا گاڑیوں یا بگھیوں میں سفر ہوتا تھا۔ ۴/دسمبر ۱۸۱۹ء کو اس لڑکے کو فیڈ کربرگ نامی قصبہ میں گاڑی سے اُتار دیا گیا۔ یہ قصبہ کوپن ہیگن سے چند میل دور تھا اور دارالحکومت میں داخل ہونے والے ہر شخص سے ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ اس لڑکے کے پاس کرایہ کے لیے ایک پیسا نہیں تھا، ٹیکس کہاں سے دیتا۔ چنانچہ یہاں سے وہ پیدل چل پڑا اور کوپن ہیگن میں داخل ہوگیا۔

کوپن ہیگن ناروے کا خوبصورت اور بارونق شہر ہے۔ دو روز تک یہ دیہاتی لڑکا اپنی حیران آنکھوں سے شہر کی بلند عمارتیں اور باغات دیکھتا رہا۔ ۱۸/دسمبر کو وہ پوچھتے پوچھتے مشہور موسیقار سیونی کے دروازے پر پہنچا تو موسیقار کی خادمہ نے پوچھا ''میاں لڑکے! تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں جناب سیونی سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے گانے کا شوق ہے اور میں نے چند ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ اگر سیونی صاحب سے میری ملاقات ہوجائے تو میں ان کی شاگردی کے لیے درخواست کروں گا۔ میں تھیٹر میں نام پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ دو دن سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔ لڑکے نے آخری فقرہ دکھ بھری آواز میں کہا تھا۔ خادمہ لڑکے کی عجیب باتیں سن کر حیران ہوئی اور اندر اپنے آقا کو اس عجب مہمان کے بارے میں بتانے کے لیے گئی۔ موسیقار سیونی اپنے چند شاعر، ڈراما نویس اور ادیب دوستوں کی دعوت میں مصروف تھا۔ جب خادمہ نے اجنبی لڑکے کے متعلق بتایا، تو اس وقت سیونی اور اس کے دوست بڑی موج میں تھے۔ انھوں نے خادمہ سے کہا ''لڑکے کو اندر لے آؤ۔ چند منٹ کے لیے دل لگی رہے گی۔''

خادمہ لڑکے کو اندر لے آئی۔ چند ثانیے تک تو لڑکا کمرے کی شان و شوکت کو پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' سیونی نے پوچھا۔

''ہانز کرسچین اینڈرسن'' لڑکے نے جواب دیا اور پھر اپنی مختصر زندگی کی کہانی اور ادب میں نام پیدا کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ سیونی اور اس کے دوست جو اینڈرسن سے دل لگی اور مذاق کرنے کی سوچ رہے تھے، اب سنجیدگی اور غور سے لڑکے کی باتیں سننے لگے اور وہ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس بے یارومددگار لڑکے کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اینڈرسن نے انھیں بتایا کہ وہ رقاص بننا چاہتا ہے لیکن ناچتے وقت اس کی کمزور ٹانگیں کانپ جاتی ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ وہ گویا بننا چاہتا ہے لیکن اس کی آواز پہلی تان ہی پر پھٹ جاتی ہے۔

چند روز کے بعد اس نے ایک ڈراما شاہی تھیٹر کے ڈائریکٹر کو دیا۔ ڈائریکٹر نے اس ڈراما پر لکھا کہ اس قسم کی فضول چیز تھیٹر پر پیش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں تو املا کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ یوں اسے ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ ڈرامے، نظمیں اور کہانیاں لکھتا رہا۔ اب وہ کوپن ہیگن کے سب ادیبوں اور شاعروں میں مشہور ہوگیا تھا۔ ان میں کئی اس کا مذاق اُڑاتے، وہ اسے ایک خبطی لڑکا سمجھتے تھے اور اپنی محفلوں میں اس کی ہنسی اُڑاتے تھے۔ لیکن یہ لڑکا

کوپن ہیگن ہی میں رہا اور چند مہینے کے بعد کوپن ہیگن کے شاہی تھیٹر کے ڈائریکٹر جونار کولین نے اینڈرسن کا شوق دیکھ کر اسے سکول میں داخل کرا دیا اور اسی سکول کے ایک استاد کے ہاں اینڈرسن کے رہنے کا بندوبست بھی کردیا۔ اینڈرسن کی زندگی میں سکول کا یہ زمانہ مصیبت کا وقت تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے بچوں میں اپنے قد کے لحاظ سے ''لم ڈھینگ'' مشہور ہوگیا۔ وہ نظمیں تو لکھ سکتا تھا، لیکن نقشہ پر کوپن ہیگن نہیں بتا سکتا تھا۔ اس لیے بچے اس کا مذاق اڑاتے تھے اور استاد اس سے بڑی سختی سے پیش آتا تھا۔ وہ اس کے لکھنے کے شوق کو بھی کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ چنانچہ اینڈرسن ایسا بدنصیب طالب علم تھا جس کا سکول یا اس کے باہر کوئی بھی دوست یا ہمدرد نہ تھا۔ وہ بے چارہ اس بھری دنیا میں اپنے آپ کو اکیلا سمجھتا تھا۔

۱۸۲۸ء میں اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہ اس کا پہلا اور آخری امتحان تھا، اب وہ اپنا سارا وقت کہانیاں لکھنے میں گزارتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے جرمنی، آسٹریا، اٹلی اور فرانس کا سفر بھی کیا۔ ۱۸۳۵ء میں پہلا ناول شائع کیا۔ ناول مقبول ہوا اور اس کا ترجمہ جرمن زبان میں بھی کیا گیا۔ اس کے ۷/سال بعد اس ناول کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا۔ اب اینڈرسن ادیبوں کی صف میں شامل ہوچکا تھا۔ شاہ ڈنمارک نے اس موچی کے لڑکے کے ذوق وشوق سے متاثر ہوکر اس کے لیے سالانہ وظیفہ مقرر کردیا اور اینڈرسن کو روزی کمانے سے کسی حد تک آزادی مل گئی۔ پھر اینڈرسن نے پہلا ڈراما لکھا جو شاہی تھیٹر میں کھیلا گیا۔ جب یہ ڈراما ختم ہوا اور اینڈرسن اپنے ایک دوست کے مکان پر پہنچا تو شہرت کے ساتھ ساتھ اب اس کے کئی دوست بن چکے تھے۔ وہاں اینڈرسن زاروقطار رونے لگا۔ دوست کی بیوی سمجھی کہ ڈراما ناکام رہا ہے اور اینڈرسن اپنی ناکامی پر آنسو بہا رہا ہے۔ چنانچہ اس نے ہمت بندھانے کے لیے اینڈرسن سے کہا ''بعض اوقات مشہور لکھنے والوں کے ڈرامے بھی تماشائی پسند نہیں کرتے آپ کا تو یہ پہلا ڈراما ہے۔ آپ کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ اینڈرسن نے زور کی ہچکی لیتے ہوئے کہا ''میرا ڈراما تو تماشائیوں نے بے حد پسند کیا ہے اور انھوں نے ڈراما نویس زندہ باد کے نعرے بھی لگائے ہیں۔''

''تو پھر اس خوشی کے موقع پر رونا دھونا کیوں؟''

اینڈرسن کی زندگی میں عجیب بات یہی تھی کہ وہ خوشی اور غم دونوں موقعوں پر بے اختیار رونے لگتا تھا۔ اس کی طبیعت اتنی سادہ تھی کہ جب وہ یورپ بھر میں مشہور ہوگیا پھر بھی یہ سادگی نہ گئی۔ وہ بلا جھجک بتاتا کہ وہ ایک موچی اور مفلس بیوہ کا لڑکا ہے اور اس کی یہ شہرت اس کی ان تھک محنت اور چند لوگوں کی مہربانی کا نتیجہ ہے اور جب کبھی وہ اپنی یہ کہانی سناتا تو اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

۱۸۳۵ء میں اس نے پریوں کی کہانیوں کی ایک کتاب شائع کی۔ کتاب پر ''بچوں کے لیے'' لکھا تھا لیکن ان کہانیوں کو ہر عمر کے شخص نے اتنا پسند کیا کہ اینڈرسن سے بار بار کہا جاتا کہ وہ اس قسم کی کہانیاں لکھے۔ اینڈرسن کی خواہش تو یہ تھی کہ لوگ اسے ملک کا بہت بڑا ڈراما نگار اور ناول نویس سمجھیں۔ اس نے کئی ڈرامے اور ناول بھی لکھے۔ لیکن اس کی بچوں کے لیے کہانیوں کا چرچا اتنا عام ہوگیا کہ صرف ۲/سال میں یورپ کی کئی زبانوں میں ان کا ترجمہ شائع ہوگیا۔ یہ کہانیاں اتنی پیاری اور ادبی لحاظ سے اتنی بلند تھیں کہ ڈنمارک کے بڑے بڑے ادیبوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”اینڈرسن کی خواہش تھی کہ لوگ اسے ملک کا بہت بڑا ڈراما نگار اور ناول نویس سمجھیں لیکن اس کی بچوں کے لیے کہانیوں کا چرچا اتنا عام ہوگیا کہ صرف ۲ سال میں یورپ کی کئی زبانوں میں ان کا ترجمہ شائع ہوا اور ڈنمارک کے بڑے بڑے ادیبوں نے اُس کی کہانیوں کو شاہکار کا درجہ دیا“

اینڈرسن کی زندگی میں عجیب بات یہی تھی کہ وہ خوشی اور غم دونوں موقعوں پر بے اختیار رونے لگتا تھا

انھیں شاہکار کا درجہ دیا۔ ان ادیبوں کا خیال تھا کہ اینڈرسن کی یہ کہانیاں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ”لوگ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دیگر تمام نظمیں، اس کے ناول، اس کے ڈرامے اور اس کے سفرنامے بھول جائیں گے۔ یہ کہانیاں جو اینڈرسن نے فرصت کے وقت بچوں کے لیے لکھی تھیں وہ یورپ کے ادب کا ایک خاص تحفہ ثابت ہوں گی۔“ ان کا خیال بالکل صحیح ثابت ہوا۔ آج دنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جس میں اینڈرسن کی ان کہانیوں کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔

اینڈرسن نے شادی نہیں کی۔ وہ اپنی ساری عمر ادبی کاموں میں مصروف رہا۔ آخر ۱۴/اگست ۱۸۷۵ء کو جب اس کی عمر ۶۰ سال ہوئی، تو چند روز بیمار رہنے کے بعد انتقال کرگیا۔ اس کا جنازہ اس کے قصبہ اُوڈنسے لے جایا گیا اور وہاں اسے بڑی شان سے دفنایا گیا۔

کچھ عرصہ بعد اوڈنسے میں ہانز کرسچین اینڈرسن کی یاد میں ایک عجائب گھر بنایا گیا۔ جس میں اینڈرسن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کہانیاں، اس کے استعمال کی چیزیں، اس کے لکھنے کی میز اور کرسی رکھی گئی۔ عجائب گھر کے باہر اینڈرسن کا بہت بڑا مجسمہ نصب کیا گیا۔ ہر سال اوڈنسے میں بچوں کا میلہ لگتا ہے اور دور دور سے بچے اینڈرسن کے اس عجائب گھر کو دیکھنے آتے ہیں۔ اس میلہ میں اینڈرسن کی کہانیوں کی بڑی خوبصورت کتابیں سستے داموں فروخت کی جاتی ہیں۔

ہانز کرسچین اینڈرسن اپنی بے مثال شخصیت، سچے جذبے اور ادیبانہ اوصاف کی وجہ سے رہتی دنیا تک یاد کیا جاتا رہے گا اور اس کی کہانیاں اپنا جادو جگاتی رہیں گی۔ ■

جانور جنھوں نے دُنیا کو حیران کردیا

جانور اور کھیل

جانور بھی ورلڈ ریکارڈ قائم کرنے میں پیچھے نہیں رہے

محمد خلیل چودھری

سب سے زیادہ کمانے والا ریس کا گھوڑا

اپنے ریسنگ کیریئر کے دوران سب سے زیادہ کمائی حاصل کرنے کا ریکارڈ ۱۰ ملین امریکی ڈالرز کا ہے۔ یہ ریکارڈ امریکی گھوڑے سیچر نے جو کہ ۱۹۹۰ء میں پیدا ہوا تھا قائم کیا۔ اس گھوڑے نے ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۶ء کے دوران یہ ریکارڈ قائم کیا۔ اس رقم میں وہ رقم بھی شامل ہے جو اس نے ۱۹۹۶ء کے ایک سال میں (۹ء۴ ملین امریکی ڈالرز) کمائی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۹۰ء میں پیدا ہونے والے ہوکر ٹو ومیکا نے ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس گھوڑے نے جاپان میں ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء کے دوران ۳ء۸ ملین ڈالرز کی رقم جیتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ریس کی سب سے بڑی انعامی رقم

۲۵ر مارچ ۲۰۰۰ء کو ناد ایشیا، دبئی، متحدہ عرب امارات میں دبئی ورلڈ کپ ۲۰۰۰ء منعقد ہوا۔ اس ورلڈ کپ میں ۶ر ملین امریکی ڈالرز کی انعامی رقم مختص کی گئی تھی۔ جس میں سے ۳٫۶ر ملین امریکی ڈالرز کی انعامی رقم جیتنے والے کو دی جانی تھی۔ اس ریس کو ''گو ڈولفن'' نامی گھوڑے نے صرف ۲ر منٹ میں جیت لیا۔ ہرفرینگ ڈیٹوری اس پر سوار تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے یہ انعامی رقم ۳۰ر ہزار امریکی ڈالرز فی سیکنڈ کے حساب سے حاصل کی۔

گھوڑوں کو تربیت دینے والے کی ریکارڈ آمدنی

امریکا کے وائین لوکاس نے گھوڑوں کو کل وقتی طور پر ۱۹۶۷ء میں تربیت دینا شروع کی۔ اس نے مجموعی طور پر ۱۷۷ر ملین امریکی ڈالرز اپنے ہارس ریسنگ کیریئر میں کمائے۔ اس کو نیشنل ریسنگ ایسوسی ایشن کی جانب سے سال کے بہترین ٹرینر اکلپس ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں اس نے ۱۷،۸۴۲،۳۵۸ر امریکی ڈالرز کی رقم ایک ٹرینر کی حیثیت سے حاصل کی۔

ریس کا سب سے مہنگا گھوڑا

۲۳ر جولائی ۱۹۸۵ء کو برطانیہ کے رابرٹ سانگسٹر اور اس کے پارٹنر نے ۱۳ر ملین امریکی ڈالرز ایک گھوڑے ایرلنگ سٹیل ڈانسر کے لیے کین لینڈ امریکا میں دا کیے۔

ریس کا تیز ترین گھوڑا

سب سے تیز رفتار جو کسی بھی ریس کی ریکارڈ کی گئی ہے وہ ۶۲٫۶۹ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ یہ ریکارڈ بگ راکٹ نامی گھوڑے نے میکسیکو سٹی میکسیکو میں ۵ر فروری ۱۹۴۵ء کو قائم کیا۔

گھوڑے کا بلند ترین جمپ

فیڈریشن ایکوسٹر انٹرنیشنل کا تصدیق شدہ گھوڑے کا بلند ترین جمپ ۸ر فٹ ۱۰ر انچ ہے۔ یہ ریکارڈ ''ہواسو'' نامی گھوڑے نے بنایا۔ اس کے اوپر چلی کا البرٹو سواری کر رہا تھا۔ یہ ریکارڈ ڈوینا ڈل مار، سانتیا گو چلی میں فروری ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔

گھوڑے کا انڈور بلند ترین جمپ

۹ر جون ۱۹۹۱ء میں ''اوسپرس لیوناڈو'' نامی گھوڑے نے ۷ر فٹ ۸ر انچ کی بلندی تک جمپ لگانے کا ریکارڈ قائم کیا۔ اس گھوڑے پر جرمنی کا فرینک سلوتھیک سواری کر رہا تھا۔ یہ ریکارڈ جمپ سوئٹزرلینڈ میں قائم کیا گیا۔

سب سے کامیاب اَرنا بھینسا

سب سے کامیاب ترین اَرنا بھینسا ''ریڈاک'' نامی بھینسا ہے۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۸ء کے دوران اس بھینسے نے کل ۳۱۲ر روڈیوز کو اپنی پیٹھ سے گرایا۔ اس نے کسی کو بھی اپنی پیٹھ پر سوار نہ ہونے دیا۔ صرف ۱۹۸۷ء کے بل رائڈر چمپئن امریکا کے لین فراسٹ نے ۲۰ر مئی ۱۹۸۸ء کو اس اڑیل بھینسے پر صرف اور صرف ۸ر سیکنڈز تک سواری کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ بھینسا ریٹائر ہونے کے باوجود لوگوں کو خوش کرنے کا باعث بنتا رہا اور کثیر تعداد میں لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔

شہ سواری کے مقابلہ میں زیادہ تماشائی

دنیا میں سب سے بڑا بل فائٹنگ کا مقابلہ امریکا کی نیشنل فائنلز روڈیو میں ہوتا ہے۔ جس کو پروفیشنل کاؤبوائز ایسوسی ایشن (پی آر سی اے) اور وومنز پروفیشنل روڈیو ایسوسی ایشن (ڈبلیو پی آر اے) منعقد کراتی ہیں۔ ۱۹۹۱ء کے فائنل میں کل ۱۷،۴۱۴ تماشائیوں نے ۱۰ر مقابلوں سے لطف اٹھایا۔ یہ تعداد ان مقابلوں میں سب سے زیادہ تعداد ہے۔

افسانوی خرگوش

۱۱ر جولائی ۱۹۹۹ء کو جنوبی انگلینڈ فیرٹ ریسنگ چمپئن شپ کا انعقاد بلیتھ نارتھمبرلینڈ برطانیہ میں ہوا۔ اس میں ایک خرگوش وارہول نے جو کہ برطانیہ کے جیکوبٹی ایڈمنیر کی ملکیت تھا، نے ۱۲٫۵۹ سیکنڈ میں ریس جیت کر ۱۵۰ر دیگر خرگوشوں کو شکست دے دی۔ اہم بات یہ تھی کہ یہ ریس اس کی پہلی ریس تھی۔ وارہول کا وزن اس ریس کے دوران ۲٫۷ کلوگرام تھا۔

مقدر کا سکندر

۱۹۷۴ء سے اپریل ۲۰۰۰ء تک امریکا کے ایک جیکی کرسٹوفر میک کیران نے مجموعی طور پر ۲۳۳۶ ملین امریکی ڈالرز کی رقم جیتی۔ یہ کسی بھی لحاظ سے گھڑ دور میں کسی بھی جیکی کی سب سے بڑی جیتی جانے والی رقم ہے۔ اس نے ۱۹۹۴ء میں اپنی ۶ر ہزارویں فتح ہالی وڈ پارک، کیلیفورنیا میں حاصل کی۔

طویل ترین اڑان والا کبوتر

سب سے طویل اڑان والے کبوتر نے اپنے پورے عرصہ اڑان کے دوران ۴۱،۰۵۰ کلومیٹرز کا فاصلہ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۷ء کے دوران اُڑ کر طے کیا۔ یہ براز یلین بیوٹی نامی کبوتر تھا جس کا مالک جنوبی افریقہ کا رابرٹ کوش تھا۔

کتے کا سب سے بلند ترین جمپ

کسی بھی کتے کا سب سے اونچا جمپ لگانے کا ریکارڈ ۱۲ر فٹ ۲ر انچ ہے۔ یہ ریکارڈ ۱۸ر ماہ کے لورچر کتے نے جس کا نام شاج تھا، سالانہ کوسٹ ورلڈ کنٹری فیئر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہوں کا کھیل......کھیلوں کا شہنشاہ

پولو کے مشہور و معروف کھیل میں ارجنٹائن سرفہرست ہے۔ اس ملک کی پولو ٹیم نے ۵/مقابلوں میں حصہ لیا اور ۳/میں کامیابی حاصل کی۔ یہ کامیابی پولو ورلڈ چمپئن شپ جیتنے میں کسی بھی ملک کا ایک ریکارڈ ہے۔ ارجنٹائن نے پولو ورلڈ چمپئن شپ ۱۹۸۷ء (ارجنٹائن)، ۱۹۹۲ء (چلی) اور ۱۹۹۸ء (امریکا) میں جیتی۔ ورلڈ چمپئن شپ ہر ۳/برس بعد فیڈریشن آف انٹرنیشنل پولو (ایف آئی پی) کے زیر اہتمام کرائی جاتی ہے۔ میرینو اور ینگا ارجنٹائن کی اس ٹیم کا بہت اہم ترین کھلاڑی تھا۔ جس نے مارچ ۲۰۰۰ء میں آسٹریلیا میں ہونے والے ورلڈ پولو کپ میں حصہ لیا۔ سب سے زیادہ گول کیے جانے کا کسی بھی پولو میچ میں ریکارڈ ۳۰/گول ہے۔ یہ ریکارڈ اُس وقت بنا جب ارجنٹائن نے امریکا کو ۹-۲۱ سے نیویارک امریکا میں ستمبر ۱۹۳۶ء میں شکست دی تھی۔

برطانیہ میں ۲۷/ستمبر ۱۹۹۳ء کو قائم کیا۔ اس کتے کے مالک برطانیہ کے مسٹر اینڈ مسز پی آر میتھیوز تھے۔

گرے ہاؤنڈ ریس کی سب سے بڑی انعامی رقم

سب سے بڑی انعامی رقم جو گرے ہاؤنڈ ریس میں جیتی گئی وہ ۱۲۵۰۰۰/امریکی ڈالرز کی رقم تھی۔ یہ رقم بن جی سپیڈ بوٹ نامی کتے نے ''گریٹ گرے ہاؤنڈ ریس آف چیمپئنز'' میں سی بروک، نیو ہمپشائر امریکا میں ۲۳/اگست ۱۹۸۶ء کو جیتی۔

سب سے مہنگا ترین کبوتر

ایک ۴/سالہ کبوتر جو کہ ۱۹۹۲ء بارسلونا انٹرنیشنل اُڑان کا فاتح تھا۔ ۱۶۰،۰۰۰/امریکی ڈالرز میں فروخت ہوا۔ یہ کسی بھی کبوتر کی سب سے بڑی قیمت تھی جو ادا کی گئی۔ اس کبوتر کو جولائی ۱۹۹۲ء میں ہالینڈ کے مارٹن بائی مینز سے برطانیہ کی لاؤلا پیچین ورلڈ نے خریدا۔

پہلوان اونٹ

۱۹۹۴ء کو کیمل ریسلنگ فیسٹول، ترکی میں منعقد ہوا جس کو ۲۰/ہزار تماشائیوں نے دیکھا۔ اس فیسٹول میں ۱۲۰/اونٹوں کے مقابلے ہوئے جو ۲/ہزار سال پرانے سٹیڈیم میں افسیوسس شہر میں منعقد ہوئے تھے۔ یہ کسی بھی اونٹوں کی لڑائی میں تماشائیوں کی سب سے بڑی تعداد تھی۔ اونٹوں کی لڑائی ترکی میں سب سے قدیم تفریح ہے۔

تیز ترین گھونگا

سالانہ ورلڈ سنیل ریسنگ چمپئن شپ، ہر سال جولائی میں برطانیہ میں منعقد کی جاتی ہے۔ اس ریس میں سب سے کامیاب گھونگا ''آرچی'' نامی گھونگا ہے۔ اس کو کارل براھم نے تربیت دی اور اس نے گول پوسٹ تک کا فاصلہ ۲/منٹ ۱۳/سیکنڈ میں ۱۹۹۵ء میں طے کر کے ریکارڈ قائم کیا۔ ■

بے لوث خدمت، کام سے محبت اور انسانی جان کی قدر کرنے والوں کے ہاں رونما ہونے والا ایک سچا واقعہ

وہ 96 منٹ

ایک ناقابلِ یقین واقعہ

بجلی کے ۱۲/جھٹکوں کے باوجود دِل خاموش تھا رضا کاروں کے سر جھک چکے تھے اور ڈاکٹر رسمی وفات کے اعلان سے پہلے طبی آداب کے مطابق پوچھ چکا تھا کیا ہم اس شخص کی جان بچانے کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟

جب اچانک ہارٹ مانیٹر پر بیپ سنائی دی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ

۵/جنوری ۲۰۱۱ء کی سہ پہر تھی۔ امریکا میں شدید سردی کا عالم تھا۔ اسی دوران ہوورڈ سنٹزر (Howard Snitzer) حسبِ معمول جم میں ورزش کر کے گھر لوٹا۔ اس نے سلاد بنایا اور پھر مچھلی کے قتلوں پر بیسن لگا دیا۔ وہ انھیں شام میں بہ آرام تلنا چاہتا تھا۔

گزشتہ سال ۵۴/سالہ ہوورڈ نیویارک میں مقیم اور ایک ریستوران میں بحیثیت طباخ (Chef) ملازم تھا۔ پھر وہ چھوٹے سے قصبے گڈہیو میں چلا آیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیگم ٹیمی ریان بھی تھی۔ گڈہیو کی آبادی ۱۱۷۶/نفوس پر مشتمل تھی۔ اس کے چھوٹے ہونے کا اندازہ یوں لگائیے کہ ایک ٹریفک لائٹ بھی نہیں رکھتا تھا۔ گویا دنیا کے نقشہ پر محض ایک نقطہ..... مگر ہوورڈ سنٹزر کی خوش قسمتی تھی کہ وہ یہیں مقیم ہوا۔

چونکہ کھانا پینا اس کا پیشہ تھا، لہٰذا وہ خاصا فربہ ہوگیا تھا۔ اب گڈہیو میں وہ جز وقتی ملازمت کرنے لگا، تو اُسے کافی وقت فارغ ملا۔ تب بیگم کے کہنے پر وہ باقاعدگی سے جم جانے لگا۔ دراصل ٹیمی کا پہلا شوہر بھی بہت موٹا تازہ تھا جو ۲۰۰۴ء میں حملہ قلب (ہارٹ اٹیک) سے چل بسا۔ لہٰذا اب وہ اپنے دوسرے شوہر کا ایسا انجام نہیں چاہتی تھی۔

ہوورڈ گھر کے کام کاج میں بھی مصروف رہتا تھا تاکہ وزن تیزی سے کم کر سکے۔ اس سہ پہر بھی وہ غسل خانہ میں روغن کر رہا تھا کہ اُسے یاد آیا، پارٹی کیو کے چولہے میں تو گیس ہی نہیں۔ چنانچہ اس نے گیس کی دکان جانے کا منصوبہ بنایا۔ باہر درجہ حرارت منفی ۱۱/سینٹی گریڈ تھا، تاہم اس نے خود سے کہا، چند منٹ ہی تو لگیں گے۔ چنانچہ اس نے نیکر پر پتلون پہننی بھی ضروری نہ سمجھی اور اپنی کار میں بیٹھ کر دکان پہنچ گیا۔

جب وہ گیس بھروا کر دکان سے نکلا، تو اچانک اُسے اپنے سینہ میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے وہ تیورا کر گر پڑا..... موت کے فرشتہ نے اس کا دل روک کر اُسے گور کنارے پہنچا دیا تھا۔

☆☆

نائل آٹو سروس کے مالکان ایل اور رائے لوڈر میئر نے وقت ختم ہونے پر اپنی دکان کا شٹر بند کر دیا۔ یہ دونوں بھائی طویل عرصہ سے قصبہ میں مقیم تھے۔ ضرورت پڑنے پر بطور رضا کار آتش بجھاؤ کارکن کا کام بھی کرتے۔ وہ پاس پڑوس مقیم لوگوں کے دکھ درد بانٹتے تھے چنانچہ جب ایک آدمی وہاں پہنچا، تو انھیں حیرت نہیں ہوئی۔ تاہم مہمان کی خبر نے انھیں چوکنا کر دیا۔ ''بھائیو! باہر فٹ پاتھ پر ایک آدمی مردہ پڑا ہے۔''

یہ سن کر دونوں بھائی باہر بھاگے۔ دیکھا کہ سامنے والے فٹ پاتھ پر ایک فربہ آدمی گرا پڑا ہے۔ ان کا ایک واقف کار، کینڈک کوہن جھک کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس شخص کو دیکھ کر دونوں بھائیوں کے ذہن میں ۲ سوال آئے: اوّل یہ کہ آدمی نے اتنی شدید سردی میں نیکر کیوں پہن رکھی ہے؟ دوسرے جب وہ اس کے قریب پہنچے تو انھیں احساس ہوا کہ وہ سانس نہیں لے رہا۔ گویا یہ برف پر محض پھسلنا نہیں تھا۔ رائے بھاگ کر ۲۵/میٹر دور فائر اسٹیشن جا پہنچا۔ وہاں سے امدادی ٹرک لانا چاہتا تھا جس میں آکسیجن اور دل کی غیر معمولی دھڑکن نارمل کرنے والا آلہ، ڈی فبریلیٹر (Defabrilator) نصب تھا۔

ہسپتال سے باہر دل کے دورے کا شکار ہونے والے افراد کے بچنے کا امکان کم ہوتا ہے اور محض ۵/سے ۱۰/فیصد ہی بچ پاتے ہیں

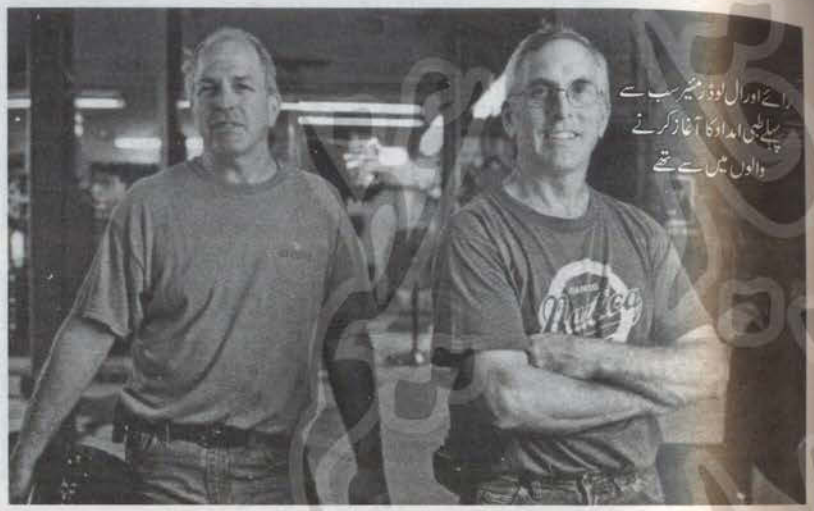

رائے اور ایل لوڈر میئر سب سے پہلے طبی امداد کا آغاز کرنے والوں میں سے تھے

یہ واضح رہے کہ اگر ہسپتال سے باہر کسی انسان کو دل کا دورہ پڑے، تو بچنے کا امکان صرف ۵/تا ۱۰/فیصد ہوتا ہے لیکن اگر دورے کی وجہ دل کی غیر معمولی یا غیر فطری دھڑکن ہے، (طبی اصطلاح میں ''بطنی ارتجاف'' Ventricular Fibrillation) تو ۳۰/منٹ کے اندر اندر طبی امداد ملنے کے باعث بچنے کا امکان ۳۰/فیصد تک پہنچ جاتا ہے۔

ایل لوڈر میئر جانتا تھا کہ اگر ۵/منٹ تک دماغ کو آکسیجن نہ ملے، تو وہ مرنے لگتا ہے۔ چنانچہ ضروری تھا کہ ہوورڈ پر فوراً قلبی ریوی احیائی (Cardiopulmonary Resuscitation) عمل شروع کر دیا جائے۔ یہ مریض کا تنفس اور دورانِ خون بحال کرنے والا ہنگامی طریقہ ہے جو عرفِ عام میں سی پی ایس (CPS) کہلاتا ہے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سی پی ایس طریق علاج زیادہ سے زیادہ ۴۵/منٹ تک کارآمد رہتا ہے۔ ابھی شام کے ۴:۱۵ بجے تھے۔ گویا امدادی کارکنوں کے پاس ہوورڈ کو بچانے کے لیے پون گھنٹہ تھا۔ تاہم ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ ہوورڈ کو بچانے کی کوششیں کرتے ۵:۴۲ بج جائیں گے اور وہ اسی وقت روچسٹر میں میو ہسپتال کی سمت روانہ ہوگا۔ علاقہ کا یہی ہسپتال ایسے نازک کیس سے عہدہ برآ ہوسکتا تھا۔

ایل نے کوئین سے کہا ''آؤ اسے اندر لے چلیں۔'' اس نے پھر ہوورڈ کو بغلوں سے تھاما جبکہ کوہن نے سرد ٹانگیں پکڑ لیں۔ یوں وہ ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے بھاری بھرکم ہوورڈ کو ڈانز فوڈ نامی ریستوران کے اندر لے گئے جو خاصا گرم تھا۔

شام ۴:۵۹ - (۴۳ منٹ باقی)

ایمرجنسی میڈیکل ٹیکنیشن، جرمی شیفر ڈانز فوڈ میں داخل ہوا۔ وہ کچھ تھکن کا شکار تھا اور اب کافی پی کر تازہ دم ہونا چاہتا تھا۔ وہ بتاتا ہے ''جب میں اندر داخل ہوا، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ داخلی دروازے کے قریب ہی ایک آدمی مردہ پڑا ہے اور ۲/آدمی اس پر سی پی ایس آزما رہے ہیں۔'' بحیثیت طبی امدادی کارکن شیفر بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔

۵:۰۰ - (۴۲/منٹ باقی)

رائے امدادی ٹرک لیے آپہنچا۔ اس نے آکسیجن ٹینک،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امبو بیگ اور ڈی فبریلیٹر نکالا اور اندر کو دوڑ پڑا۔ یہ واضح رہے، بیشتر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب دورہ پڑے تو دل کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی دل بہت تیزی یا سستی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ یہ غیر فطری حالت ''ارتجاف'' (Fibrillating) کہلاتی ہے۔ اس کیفیت میں دل کے جوف پھیپھڑوں تک خون نہیں پہنچا پاتے۔ چنانچہ مریض کی جان بچانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ارتجاف روک دیا جائے۔

جیسے ہی رائے اندر پہنچا، ایل نے امبو بیگ (آکسیجن فراہم کرنے والا دستی آلہ) لیا اور ہوورڈ کے منہ سے لگا دیا۔ اب آکسیجن ہوورڈ کے جسم میں جانے لگی تو انھوں نے باقاعدہ سی پی آر کا آغاز کیا۔ یعنی ہوورڈ کے سینہ کو وقفہ وقفہ سے دبانے لگے تاکہ آکسیجن پہلے پھیپھڑوں تک پہنچے اور پھر وہاں سے بذریعہ دورانِ خون دماغ تک پہنچ جائے۔ گویا جو کام دل کرتا تھا اب وہ سی پی آر کے ذریعے انجام پانے لگا۔

۵:۰۱- (۴۱/منٹ باقی)

اب ڈی فیبریلیٹر سے کام لینے کا وقت آپہنچا۔ ہوورڈ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ رائے نے سی پی آر روکنے کا اشارہ کیا اور پھر ڈی فبریلیٹر سے مردے کو بجلی کا جھٹکا دیا۔ ہوورڈ کا جسم ہل کر رہ گیا۔ اسی اثنا میں دل دھڑکا اور چند لمحے دھڑکتا رہا اور پھر بند ہوگیا۔ گویا وہ اپنے آہنگ میں نہیں آسکا، چنانچہ پھر سی پی آر ہونے لگا۔

۵:۰۲- (۴۰/منٹ باقی)

باہر سائرن بجنے لگے اور روشنیاں نظر آنے لگیں۔ دراصل گڈہیو میں تعینات طبی عملہ آن پہنچا تھا۔ جلد ہی اردگرد کے قصبوں سے پیرامیڈیکل عملہ بھی آگیا۔ ان سب کی ڈانزفوڈ میں ضرورت تھی۔

سی پی آر دراصل بڑی تھکا دینے والی سرگرمی ہے۔ چنانچہ ایک انسان معین عرصہ تک ہی اسے انجام دے سکتا ہے۔ مطلوبہ عمل یہ ہے کہ انسان فی منٹ ۱۰۰/ بار سینہ دبائے اور دبانے کا ہر عمل تیز، گہرا اور سخت ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ سی پی آر کرتے ہوئے صرف ۲/منٹ بعد ہاتھوں میں درد اور عضلات میں اینٹھن ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا سی پی آر جاری رکھنے کے لیے پھر دوسرے فرد کو آنا پڑتا ہے۔ یوں یکے بعد دیگرے ۲۳/مرد و زن ہوورڈ پر یہ عمل انجام دینے لگے۔

۵:۰۳- (۳۹/منٹ باقی)

میو ہسپتال، روچسٹر میں ۲/ ایمرجنسی کالیں کی گئیں تاکہ وہ ہوورڈ کو لے جانے کے لیے ہیلی کاپٹر ایمبولینس بھجوا سکیں۔ انتظامیہ کو بتایا گیا کہ ایک آدمی کو دل کا دورہ پڑا ہے اور اس کا سی پی آر جاری ہے۔ روچسٹر میں سارا دن بوندا باندی جاری رہی تھی، چنانچہ ہیلی کاپٹر کہیں نہیں بھجوایا گیا۔ تاہم ہوورڈ کی خوش قسمتی کہ اب مطلع اتنا صاف تھا کہ ہیلی کاپٹر پرواز کرسکے۔

۵:۰۶- (۳۶/منٹ باقی)

قصبہ کا سب سے تجربہ کار ڈاکٹر، ڈیو شلر آپہنچا۔ اس نے بھی سی پی آر میں حصہ لیا۔ وہ بتاتا ہے ''سی پی آر خاصا کٹھن اور نازک کام ہے پھر سی پی آر کرنے والے اور مریض کے مابین بندھن بندھ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ مریض کے قلب و سینے پر ہوتے ہیں۔ مگر بوڑھے اور کمزور پسلیاں رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ

> **سی پی آر کرنا خاصا کٹھن اور نازک کام ہے۔ میں نے کئی سی پی آر کرنے والوں کو روتے ہوئے دیکھا ہے**

بروس گڈمین اور میری سوبودا مردہ شخص کو بذریعہ ہیلی کاپٹر ہسپتال لے جانے سے گھبرا رہے تھے

زور لگایا تو کوئی پسلی ٹوٹ جائے گی۔ میں نے سی پی آر کرنے والوں کو روتے دیکھا ہے۔''

لیکن ہوورڈ ایک بھاری بھرکم اور طاقتور انسان تھا۔ پھر سینہ بھی چوڑا چکلا رکھتا تھا۔ لہٰذا سی پی آر کرنے والے خاصا زور لگاتے پائے گئے۔ تاہم ان کی ساری مارا ماری کے باوجود اس کا دل ایک انچ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

۵:۲۰- (۲۲/منٹ باقی)

روچسٹر میں فلائٹ نرس، میری سوبودا ہیلی کاپٹر ''میوون'' میں سوار ہوئی اور پیرامیڈک بروس گڈمین کے پیچھے اپنی نشست سنبھال لی۔ گڈہیو شہر سے ۵۰/کلومیٹر دور تھا، چنانچہ ہیلی کاپٹر وہاں ۱۴/منٹ میں پہنچ پاتا۔

جب وہ پرواز کرنے لگے تو انھوں نے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کی خاطر آپس میں مشورہ کیا۔ انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ''شاید ہمیں مریض کو ٹرانسپورٹ نہ کرنا پڑے۔'' یعنی انھیں یقین تھا کہ وہ ایک مردے کو ہسپتال واپس لائیں گے۔

۵:۲۳- (۱۹/منٹ باقی)

قصبہ کا مقامی پیرامیڈک، ٹونی کارڈک خاصی دیر سے سی پی آر عمل میں محو تھا۔ اس نے اتفاقاً صبح سے آج کچھ نہ کھایا تھا، چنانچہ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن اس نے بھوک پر توجہ نہ دی اور تھکن ہونے تک سی پی آر کرتا رہا۔ ''کوئی اور آجائے۔'' اس نے آواز لگائی۔

ایک رضاکار بڑھا اور بڑی پھرتی سے ٹونی کی جگہ لے لی۔ یوں سی پی آر جاری رہا۔ ایک اور رضاکار بڑھا اور بولا ''اگلا نمبر میرا ہے۔'' جلد ہی مزید ۳/مرد و زن اس کے پیچھے آکھڑے ہوئے۔ دراصل یہ بہت ضروری تھا کہ ہوورڈ کا سینہ فی منٹ ۱۰۰/ بار دبایا جائے تاکہ اس کے دماغ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

۵:۲۸- (۱۴/منٹ باقی)

آدھ گھنٹہ پیشتر ہیلن کیئر، ایمرجنسی میڈیکل ٹیکنیشن گھر بیٹھی اپنے اور ۲/بچوں کے لیے کھانا تیار کررہی تھی۔ پھر اُسے ہوورڈ کا پتا چلا، تو وہ بھی ہاتھ بٹانے ڈانزفوڈ آپہنچی۔ گھر میں اس نے بچوں سے سوال کیا تھا ''آج تم نے کیا سیکھا؟'' جواب ملا ''کچھ نہیں۔''

اب ہیلن اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتی تھی کہ ایسی حالت میں ہوورڈ کا بچنا بہت مشکل ہے۔ اس کے باوجود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیلن نے ۵ر بار عمل سی پی آر انجام دیا۔ نتیجہ کچھ بھی نکلتا، وہ چاہتی تھی کہ اس واقعہ کے متعلق بچوں کو کچھ نہ بتائے۔ دراصل سارا طبی عملہ اسے مریض کی نجی زندگی میں مداخلت سمجھتا تھا۔

۵:۳۲- (۱۰ رمنٹ باقی)

ڈانز فوڈ طبی عملے اور دیگر لوگوں سے خاصی بھر گئی تھی۔ ہیلی کاپٹر پہنچنے والا تھا لہٰذا ہوورڈ کو ٹرالی پر لٹا کر قریب ہی واقع فائر اسٹیشن منتقل کر دیا گیا۔ جس کا صحن وسیع و عریض تھا۔ اس دوران سی پی آر مسلسل جاری رہا۔

۵:۳۴- (۸ رمنٹ باقی)

جیسے ہی ہیلی کاپٹر فائر سٹیشن کے صحن میں اُترا، فوراً ہی میوٹیم نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اب تک رضا کاروں نے درست طور پر ساری سرگرمیاں انجام دی تھیں۔ جیسے ہی ہوورڈ بے جان ہوا، چند منٹ بعد ہی سی پی آر عمل شروع ہو گیا۔ انھوں نے ۴ر بار بجلی کے جھٹکے دیے پھر ایمبو بیگ استعمال کیا تا کہ اسے آکسیجن ملتی رہے۔ وہ ابھی تک زیرِ استعمال تھا۔ مزید برآں مریض کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کر رہا تھا۔ مطلب یہ کہ سی پی آر کام کر رہا تھا اور آکسیجن زیرِ گردش تھی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا، مگر وہ ہوورڈ کے حلق میں ہوا کی نالی (ائیر ٹیوب) نہ ڈال سکے۔ دراصل اس کے دانت مضبوطی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اب نرس کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ ہوورڈ کے جبڑے کھولے تا کہ جان بچانے کا ایک ضروری آلہ حلق میں ڈال سکے۔

گڈمین نے ڈاکٹر شلز کو ہدایت دی کہ وہ ہوورڈ کی پنڈلی میں سوئی سے ننھا منا سوراخ کرے۔ ایک ٹھہر [illegible] شریان میں ہونے والے اس سوراخ کے ذریعے پھر ہوورڈ کے بدن میں مسکن (سکون آور) اور دیگر ادویہ پہنچائی گئیں۔ جلد ہی جبڑے، ڈھیلے پڑ گئے اور ایک نالی ہوورڈ کے ہوائی راستے تک پہنچا دی گئی۔ اس کے فوراً بعد گڈمین نے آکسیجن کا سلنڈر چالو کر دیا۔ یوں اب ہوورڈ کو وافر آکسیجن ملنے لگی۔

۵:۳۶- (۶ رمنٹ باقی)

اب میری نے نیم مردہ مریض کو ایسی ادویہ دیں جو دل کی بے قاعدہ دھڑکن کو معمول پر لانے کی کوشش کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہوورڈ کو بجلی کا جھٹکا بھی دیا گیا۔

۵:۳۷- (۵ رمنٹ باقی)

ہوورڈ کا دل اچانک حرکت میں آ گیا۔ لیکن جیسے کار کے انجن میں کچرا آنے سے وہ رک جاتا ہے، اسی طرح وہ اکھڑے انداز میں کچھ لمحے چلا اور پھر رک گیا۔ جب تک ہوورڈ کا دل حرکت میں نہ آتا، اُسے ہیلی کاپٹر پر لے جانا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں سی پی آر کرنے کی جگہ نہیں تھی۔ چنانچہ رضا کار قطار بنا کر کھڑے ہوتے رہے تاکہ اپنی باری پر سی پی آر انجام دے سکیں۔

۵:۴۰- (۲ رمنٹ باقی)

گڈمین جانتا تھا کہ سی پی آر ۴۵ رمنٹ تک ہی انجام دیا جا تا ہے۔ چنانچہ اس نے میو ہسپتال فون کر کے ماہرِ امراض قلب سے رائے مانگی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ اسے امیوڈرون دوا دے کر بجلی کا ایک اور جھٹکا دو۔ اگر پھر بھی ہوورڈ کا دل حرکت میں نہ آئے، تو اس [illegible]

رضا کاروں میں سے ایک اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا

''اُف میرے خدا...... یقین نہیں آتا کہ وہ ابھی تک زمین پر موجود ہے''

علاج روک دیا جائے۔

۵:۴۲: گڈمین نے ڈاکٹر کے دیے گئے مشورے پر عمل کیا مگر قلب بے حس و حرکت رہا۔ وہاں جمع ہوئے تمام رضا کار خاموشی سے سارا ماجرا دیکھتے رہے۔ نوجوان رضا کاروں کے لیے یہ کارروائی ابھی تک نئی ہی تھی، چنانچہ وہ خاصی تشویش کا شکار تھے۔ پھر بھی ان کی بھرپور کوشش یہی تھی کہ کسی بھی طرح وہ نیم مردہ ہوورڈ کی مدد کر سکیں۔

شام ۵:۴۲ بجے کی حد آئی اور گزر گئی۔ گڈمین نے بے ہوش مریض کی طرف دیکھا اور پھر رضا کاروں سے با آواز بلند دریافت کیا ''کیا ہمیں اس آدمی کا علاج ترک کر دینا چاہیے؟'' سب نے ''نہ'' میں سر ہلایا۔ ان کی نیت جان کر گڈمین نے پھر فون اٹھا لیا۔ ابھی ایک اور معالج کی قیمتی رائے شاید ان کی مدد کر دیتی۔

۵:۵۵- (۱۳ رمنٹ زائد ہو چکے)

ڈاکٹر راجر وائٹ میو ہسپتال میں ہارٹ اٹیک کا ماہر خصوصی تھا۔ لیکن آج اس کی چھٹی تھی، اسی لیے گڈمین نے ڈاکٹر راجر سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اب اس سے رائے لینی ضروری تھی۔ چنانچہ اسے فون کیا گیا۔

گڈمین نے اس کو مختصراً ہوورڈ کی حالت بتائی اور یہ بھی بتایا کہ تمام تر کوششوں کے باوجود مریض کا قلب ازخود دھڑک نہیں سکا۔ ڈاکٹر راجر اس قسم کے سیکڑوں کیس دیکھ چکا تھا اور بدقسمتی سے بیشتر مریض دماغ کو نقصان پہنچنے کے باعث جاں بحق ہو گئے۔

ڈاکٹر راجر کہنے لگا ''مجھے لگتا ہے کہ مریض کے دل کی بائیں شریان میں کوئی پھٹکی (Clot) آ گئی ہے۔ ایسی حالت میں جب بائیں شریان سے خون نکلنا بند ہو، تو دل دھڑکنا رک جاتا ہے۔ یہ واقعہ اچانک رونما ہوتا اور عموماً مریض چل بستا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر اس طبی حالت کو ''بیوہ بنانا'' (Widow Maker) کہتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ اس خطرناک طبی خرابی کو صرف آپریشن روم میں درست کرنا ہی ممکن ہے۔ کیونکہ پھٹکی وہیں نکل سکتی ہے۔ لیکن ہوورڈ صرف اسی صورت ہسپتال لایا جا سکتا تھا کہ اس کا دل خود بخود دھڑکنے لگتا۔ اسی لیے رضا کاروں نے سی پی آر جاری رکھا۔

اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تجربہ کار طبی رضا کار، سونیا ہیئسر کہتی ہے ''ہم صرف اہل خانہ کو مطمئن کرنے کی خاطر سی پی آر کرتے ہیں۔ ورنہ ایسی مخدوش حالت میں مریض بمشکل بچ پاتا ہے۔ لیکن اس آدمی کا کوئی رشتہ دار موجود نہ تھا اور ہم اس کی بابت کچھ نہیں جانتے تھے۔ گو ہم سب مایوس تھے، لیکن کسی نے ہمت نہ ہاری۔ سبھی چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح زندگی کا پیغام دے۔

۶:۲۷- (۴۵ رمنٹ زائد)

گڈمین نے چوتھی بار ڈاکٹر راجر کو فون کرتے ہوئے بتایا ''ابھی تک دل چالو نہیں ہوا۔ سی پی آر جاری ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا ''اب اسے امیوڈرون کی دگنی مقدار دو۔ سی پی آر جاری رکھو اور بجلی کا ایک اور جھٹکا لگاؤ۔''

۶:۳۱- (۴۹ رمنٹ زائد)

مشورے کے مطابق نرس نے دوا کا ٹیکا لگایا۔ پھر تھکے ہارے رضا کاروں نے سینہ دبانے کا عمل چھوڑ دیا۔ تب ایمرجنسی ٹیم نے ہوورڈ کو بارھویں اور آخری بار بجلی کا جھٹکا دیا۔

یہ سعی بھی ناکامی سے ہمکنار ہوئی۔ گڈمین کو احساس ہو گیا کہ اب ساری سرگرمی روکنے کا افسوس ناک لمحہ آ پہنچا۔ اس نے وہاں جمع سبھی لوگوں سے پوچھا ''کیا ہم اس شخص کی جان بچانے کے لیے مزید کچھ کر سکتے ہیں؟''

یہ سوال دراصل طبی آداب میں شامل ہے۔ اس کے ذریعہ علاج روکنے اور مریض کی وفات کا اعلان کیا جاتا ہے۔ تاہم فائر اسٹیشن میں جمع گروہ میں سے کسی نے جواب نہ دیا۔

۶:۳۲- (۵۰ رمنٹ زائد)

کچھ مرد و زن اپنے اپنے آلات سمیٹنے لگے۔ ہوورڈ تختہ پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ علاج کے آغاز سے لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کراب تک اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہوورڈ کے اردگرد استعمال شدہ ٹیوبوں، سرنجوں، سوئیوں اور پیکجنگ میٹریل کا ڈھیر لگ گیا۔

۶:۳۳ - (۵۱/منٹ زائد)

اچانک ہارٹ مانیٹر کی بیپ بول اٹھی۔ پھر بولی اور بولتی ہی چلی گئی...... حیرت انگیز طور پر ہوورڈ کا دل بیدار ہو کر دوبارہ دھڑ کنے لگا تھا۔

اس کرشمہ نے سبھی کو متحیّر کردیا۔ تاہم گڈمین کو معاملے کی نزاکت کا احساس تھا۔ وہ زور سے پکارا۔ ''اسے جلدی سے ہیلی کاپٹر میں سوار کراؤ۔'' وہ پھر لپک کر اندر بیٹھ گیا۔ رضا کاروں نے پھرتی سے مریض کو ہیلی کاپٹر میں پہنچایا اور ساتھ ہی وہ ہوا میں بلند ہوگیا۔ تبھی حیران اور سکون کا سانس لیتے ہوئے رضا کاروں میں سے ایک اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا ''اُف میرے خدا! یقین نہیں آتا کہ وہ ابھی تک زمین پر موجود ہے۔''

☆☆

میوہسپتال میں ڈاکٹر راجر کا تجزیہ درست ثابت ہوا۔ ہوورڈ کے قلب کی بائیں شریان میں ایک پھٹکی نے خون کی روانی روک دی تھی۔ جب وہ ہسپتال پہنچا، تب بھی شریان سے خون رک رک کر ہی جا رہا تھا۔ چنانچہ بذریعہ آپریشن پھٹکی نکال دی گئی۔

یہ واقعہ غیرمعمولی تھا، اس لیے گڈمین اُسے بھلا نہ سکا۔ ۵/دن بعد یہ دیکھنے کے لیے اس نے کمپیوٹر چیک کیا کہ ہوورڈ کس حال میں ہے۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ انتہائی نگہداشت کے کمرے سے رخصت ہو کر جنرل وارڈ میں پہنچ گیا ہے۔ وہ یہی سمجھا کہ مریض ہوش و حواس سے بیگانہ حالت میں ہوگا۔ متجسّس ہو کر وہ جنرل وارڈ پہنچ گیا۔ مگر ہوورڈ کا بستر خالی تھا۔ اس نے آزردہ ہو کر سوچا ''میں غلط سمجھا، وہ تو دنیا ہی سے گزر گیا۔''

اسے پھر زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ گڈمین نے دیکھا کہ وارڈ کے لاؤنج میں تین ادھیڑ عمر مرد بیٹھے گپیں لڑا رہے ہیں۔ ان میں ایک مریضوں کے لباس میں ملبوس تھا۔ وہی ہوورڈ تھا...... صحت مند اور پوری طرح ہوشیار۔ گڈمین اُسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

وہ پھر آگے بڑھا اور اپنا تعارف کرایا۔ ہوورڈ اٹھا اور اس سے لپٹ گیا۔ وہ اس کے کان میں بولا ''میں آپ لوگوں کا ازحد شکرگزار ہوں جنہوں نے میری جان بچائی۔'' گڈمین نے مسکرا کر یہ تعریفی کلمات قبول کیے۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد ہوورڈ نے دریافت کیا ''آپ سمیت سبھی لوگ میری جان بچانے کی سعی کرتے رہے۔ کسی نے بھی آخر تک ہمت نہیں ہاری۔ لیکن میں اس کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔''

گڈمین کاندھے اُچکا کر بولا ''وجہ...... وجہ تو میں نہیں جانتا۔'' وہ سچ کہہ رہا تھا۔

میوہسپتال کے ڈاکٹروں نے دنیائے طب کا ریکارڈ دیکھا بھالا، تو انکشاف ہوا، یہ پہلا موقع تھا کہ ہسپتال سے باہر کسی بھی انسان کا دل ۹۶/منٹ تک رکا رہا۔ ورنہ عام مریضوں کے دل بیس پچیس منٹ بعد ہی ہمیشہ کے لیے ڈھے جاتے ہیں۔

صحت یابی کے بعد ہوورڈ اپنے قصبہ، گڈہیو واپس آچکا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہے کیونکہ دو بائی پاس آپریشنوں نے اُسے تندرستی بخش دی۔ گڈہیو پہنچ کر وہ ان تمام لوگوں سے ملا جو اس کی جان بچانے کی کوششوں میں شریک ہوئے تھے۔ ڈاکٹر راجر وائٹ بھی وہاں پہنچ گیا جو بڑے تپاک سے ملا۔

عظیم احسان

ہوورڈ سنٹر خوب جانتا ہے کہ وہ ان تمام مرد و زن کے احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتا۔ تاہم اس نے اپنے محسنوں کو خوش کرنے کا ایک طریقہ ضرور تلاش کرلیا۔ اب وہ ہر مہینہ ان سب کی دعوت کرتا اور ایک خاص ڈش پکا کر کھلاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے ''مجھے ان سے محبت ہے۔ انہی کی بدولت میں آج زندہ ہوں، ورنہ کوئی قبر میرا مسکن ہوتی۔''

مختلف اَدوار اور مختلف مزاج کے
۵/عظیم اساتذہ کا محبت بھرا تذکرہ

5 عظیم اساتذہ

۵/اکتوبر: یومِ اساتذہ

ہر عہد کی خوبی اور خوبصورتی
اُس کے اساتذہ کے
دم سے ہوتی ہے اور ہمارا
عہد اُس حوالے سے
بہت آسودہ ہے

ماہ نور فیصل

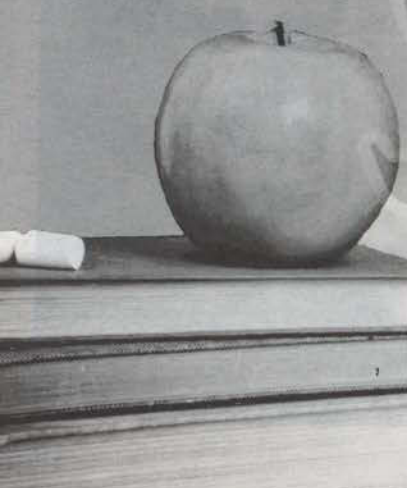

اللہ نے اپنے کچھ خاص بندوں سے کچھ نہ کچھ ایسا کام ضرور لینا ہوتا ہے جس کے سبب وہ اپنی زندگی ہی میں ایک Living Legend قرار پاتے اور مر کر بھی اُمر رہتے ہیں۔ ایسے عظیم انسانوں کو اللہ تعالیٰ خصوصی اوصاف سے نوازتا ہے اور نوازے جانے والی یہ غیر معمولی شخصیات اپنی زندگی میں انسانیت کی خدمت کے لیے ایسے کارنامے انجام دیتی ہیں کہ برس ہا برس گزر جانے کے باوجود بھی اُن کا نام قوم کے دماغوں سے محو نہیں ہوتا۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بے حساب عظیم اساتذہ اس قوم کی تعلیم و تربیت کے لیے بھیجے، دل تو چاہتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا ذکر یہاں کیا جائے، لیکن وہی بات 'ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش سے پہلے......'، رسالہ کے محدود صفحات کے پیش نظر یہاں صرف ۵/اساتذہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے آپ علامہ اقبالؒ کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا مضمون پڑھیں گے۔ فیض احمد فیض کے ایک شاگرد ایم اے ممتاز نے ایک مضمون لکھا تھا ''فیض صاحب بحیثیت استاد'' اُس سے آپ کو اُس عظیم انسان کی سادگی اور قابلیت کا اندازہ ہوگا۔ شیخ امتیاز علی، ایک سچے اور کھرے پاکستانی استاد ہیں۔ ۵/چیف جسٹس اُن کے شاگرد رہے، آپ اُن کے عظمت کردار کے کچھ واقعات دیکھیں۔ پروفیسر وقار عظیم ایک نامور استاد، محقق، نقاد اور ادیب تھے، اُن کی ذات نے پنجاب یونیورسٹی کی عظمت میں اضافہ کیا، شاہین احمد اور صبا یوسف نے ان کی ۲۵/ویں برسی پر ایک مضمون لکھا تھا، وہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ ایک امریکن پروفیسر ڈاکٹر سٹون کے بارے میں ان کے ایک شاگرد نصرت علی کا مضمون پڑھیں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ امریکا کے سپر پاور بننے میں وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کا کتنا اہم کردار رہا ہے۔ نصرت علی کا مضمون ہفت روزہ 'تصویر پاکستان' کے ۴/دسمبر ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حکیم الامت علامہ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ ایک کثیر الجہات شخصیت تھے۔ ان کی معروف ترین حیثیت ایک شاعر کی ہے مگر اس حیثیت میں بھی وہ روایتی شاعروں سے مختلف اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اگر آپ اقبال کی سب حیثیتوں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اپنی ان سب حیثیتوں میں اقبال نے ہمیں کسی نہ کسی شکل میں ایک نیا راستہ دکھایا۔ کچھ نئے تصورات عطا کیے اور ایک نئے سرمدی نغمہ کے ذریعہ سے ہمارے ساز دل کو چھیڑا......غور فرمائیے تو ان سب حیثیتوں میں ایک معلّم کی قدر مشترک نظر آتی ہے......شاعری ہو یا ان کے فلسفیانہ خطبات، دینی فکر کی تجدید ہو یا سیاسی جدوجہد کا مرحلہ...... ہر قدم پر وہ ہمیں کچھ بتاتے، کچھ سکھاتے اور کسی نہ کسی نکتہ کی تعلیم دیتے نظر آتے ہیں۔ ایک معلّم کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ افکار کا تجزیہ و تنقیح کرے، کھرے اور کھوٹے کو الگ کر دکھائے، متعلمین کے اندر حق و باطل کا امتیاز پیدا کرے، نیکی اور بدی کا فرق بتائے۔ یہی علم ہے

اور متعلمین کے قلوب و اذہان کو شعور علم کے اسی نور سے روشن کرنا، معلّم کے منصب کا تقاضا ہے اور اس کا فریضہ بھی۔ علامہ اقبالؒ کی پوری شاعری اس اجمال کی تفصیل ہے۔ ان کی شاعری کو کہیں سے بھی پڑھیے ہر جگہ ایک معلّم کی حیثیت نمایاں نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال: بطور معلّم

یہ تو مختصر سا ذکر تھا ایک شاعر کی معلمانہ حیثیت کا ......مگر اہم بات یہ ہے کہ اس شاعر نے اپنی زندگی کا ایک حصہ لفظی اور لغوی معنوں میں بھی ایک "معلّم" کی حیثیت سے بسر کیا۔ آپ کی معلمانہ زندگی کا آغاز یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ہوا۔ ایم اے کرنے کے بعد ۱۳ر مئی ۱۸۹۹ء کو وہ اورینٹل کالج میں "میکلوڈ عربک" ریڈر مقرر ہوئے۔ ان کے منصبی فرائض میں تاریخ اور پولیٹیکل اکانومی کی تدریس کے علاوہ انگریزی اور عربی تصانیف کا اردو ترجمہ بھی شامل تھا۔

۱۹۰۵ء کی تعطیلات گرما تک مختلف اوقات میں ۳ر بار وہ اورینٹل کالج سے رخصت لے کر گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی درس دیتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں ۳ر سال کی رخصت (بلا تنخواہ) لے کر اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ انگلستان چلے گئے......قیام انگلستان کے دوران انہوں نے لندن یونیورسٹی میں ۶ر ماہ تک عربی زبان کی تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ انگلستان میں قیام کے زمانے ہی میں انھوں نے معلّمی کے بجائے وکالت کا پیشہ اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور وہیں سے ۲۲ر جنوری ۱۹۰۸ء کو ملازمت سے استعفا لکھ بھیجا۔ بعد ازاں ہائی کورٹ میں قانونی پریکٹس کے زمانے میں پروفیسر جیمز کی اچانک وفات پر علامہ اقبال سے درخواست کی گئی کہ وہ ایم اے فلسفہ کی جماعتوں کو درس دیا کریں۔

یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو انھوں نے گورنمنٹ کالج سے تدریسی تعلق منقطع کر لیا۔ کئی سال بعد علامہ اقبال نے ۲ر ماہ تک اسلامیہ کالج لاہور کے فلسفہ کے طالب علموں کو درس دیا مگر یہ باقاعدہ ملازمت نہ تھی۔ طلبہ علامہ کے گھر آکر درس لیتے رہے۔ علامہ اقبال نے معلّمی کا پیشہ مستقل طور پر نہیں اپنایا کیونکہ ملازمت کی پابندیاں ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھیں اور وہ ایک آزاد منش انسان تھے۔ ایک بار پرنسپل نے ان سے قدرے تحکمانہ لہجہ میں بات کی تو ملازمت سے ان کا دل کھٹا ہو گیا۔

علامہ اقبال: اپنے طلبہ کی نظر میں

جن لوگوں نے علامہ اقبال سے براہِ راست درس لیا ان کے مطابق وہ ایک کامیاب معلّم تھے۔ اقبال کے ایک شاگرد اور معروف ناول نگار ایم اسلم لکھتے ہیں: "ان کے پڑھانے کا طریقہ اتنا دلکش تھا کہ غالباً ان کے پیریڈ میں تمام اساتذہ کے مقابلہ میں زیادہ حاضری ہوتی جو ان کی مقبولیت اور لیاقت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ پنجابی طلبہ کی کمزوریوں سے پوری طرح واقف تھے اس لیے انگریزی الفاظ کی ادائی میں بہت احتیاط برتتے تھے جس سے ایک ایک لفظ آسانی سے سمجھ آجاتا۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ اتنا موثر ہوتا کہ سبق کلاس ہی میں یاد ہو جاتا۔"

علامہ اقبال: نئی نسل کی تربیت کا خیال

علامہ اقبال کو ایک استاد کی حیثیت سے بخوبی احساس تھا کہ غلامی کے ماحول میں جدید علوم کی تدریس کے ساتھ طلبہ کی اخلاقی، مذہبی اور ذہنی تربیت کی اشد ضرورت ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر وہ طلبہ کے ذہنوں کی تعمیری خطوط پر تشکیل میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ جن دنوں اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ کو فلسفہ پڑھا رہے تھے اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھا " ان لیکچروں کے بہانے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔"

علامہ اقبال: کتابوں کے مرتب اور ممتحن

تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس سے علامہ اقبال کی وابستگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے مختلف جماعتوں کے لیے اردو اور فارسی کی متعدد کتابیں مرتب کیں۔ مڈل کی چاروں جماعتوں کے لیے اردو کورس کی ۴ر کتابیں اور میٹرک کے لیے فارسی کی ایک کتاب "آئینہ عجم" ٹیکسٹ بک کے طور پر عرصہ دراز تک رائج رہیں۔

تعلیم و تعلّم سے علامہ اقبال کی وابستگی کا ایک اور پہلو یہ کہ وہ عرصۂ دراز تک جامعہ پنجاب اور برصغیر کی دیگر جامعات کے مختلف امتحانوں کے ممتحن کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علامہ اقبال ایک معیاری اور مثالی معلّم تھے۔ یہ درست ہے کہ معلّمی کے پیشہ سے ان کی باقاعدہ وابستگی کچھ زیادہ طویل نہیں مگر تعلیم و تعلّم سے ان کا واسطہ عمر بھر رہا۔ وہ علم کے منصب اس کے تقاضوں اور نزاکتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔

علامہ اقبال کی نظر میں استاد کا مقام

مناسب ہوگا کہ اگر اس تحریر کا خاتمہ علامہ اقبال کے ایک ایسے مضمون کی اختتامی سطور پر کیا جائے جو انھوں نے اپنے زمانۂ معلّمی کے ابتدائی ایام میں لکھا تھا۔ معلّم کے منصب و فرائض کے بارے میں علامہ اقبال کی یہ تحریر آج بھی ہمارے لیے راہ نما کی حیثیت رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"معلّم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں کیونکہ آئند نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنا انہی کی قدرت میں ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجہ کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری ملک کے معلموں کی کارگزاری ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے اس ملک میں اس مبارک پیشہ کی وہ قدر نہیں جو ہونی چاہیے۔

معلّم کا فرض تمام فرائض سے زیادہ مشکل اور اہم کیونکہ تمام قسم کی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید ا کے ہاتھ میں ہے اور تمام قسم کی ملکی ترقی کا سرچشمہ اسی کی محن ہے۔ پس تعلیم پیشہ اصحاب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ا پیشہ کے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے اپنے طریق تعلیم اعلیٰ درجے کے علمی اصولوں پر قائم کریں جس کا نتیجہ یق یہ ہوگا کہ ان کے دم قدم کی بدولت علم کا ایک سچا عشق ہو جائے گا جس کی گرمی میں وہ تمدنی اور سیاسی سرسبزی ہے جس سے قومیں معراج کمال تک پہنچ سکتی ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فیض احمد فیض (ایک ذمہ دار اُستاد)

فیض صاحب کے بارے میں انگریزی اور اردو میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جاتا رہے گا لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی شروع کی زندگی جو ایم اے او کالج سے وابستہ تھی اس کے بارے میں شاید ہی کچھ لکھا گیا ہو حالانکہ ان کے شاگردوں میں اچھے خاصے لکھنے والے لوگ موجود تھے، جیسے ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، سیف الدین سیف، ذکی الدین پال وغیرہ، اُن میں سے کوئی بھی یہ کام بڑے احسن طریقے سے کرسکتا تھا کیونکہ یہ سب لوگ ادبی شغف رکھنے کی وجہ سے ان کے کافی قریب رہے اور اس لیے ان کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہوں گے۔ خود میرا تو پڑھنے لکھنے کا معاملہ ذرا ایسا ویسا ہی تھا اور ہے۔

امرتسر ۴۰-۱۹۳۹ء

اس زمانے میں امرتسر میں ۳/ کالج تھے۔ خالصہ کالج، ہندو سبھا کالج اور ایم اے او کالج۔ تقریباً سبھی مسلمان لڑکے میٹرک پاس کرنے کے بعد ایم اے او کالج میں داخلہ لیتے تھے۔ چنانچہ میں اور میرے بہت سے ہم جماعت ۱۹۳۹ء میں اسی کالج میں داخل ہوگئے۔ ایم اے او کالج کے اس وقت کے سبھی اساتذہ بڑے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر تھے۔ اساتذہ میں سید کرامت حسین جعفری، پروفیسر عظیم، پروفیسر شیر محمد اور دیگر کئی صاحبان تھے جنھوں نے قیام پاکستان کے بعد تعلیم کے شعبہ میں بڑا نام پایا اور پھر فیض صاحب بھی تھے۔

امرتسر میں مشاعرہ

اُنہی دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام امرتسر کے ٹاؤن ہال میں ایک مشاعرہ ہوا۔ ہمارے ہم جماعت عارف عبدالمتین (جنھوں نے بعد میں ایک ادیب اور شاعر کے طور پر بڑا نام پایا) بطور سٹیج سیکرٹری خدمات انجام دے رہے تھے۔ ہم سب طالب علم بھی اس مشاعرے میں شامل تھے۔ بہت سے دیگر شعرا کے علاوہ فیض صاحب بھی تشریف لائے اور آکر پرنیچے بیٹھ گئے۔ طلبا اور منتظمین انہیں سٹیج پر بیٹھنے کا کہتے رہے لیکن وہ وہیں دیر تک بیٹھے رہے۔ انھوں نے سفید رنگ کی شیروانی پہن رکھی تھی جو ان پر بڑی سج رہی تھی۔ باری پر اپنا کلام سنایا اور خوب داد وصول کی۔ کون سی نظم سنائی، یہ تو اب یاد نہیں۔

فیض صاحب کی شاعری کے بارے میں ہم طالب علموں نے پہلے ہی سے سن رکھا تھا، اس لیے کالج میں داخلہ کے وقت جہاں اور بہت سی باتوں کا اشتیاق تھا، وہاں فیض صاحب کو دیکھنے اور ملنے کی بھی بڑی خواہش تھی۔ شاعروں کے بارے میں عام تاثر تو یہ ہے کہ یہ مجذوب سے لوگ ہوتے ہیں لیکن فیض صاحب کو جب دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ وہ نہ صرف very well-dressed تھے بلکہ ان کا look بڑا صاف ستھرا تھا۔ وہ عام طور پر پتلون اور شرٹ پہنتے تھے اور سردیوں میں پتلون کوٹ اور ٹائی اور میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ نہایت خوبصورت تھے پتلے، ڈبلے، گھنگھریالے بال، کشادہ پیشانی اور قدرے ویران آنکھیں جو ان کے حسن میں بڑا اضافہ کرتی تھیں۔ ان دنوں امرتسر میں موٹر گاڑیاں چند ہی ہوں گی۔ پروفیسر صاحبان اکثر کالج سائیکلوں پر آتے تھے۔ فیض صاحب کو بھی کئی بار سائیکل پر

ہی کالج آتے دیکھا۔ ہاں البتہ ڈاکٹر تاثیر کے پاس ایک بگھی تھی اور وہ کالج اسی بگھی میں آیا کرتے تھے۔ پائپ بہت پیتے تھے۔ بگھی سے اترتے وقت اکثر ان کے منہ میں پائپ ہوتا تھا۔ فیض صاحب انگریزی نظم پڑھاتے تھے۔ ان کی کلاس کا ہم سب کو بڑا شوق ہوتا تھا اور وقت سے پہلے ہی ہال لڑکوں سے بھر جاتا تھا۔ ہم میں ایک لڑکا شہباز ہوتا تھا، جو پڑھائی میں تو ایسا ہی تھا مگر ہوشیار بہت تھا۔ جب تک فیض صاحب نہ آتے، پروفیسر والی کرسی کے پاس کھڑا ہوکر ان کی نقل کرتا، کبھی ہماری roll call کرتا اور کبھی ان کی آواز میں ہم سے مخاطب ہوتا۔

فیض صاحب کھیل کے میدان میں

فیض صاحب کو کرکٹ کا بہت شوق تھا۔ ایک میچ جو اساتذہ اور ایم اے او کالج کی کرکٹ ٹیم کے مابین الیگزینڈر گراؤنڈ میں کھیلا گیا۔ ان دنوں ایم اے او کالج کی ٹیم بہت اچھی تھی۔ مروت حسین شاہ کپتان تھے۔ اساتذہ میں فیض صاحب، کے ایم اصغر اور دوسرے کئی پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر تاثیر بھی گراؤنڈ میں موجود تھے، مگر صرف تماشائی کے طور پر۔ طالب علم بھی کافی تعداد میں بیٹھے تھے۔ کھیل شروع ہوا تو مروت حسین کو کہا گیا کہ وہ پوری speed سے گیند نہیں کریں گے۔ فیض صاحب کھیلنے کے علاوہ امپائر کی خدمات بھی انجام دے رہے تھے۔ ان کی ایمپائری میں ایک پروفیسر صاحب کو ان سے گلہ رہا کہ انہیں صفر پر کیوں آؤٹ دے دیا، کہہ رہے تھے کچھ تو رعایت کی ہوتی۔ فیض صاحب کہنے لگے کہ بھائی میں کیا کرتا پہلے ہی گیند پر آپ بیچ ہوگئے۔ میں نے اس گیند کو 'نو بال' دے دیا۔ اگلے ہی بال پر آپ کی وکٹ گر گئی میں نے پھر رعایت کی اور کہا کہ آپ ابھی تیار نہ تھے۔ پھر آپ ایل بی ڈبلیو ہوگئے۔ میں کیا کرتا۔ آخر امپائر کی بھی کوئی ذمہ داری ہوتی ہے۔

دوسرا واقعہ ایم اے او کالج اور خالصہ کالج کے درمیان کرکٹ میچ جو یونیورسٹی ٹورنامنٹ کے سلسلہ میں کھیلا جارہا تھا، اس کے بارے میں ہے۔ یہ میچ بھی الیگزینڈر گراؤنڈ میں تھا۔ ہم سب سٹوڈنٹس تو سٹیڈیم کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ خالصہ کالج کے سٹاف کے ساتھ کچھ خواتین بھی تھیں۔ فیض صاحب سے ایک سردارنی صاحبہ بار بار مخاطب ہورہی تھیں۔ فیض صاحب نے غالباً اس کا کوئی جواب دینے کے لیے یا نہ جانے کیوں اپنی کرسی اٹھائی اور ان سردارنی صاحبہ اور ان کے ہمراہ جو سردار صاحب تھے، کے درمیان جگہ بنائی اور وہاں بیٹھ گئے۔ ہم سٹوڈنٹ جو خواہ مخواہ بڑے رومینٹک ہورہے تھے بڑے خوش ہوئے اور پتا نہیں کیا کیا سوچتے رہے۔

فیض صاحب ایک ذمہ دار استاد

فیض صاحب ایک ذمہ دار استاد بھی تھے۔ ۱۹۴۰ء کے آخر میں جب ہمارے ایف اے کے امتحان کے چند ماہ باقی تھے پتا چلا کہ آپ ایم اے او کالج چھوڑ رہے اور ہیلی کالج آف کامرس جارہے ہیں۔ ہماری پوئٹری کا ابھی کچھ کورس باقی تھا اور ہم فکرمند تھے کہ یہ کیسے پورا ہوگا کہ ایک دن انھوں نے خود ہی کہا کہ باقی کورس کے لیے وہ اگلے چند روز گھر پر شام کو کلاسز لیا کریں گے اور جانے سے پہلے کورس مکمل کر جائیں گے۔ چنانچہ ہم تقریباً ایک ہفتہ ان کے گھر جاتے رہے۔ ان کا سول لائنز میں ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا جس میں وہ غالباً اکیلے رہتے تھے۔

شام کی کلاسز کا سلسلہ جس دن ختم ہوا تو ہم سب نے ان سے اپنا کلام سنانے پر اصرار کیا جو وہ عین شفقت سے مان گئے اور دو تین نظمیں سنائیں۔ اس کے بعد ایم اے او کالج کی پڑھائی کے زمانے میں ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ہم سب لوگ بکھر گئے لیکن نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود فیض صاحب کی یاد ہمارے دلوں میں بسی ہوئی ہے۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شیخ امتیاز علی

(۹۰/سال کی عمر میں بھی سحر طاری کرنے والے)

A Living Legend

ملک کے تعلیمی اور ثقافتی مرکز لاہور کے لیے یہ بات یقیناً باعثِ افتخار ہے کہ شیخ امتیاز علی جیسی شخصیت یہاں رہائش پذیر ہے۔ ایک عظیم استاد، اعلیٰ منتظم، سچا پاکستانی اور انتہائی با اصول انسان، اس طرح کا Living legend یورپ کے کسی ملک میں ہوتا تو اس کی شخصیت پر تھیسز لکھے جاتے ۔اس کے نام پر چوکوں اور شاہراؤں کے نام رکھے جاتے اور ٹی وی اینکر ز انٹرویو کے لیے اس کے گھر کے باہر منڈلاتے رہتے۔ مگر ہمارے ہاں کے معیار بے ہودہ اور ترجیحات فرسودہ ہیں۔ ذہنی پستی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں ٹیچر غیر اہم ہے اور تحصیلدار اور تھانیدار وی آئی پیز ہیں۔

۹۰/برس کا پر عزم پروفیسر

چند ہفتے قبل ڈی ایم جی کے زیر تربیت افسروں کو لیکچر دینے کے لیے میں اکیڈمی پہنچا تو شیخ امتیاز علی صاحب لیکچر دے کر نکل رہے تھے۔ میں نے حیران ہوکر پوچھا شیخ صاحب اب بھی لیکچر دینے آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ۹۰/ سال کی عمر میں بھی یہ عظیم استاد جوانوں کے سے جوش و جذبے کے ساتھ علم کا نور بانٹ رہا ہے۔ شیخ صاحب خود کار چلا کر لیکچر دینے کے لیے نہ صرف باقاعدگی سے آتے ہیں بلکہ اپنے مضمون پر ان کی گرفت حیرت انگیز حد تک قائم ہے اور تربیت گاہ میں ہر سال شیخ صاحب کو ہی مقبول ترین سپیکر/لیکچرر قرار دیا جاتا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لاء کالج کا عظیم پرنسپل

برسوں پہلے علی گڑھ یونیورسٹی سے اوّل آنے والے نوجوان کو دہلی یونیورسٹی میں لیکچرر تعینات کر دیا گیا۔ آزاد ملک بننے کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے وابستہ ہوگئے اور صرف ۳۳/سال کی عمر میں ان کے سر پر برصغیر میں قانون کی سب سے بڑی درس گاہ کی سربراہی کا تاج رکھ دیا گیا۔ اسی درس گاہ میں مَیں نے بھی دوسرے ہزاروں طالب علموں کی طرح شیخ صاحب سے بہت کچھ پڑھا اور سیکھا۔ قانون کے ضابطے بھی اور زندگی کے اصول بھی۔ کالج کی مختلف تقریبات میں مجھ سمیت اکثر مقررین نہ صرف کہا کرتے بلکہ دل سے مانتے تھے کہ یونیورسٹی لاء کالج کی امتیازی حیثیت شیخ امتیاز علی کی مرہون منت ہے۔

اُصولوں پر سمجھوتا نہ کرنے والا شخص

شیخ صاحب لاء کالج کے پرنسپل، پنجاب یونیورسٹی

لاہور اور قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر رہے، تعلیم کے مشیر اور وزیر بھی رہے۔ وہ جہاں بھی رہے ان کے ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب اور دوسرے میں اصولوں کا پرچم نظر آیا۔ نہ کتاب بند ہوئی اور نہ کبھی اصولوں کا پرچم سرنگوں ہوا۔ جب بھی حکمرانوں کی خواہشات اصولوں سے متصادم ہوئیں ہمیشہ اُصول فتح یاب رہے۔ شیخ صاحب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے کہ وقت کے حکمران نے بلا کر کہا'' یونیورسٹی انتخابات میں ہمارے امیدوار جیتنے چاہئیں۔'' شیخ الجامعہ نے دو ٹوک جواب دیا'' طلباء کی سیاست سے وائس چانسلر کا کیا سروکار؟'' اُدھر سے اصرار بڑھا، اِدھر سے انکار ہوا۔ بالآخر وائس چانسلر کا چوغہ گورنر ہاؤس میں ہی اتار کر واپس آگئے۔

۷۰/ کی دہائی میں جب کہ عوامی حکومت کا زور شور گلیوں اور بازاروں میں بھی تھا اور قومی اداروں میں بھی ایک مرکزی وزیر سینٹ ہال میں جلسہ کرنا چاہتے تھے۔ جامعہ پنجاب کے سربراہ نے سیاسی جلسہ کی اجازت نہ دی......اُدھر حکومت اور اقتدار کی آن بان......ادھر اصول اور کردار کی شان۔ ضد بڑھی تو وائس چانسلر نے سینٹ ہال کو تالے لگوا دیے۔ اصولوں نے حاکمانہ ضد کو شکست دے دی۔ حاکموں کو اصول صرف تقریروں میں اچھے لگتے ہیں، اصول عملی طور پر نافذ بھی ہوجائیں...... یہ کسی طور گوارا نہیں۔ ۸۰/ کی دہائی میں فوجی حکمران نے قائد اعظم یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے کسی کی سفارش کی۔ وائس چانسلر کی حیثیت سے شیخ صاحب نے انکار کر دیا کہ داخلہ قواعد و ضوابط کے منافی تھا...... آمر نے اصرار کیا تو شیخ الجامعہ کو کہنا پڑا کہ مسٹر پریذیڈنٹ'' آپ کی خواہش مان لی گئی تو یونیورسٹی تباہ ہوجائے گی'' مقتدر حاکم کو بااصول منتظم کے آگے سر جھکانا پڑا۔

ہزاروں طلبہ کو مستفید کرنے والا انسان

یونیورسٹی لاء کالج اور پنجاب اور اسلام آباد کی جامعات کے ذرّے ذرّے پر شیخ صاحب کے نقوشِ پا آج بھی موجود ہیں۔ ان کے در و دیوار گواہ ہیں کہ ان درس گاہوں کو پھر نہ شیخ صاحب جیسا اُستاد نصیب ہوا اور نہ ان جیسا منتظم۔ لاء کالج اور یونیورسٹی میں شیخ صاحب کے رعب اور دبدبہ کے آگے ہر چیز دب جاتی تھی۔ وہ بڑے بڑے پھنے خاں قسم کے بدمعاشوں کو گریبان سے پکڑ کر کلاس سے نکال دیتے مگر کسی میں سر اُٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ داخلہ ۱۰۰/ فیصد میرٹ پر ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں نہ حکمرانوں کی مانتے اور نہ سٹوڈنٹس یونین کے عہدیداروں کو خاطر میں لاتے تھے۔ شیخ صاحب کے ہزاروں شاگرد اعلیٰ ترین مناصب پر فائز رہے اور اب بھی ہیں۔ ان کے شاگردوں میں سے ۵/ چیف جسٹس آف پاکستان رہے مگر شیخ صاحب جن شاگردوں کے نام فخر سے لیتے ہیں ان میں یہ پانچوں شامل نہیں ہیں۔

☆ نہ غرورِ علم نہ تکبر اور شہرت سے بے نیازی

اولڈ راوینز ایسوسی ایشن مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے اپنے سالانہ عشائیے ۲۰۱۲ء میں مہمان خصوصی کے طور پر اس عظیم اُستاد کو مدعو کیا۔ دعوت دینے کا فریضہ میرے ذمہ تھا۔ پہلے تو شیخ صاحب نے صاف انکار کر دیا، میں نے بے حد اصرار کیا تو وہ ایک مودب شاگرد کی ضد بھری درخواست ٹھکرا نہ سکے، شائد اس لیے بھی کہ شاگرد اُستاد کی چوکھٹ سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتے ۔ چیف آرگنائزر نے اپنی تقریر میں وضاحت کی کہ مہمانِ خصوصی کے انتخاب میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ کس کی گاڑی پر جھنڈا لگا ہے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ کس نے ہاتھوں میں اصولوں کا پرچم اٹھا رکھا ہے تو حاضرین نے زوردار تالیوں سے اس اصول کو سراہا۔ کھانے پر ایک سینیٹر صاحب کہہ رہے تھے'' شیخ صاحب کے خطاب نے حاضرین پر سحر طاری کر دیا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے ہارورڈ یا کیمبرج یونیورسٹی کا کوئی پروفیسر تقریر کر رہا ہے۔'' اللہ تعالیٰ شیخ صاحب کو بہت اچھی صحت عطا فرمائے تاکہ وہ ابلاغِ علم اور کردار سازی کا جہاد اسی جوش و ولولہ سے جاری رکھ سکیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پروفیسر وقار عظیم: ایک منفرد اور یکتا شخصیت

سید وقار عظیم اسم با مسمیٰ استاد تھے ان کی شخصیت نہایت باوقار اور بطور انسان اور ایک استاد کے وہ واقعی عظیم تھے۔ آپ دسمبر ۱۹۰۹ء میں الہٰ آباد میں پیدا اور ۱۷ر نومبر ۱۹۷۶ء کو لاہور میں پیوند خاک ہوئے۔

پروفیسر وقار عظیم ایک بڑے فیض رساں معلم اور نقاد ادب ہی نہیں ایک بہت بڑے انسان تھے۔ ہر لحاظ سے ہر مفہوم میں ایک بڑے شریف انسان تھے۔ آپ ایک متحمل مزاج انسان، شیریں بیان استاد اور وسیع المطالعہ نقاد تھے۔ ان کو افسانوی ادب کا ماہر سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے شعری ادب کے مختلف پہلوؤں پر کم مضامین نہیں لکھے۔ ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ان کے تنقیدی مضامین ہیں جن کا دائرہ بے حد وسیع ہے ان کی تحریروں میں قدیم وجدید کی تخصیص کے بغیر بڑے مرتب اور غیر مبہم انداز میں اظہار رائے کیا گیا ہے۔ ان کی تنقیدات میں فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ہیں۔ ایک استاد کا سلجھا ہوا انداز بیان ہے۔ نقاد ادب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک عمدہ نصاب ساز بھی تھے۔

سید وقار عظیم ہمارے ان اساتذہ میں شامل ہیں جنھوں نے ایک سے زائد نسلوں کی تربیت کی۔ آپ اپنے شاگردوں سے روائتی شفقت اور محبت کے سبب طالب علموں میں ہردلعزیز استاد کے طور پر مقبول تھے۔ اپنے مخصوص لباس کھڑے پاجامے اور اس پر خوبصورت شیروانی اور گلے میں مفلر اور پھر اپنے دھیمے اور مہذب لہجہ کے سبب پہلی نظر میں ملنے والے کو متاثر کیے بغیر نہ رہتے تھے۔ کلاس روم میں وہ ایک شفیق استاد اور کلاس روم سے باہر وہ اپنے طالب علموں سے اپنے بچوں کی طرح پیش آتے تھے۔ اس زمانہ میں ان کے فرزند انور وقار عظیم، اختر وقار عظیم اور اطہر وقار عظیم نہایت تعظیم اور ادب کے ساتھ ان کے ہمراہ ہوتے اور وقار صاحب کے شاگردوں سے اپنے حقیقی بھائیوں کی طرح ملتے تھے۔

وقار صاحب کے پڑھانے کا انداز تمام اساتذۂ کرام سے مختلف تھا۔ وہ داستان اور افسانہ اس خوبصورتی کے ساتھ پڑھاتے کہ جی چاہتا تھا کہ اُنھیں سنتے ہی چلے جائیں۔ اُنھوں نے یونیورسٹی اورینٹیل کالج میں بطور استاد اردو زبان وادب کی جو اعلیٰ خدمات سرانجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ یہی نہیں وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تالیف وترجمہ کے بانی بھی تھے۔ اس ادارے کے توسط سے انہوں نے اُردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ تحقیق وتنقید میں ان کے مضامین اور کتابیں تمام اصناف ادب کے حوالے سے نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی بہت سی کتابوں سے اس زمانے میں نہ صرف ادب کے طالب علموں نے اکتساب فیض کیا بلکہ ادب کے قارئین نے بھی بہت کچھ استفادہ کیا اور آج بھی دنیائے ادب میں ان کے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کاموں سے قارئینِ ادب فیض یاب ہو رہے ہیں۔

قدر دانوں اور شاگردوں کے تاثرات

اُستاد مکرم سید وقار عظیم آج بھی اپنے بے شمار شاگردوں کے دلوں میں اپنی یادوں کا گلشن آباد کیے ہوئے ہیں۔ آپ نے ادب کے لیے جو کچھ چھوڑا ہے وہ یقیناً یادگار رہے گا لیکن دلوں میں جو نقش چھوڑے ہیں وہ بھی محو نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ تک طلبہ کی جو تربیت کی تھی اس نے بہت سے نقاد اور افسانہ نویس پیدا کیے۔ ذیل میں اُن کے کچھ قدر دانوں اور شاگردوں کے تاثرات درج کیے جارہے ہیں۔

☆......انتظار حسین کا کہنا ہے" وقار عظیم کی شخصیت میں امتیازی حیثیت یہ نظر آتی ہے کہ اُنھوں نے ایسے زمانے میں افسانہ پر لکھا جب شاعری کی تنقید پر زور تھا۔ میرے خیال میں وہ اردو افسانہ کے پہلے باقاعدہ نقاد ہیں۔ اس حیثیت سے مجھے اردو کے نقادوں میں ان کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ میں ان کی شخصیت سے بھی بے حد متاثر تھا۔ وہ وضع داری اور دھیما پن جو مولانا الطاف حسین حالی سے منسوب چلا آرہا تھا، مجھے اس کا عکس وقار عظیم میں نظر آتا تھا بلکہ مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ وقار عظیم عہد حاضر کے مولانا الطاف حسین حالی تھے۔

☆......عطاء الحق قاسمی بتاتے ہیں "اگر میرے اساتذہ میں ڈاکٹر عبید اللہ، سید وقار عظیم اور چند دوسرے اس پائے کے اساتذہ شامل نہ ہوتے تو مجھے انٹرویوز کے دوران یہ بتانے میں بہت مشکل پیش آتی کہ دوران تعلیم مجھے کن اساتذہ نے متاثر کیا۔ میں کبھی اچھا طالب علم نہیں رہا لیکن سید وقار عظیم کا انداز تدریس اتنا دلکش اور من موہنے والا تھا کہ غیر حاضر رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں یہاں ایک اور بات کا بڑی خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہوں گا کہ اقبالؒ کے لیے میرے دل میں جو محبت اور ان کی عظمت کا جو نقش ہے وہ سراسر پروفیسر وقار عظیم کی دین ہے۔ وہ ہمیں اقبالؒ اور داستانوی ادب پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ان سے جتنا کچھ سیکھا کاش میں اس پر عمل بھی کر پاتا تاکہ میں یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں ہوتا کہ میں سید وقار عظیم کا شاگرد ہوں۔

☆......ڈاکٹر تحسین فراقی لکھتے ہیں" سید وقار عظیم کا شمار اورینٹل کالج کے قابل ذکر اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کا اُردو فکشن کا مطالعہ اطمینان بخش تھا۔ داستانی ادب کے نقاد کی حیثیت سے ان کی حیثیت آج بھی قابل توجہ ہے۔ درآں حال کہ داستانی ادب پر جدید تنقید ان کی تنقیدی کاوشوں سے بہت آگے نکل چکی ہے اور اس کی علامتی جہتوں پر قابل قدر کام شائع ہو چکا اور ہو رہا ہے۔ وقار عظیم ہمارے داستانی سرمائے کے اولین نقادوں میں سے تھے اور اُنھیں اس بات کا کامل شعور تھا کہ داستانیں تہذیب نفس کا ایک اہم ذریعہ ہیں جبکہ قبل ازیں داستانوں کو ہمارے دانشور افسانوں کی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیتے تھے۔ ان کا اسلوبِ بیان سادہ اور سیدھے سبھاؤ کا حامل ہوتا تھا۔ وہ کام کی باتیں کہنے کا فن جانتے تھے۔

☆☆☆

اَن تھک اور بے لوث: ڈاکٹر سٹون

دسمبر کی ایک سرد شام، برف باری کی ہلکی ہلکی پھوار، مَیں کلاس روم کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ ایسے میں کوئی اپنے پتلے لمبے جسم کو خوبصورت چیسٹر میں سمیٹے خراماں خراماں عالمانہ وقار سے قدم اٹھا رہا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا۔ وہ کون تھا؟ میں نہیں جانتا تھا۔ دوسری بار میں نے اسے ڈین کے دفتر سے باہر نکلتے دیکھا۔ متانت، شانِ بے نیازی، چہرے پہ سقراط جیسا تقدس۔ یہ کون بزرگ شخصیت ہے؟ میں نے کالی پروفیسر سے پوچھا۔ تم ان کو نہیں جانتے ؟ واقعی! یہ ڈاکٹر سٹون ہیں۔ پروفیسر ایمرٹس۔ ان کی عمر جانتے ہو؟ نہیں، ۹۰ر سال...... ! ہاں ۹۰ر سال میں نے غور سے دیکھا بیتے برسوں نے اس کے چہرے پر لکیروں کا دبیز جال پھیلا دیا تھا، مگر ہلکی نیلگوں آنکھوں سے چھلکتی زندگی کی چمک دوسروں کو متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ بھئی......! میری پروفیسر بتانے لگی۔ "پروفیسر سٹون یونیورسٹی کے مایہ ناز سکالر ہیں۔ انتظامی امور کے ماہر، کئی اعلیٰ قومی اور بین الاقوامی عہدوں پر کام کر چکے ہیں، کئی کتابوں کے مصنف، محقق امریکا کی مشہور انتظامی، سماجی، ادبی تنظیموں کے روح رواں، پیٹر برگ شہر کی معزز اور سرکردہ شخصیت یہ تو یونیورسٹی کا سرمایہ ہیں۔ دیکھو اس سمسٹر میں پروفیسر اعلیٰ انتظامی امور پر یہ اپنا کورس آفر کر رہے ہیں، یہ کورس مس مت کرنا۔

۱۹۸۸ء میں، مَیں پیٹر برگ کی کارنیگی میلن یونیورسٹی میں انتظامی امور کا کورس مکمل کر رہا تھا۔ میرا آخری سمسٹر تھا، میں مضامین کا انتخاب کر چکا اور آفس کو بھی مطلع کر دیا تھا، مگر پروفیسر سٹون کی علمیت کی کشش مجھے بے چین کیے ہوئے تھی۔ میں نے اپنے کورس ایڈوائزر سے مشورہ کیا۔ "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں"، مگر پروفیسر سٹون بہت سمجھ سوچ کر کورس کے شرکاء کا انتخاب کرتا ہے اور کلاس میں سیٹیں بھی محدود ہوتی ہیں۔" ہاں! ملاقات کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔" میں نے سوچا کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضروری ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب۔ دوسرے دن میں پروفیسر سٹون کے دفتر میں موجود تھا۔ مدعا بیان کیا۔ اُنھوں نے میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ دوسرے کورسز میں گریڈ کیسے ہیں؟ لہجے کی اپنائیت حوصلہ افزا تھی۔

''خاصے مناسب ہیں'' میں نے جواب دیا۔ میرا خیال تھا آفس سے تصدیق کی جائے گی۔ ایڈوائزر سے رپورٹ طلب کرنا ہوگی۔ قانونی تاویلات ہوں گی۔ دفتری تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ پروفیسر نے کچھ تامل کیا، کچھ سوچا، مختصر بات چیت کا دور چلا، ایک بار پھر میرا جائزہ لیا گیا۔ کافی پیو گے؟ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بات بن گئی۔ سیمسٹر کا آغاز ۱۱ر جنوری سے ہوا۔ پروفیسر سٹون کی کلاس ہر سوموار ۵ر بجے شام تا رات ۸ر بجے ہوتی۔ یہ ۲۰ر شرکاء کی مخلوط کلاس تھی۔ کچھ نوجوان طلبہ وطالبات، اور کچھ امریکی اداروں سے آئے ہوئے اعلیٰ عہدیداران، فقط میں ہی ایک غیر ملکی طالب علم تھا، جس کو کلاس میں شامل کیا گیا۔

پیٹر برگ میں بلا کی سردی پڑتی ہے۔ جنوری، فروری کی تیز ہوا میں برف باری رگوں میں رواں جوان خون کو بھی منجمد کر دیتی ہے۔ ایسی سخت شاموں کو اپنے گرم کمروں سے نکلنا بھلا کب اچھا لگتا ہے۔ میں بچوں کی طرح سوچتا آج پروفیسر سٹون کلاس میں نہیں آئے گا۔ گاڑی کا انجن فیل ہوسکتا ہے۔ اس بڑھاپے کے عالم میں چھوٹی موٹی علالت ہو ہی جاتی ہے، مگر یوں نہ تھا۔ میں نے فقط چاہا تھا کہ یوں ہوجائے۔ ہر شام پروفیسر سٹون کلاس میں وقت سے پہلے موجود ہوتا، چہکتا مہکتا، مسکراتا وہ پورے سیمسٹر میں ایک بار بھی غیر حاضر نہیں ہوا۔ ایک بار بھی اس کی گاڑی کا انجن فیل نہیں ہوا۔ وہ کبھی کلاس میں دیر سے نہیں آیا۔

پروفیسر کا درس و تدریس کا طریقہ یکسر مختلف تھا۔ امتحانوں سے اسے خاصی چڑ تھی۔ ہر ہفتہ دو ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ریڈنگ میٹریل دے دیا جاتا۔ یہ ریڈنگ میٹریل تازہ ترین کتب رسائل اور جرائد سے لیے گئے مضامین اور آرٹیکلز کا مجموعہ ہوتا۔ میں اکثر سوچتا کہ یہ ۹۰ر برس کا پروفیسر اس ضعیفی کے عالم میں یہ سب کچھ کیسے اور کس طرح کر پاتا ہے۔ یہ تو سخت تھکا دینے والی مشقت ہے۔ پھر یہ کام ایک روز ایک ہفتہ کا معمول نہ تھا۔ یہ تو مسلسل ذہنی تحقیقی عمل ہے وہ نہ جانے کون سے لمحے آرام کرتا ہوگا؟ کیا اس کے پاس کوئی جادو کا چراغ ہے؟ کیا اس کے قبضۂ قدرت میں جنات ہیں جو سب کچھ آناً فاناً کر ڈالتے ہیں۔ یہ سب سوالات میرے ذہن میں اٹھتے۔ جن کا جواب میرے پاس نہ تھا اور نہ اب ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ ان مضامین و آرٹیکلز پر کلاس میں سیر حاصل بحث ہوتی۔ ایک ایک مسئلہ کا عملی نکتہ نظر سے جائزہ لیا جاتا۔

امریکی طالب علم خاصے بے رحم ہوتے ہیں۔ وہ مشرق کے روایتی طالب علم کی طرح استاد سے عاجزی اور نیاز مندی سے پیش نہیں آتے۔ وہ استاد پر تابڑ توڑ حملے کرتے ہیں۔ سوالوں کی بوچھاڑ کر دی جاتی ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ امریکی طالب علم چٹکلوں سے بہلائے نہیں جاسکتے۔ مفروضوں سے قائل نہیں ہو پاتے۔ مبہم جوابات انہیں برافروختہ کر دیتے ہیں۔ وہ ہر بات کا واضح، ٹھوس اور تفصیلی جواب چاہتے ہیں۔ میں نے پروفیسر سٹون کو اس براہین و دلائل کی جنگ میں کبھی پسپا ہوتے نہیں دیکھا۔ اس علمی چومکھی لڑائی میں کسی ایک موقع پر بھی اسے مات نہ ہوئی۔ پروفیسر سٹون نے ہر ایک آرٹیکل کا مطالعہ کیا ہوتا تھا۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اس کی جبیں پر شکن نہ آتی۔ لہجہ میں تھکن، نہ لکنت، جھنجلاہٹ، نہ بوکھلاہٹ، اسے اپنے سبجیکٹ پر عبور حاصل تھا۔ اس کے پاس تجربات اور مشاہدات کا انمول خزینہ تھا اور جب کبھی وقت گراں گزرنے لگتا وہ طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں بکھیر دیتا۔ پروفیسر ۹۰ر سال کا تھا۔ اس کی جرأت، اس کا جذبہ، اس کی محنت مجھے حیران کیے دیتی تھی۔ میں ایک خوبصورت تجربہ سے گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا تھا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کبھی سوچتا کہ وہ استاد ہے یا کوئی مافوق الفطرت چیز ہے۔

مڈ سیمسٹر میں کورس کا جائزہ لیا گیا اس موقع پر

طلبہ کسی رو رعایت کے بغیر، خوف خطرے سے بے نیاز اپنی رائے کا تحریری طور پر اظہار کرتے ہیں۔ سوالات کافی واضح اور غیر مبہم ہوتے ہیں۔ کیا یہ کورس آپ کو پسند ہیں؟ کیا یہ آپ کے تقاضے پورے کرتا ہے؟ پروفیسر کی کارکردگی کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا آپ کورس میں تبدیلی کے خواہاں ہیں؟ وغیرہ وغیرہ ۲ر ہفتہ بعد پروفیسر سٹون کلاس میں تشریف لائے عینک درست کی، آلہ سماعت کو سیٹ کیا اور کہنے لگے:

''مجھے آپ کی آرا سے آگاہ کیا گیا ہے آپ لوگوں نے کورس میں کوتاہیوں اور خامیوں کی نشان دہی کی ہے آپ نے میرے طرز استدلال کے بارے میں بھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کورس میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں آپ کی آراء اور تجاویز کی روشنی میں کورس میں ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔ آئیے..... آپ ہم مل کر اس موضوع پر گفتگو کریں۔''

پروفیسر سٹون کی علمیت مسلمہ تھی۔ وہ یونیورسٹی کا ایک سرکردہ پروفیسر تھا۔ اس کا اپنی خامیوں کے نقائص کے بارے میں برملا اعتراف حیران کن تھا۔ میرے خیال میں یہ عقلی ایمانداری کی اعلیٰ مثال تھی۔ ہم اکثر اپنی رائے بدلنا، غلطی کو تسلیم کرنا کمزوری گردانتے ہیں۔ پھر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تو شاذ ہی اپنی علمی شکست کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم سب کو اپنی اَنا بہت عزیز ہوتی ہے۔

پروفیسر سٹون کون ہے؟ اس کا خمیر کس مٹی سے اٹھا ہے؟ میں اس شخصیت کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا، اسے جاننا چاہتا تھا۔ میرا اشتیاق بڑھتا گیا۔ ایک دوپہر ہم دونوں لنچ پر اکٹھے تھے۔ میں نے دیکھا وہ خوراک کے بارے میں بے حد محتاط تھا، تھوڑا سا پھل، میوہ، چھوٹا سا پنیر کا ٹکڑا، ہلکا پھلکا سینڈوچ، وہ غیر معمولی روحانی حس کا مالک تھا، وہ مذہبی تھا مگر جنونی ہرگز نہ تھا۔ اس کا ذہن ہر تعصب سے مبرا تھا۔ ریاکاری، منافقت سے دور، رنگ و نسل اور ذات کے تعصبات سے اسے گھن آتی تھی۔ اسے گھریلو زندگی سے پیار تھا۔ اپنی بیوی نینسی سے اس کی ۵۰ر سالہ رفاقت تھی۔ ان کے ۲ر بچے دور دراز شہروں میں اپنی اپنی دنیا میں مصروف عمل تھے۔

کورس ختم ہونے کو تھا۔ ایک دن پروفیسر سٹون نے اپنے ملائم لہجہ میں کہا'' دوستو! میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ میں اگلے ۲ر سال کا کورس مرتب کر رہا ہوں۔ مجھے سلیبس کی از سرِ نو منصوبہ بندی کرنی ہے۔ مجھے آپ لوگوں کی تجاویز درکار ہیں۔ مجھے آپ کا تعاون چاہیے۔''

چہرے حیرت سے تصویر بن گئے۔ کئی لبوں پر معنی خیز مسکراہٹیں بکھر گئیں۔ کئی ذہنوں میں سوال اٹھے۔ یہ تو پروفیسر سٹون کے چل چلاؤ کے دن ہیں۔ کسی دن، کسی شام اس کی تجہیز و تکفین کی اطلاع مل سکتی ہے۔ پروفیسر سٹون نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ اس بوڑھے پروفیسر میں حیران کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ میں سمجھتا ہوں اسے طبعی موت پر یقین تھا۔ اس کی قطعیت کا مکمل احساس تھا۔

اس کے لیے ہر گھڑی ذات کی تسکین کی گھڑی تھی، بے مقصد، بے مصرف زندگی ذات کی نفی ہے، حیات کی نفی ہے۔ وقت سے پہلے موت کی دلیل۔ تبھی تو وہ ہر لحظہ مصروف کار تھا۔ جاوداں، پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی۔ سوچتا ہوں، پروفیسر سٹون کے نہاں خانے میں کہیں یہ یقین پنہاں تھا کہ موت کے بعد ایک نیا در کھلے گا۔ نئی بستیاں آباد ہوں گی، اور زندگی تجربات کے وسیع تر سمندر میں موجزن ہوگی۔

کون کہتا ہے موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

۱۹۹۲ء میں پروفیسر ڈاکٹر سٹون ۹۴ر سال کا تھا۔ اب، اُسی جوش اور جذبہ سے کام کر رہا تھا کیونکہ اس کا جذبہ جوان تھا۔ اس کے خواب زندہ تھے۔ رُتیں آئیں گی، رُتیں جائیں گی، جب تک میں زندہ ہوں پروفیسر سٹون میرے ذہن میں زندہ رہے گا کیونکہ میں نے اس سے زندہ رہنے کا فن سیکھا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اشعب (حرص و طمع میں ضرب المثل)

اشعب اہل عرب میں لالچی ہونے کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اپنی حریص طبیعت اور حد سے زیادہ طمع کی وجہ سے وہ حرص و طمع کی ضرب المثل بن گیا۔ عرب کسی شخص کے لالچ کو بیان کرنا چاہتے تو کہتے تھے کہ فلاں شخص تو اشعب سے بھی زیادہ لالچی ہے

معاذ امین

خوش فہمی

اشعب کا اپنا کہنا ہے کہ جب بھی میں کسی جنازے میں شریک ہوا اور وہاں دو آدمیوں کو سرگوشی میں مصروف پایا تو ہمیشہ مجھے یہی گمان ہوا کہ شاید مرنے والا میرے لیے کوئی وصیت کر کے گیا ہے اور ان کی گفتگو اسی سلسلہ میں ہو رہی ہے۔ اشعب اپنے بارے میں کہا کرتا تھا کہ جب بھی میرے سامنے کوئی شخص اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے تو میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ اب یہ ضرور میرے لیے کچھ روپے نکالے گا اور پھر اسے میرے ہاتھوں میں تھما دے گا۔

اشعب عرب میں حرص اور لالچ کا استعارہ بن چکا تھا۔ اشعب بے چارہ تو کب کا مرکھپ چکا۔ ماضی کا قصہ بن چکا لیکن ہمارے ہاں تو اشعبوں کی ایسی فوج ظفر موج ہے جن کی کہانیاں آنے والے زمانوں میں کہی سنی اور لکھی جائیں گی۔ یہ ایسے اشعب ہیں کہ جن کی حرص و طمع کے متعلق خبریں آئے روز اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ جن کے کرپشن اور مالیاتی اسکینڈل میں ملوث ہونے پر روزانہ ٹاک شوز میں بحث ہوتی ہے۔ جن کے جہنم نما پیٹ اور دوزخی انتڑیاں بھرنے کو نہیں آرہیں۔ جو ہر وقت عوام کے مال و دولت کو لوٹنے اور ملکی املاک کو نیلام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے بینک اکاؤنٹ بھرنے کے لیے ملک کو بھکاری بنا دیا ہے۔ جو اپنے ذاتی مفادات کو نقصان پہنچنے کی وجہ سے عدلیہ کے فیصلوں کی بے توقیری کرتے ہیں۔ کون جانے ان اشعبوں کا پیٹ کب بھرے گا؟ ان کی رگ رگ میں بھڑکتی ہوئی حرص و ہوس کی آگ کب کم ہوگی؟ عوام کے مال اور اثاثوں سے کب ان کی نظریں ہٹیں گی؟ بظاہر تو دور دور تک اس بات کا امکان نظر نہیں آتا۔ ایسی صورت میں ایک قبر کی مٹی ہی لالچ کے گڑھوں کو پُر کیا کرتی ہے۔

اپنے اشعبوں کو دیکھ کر تو عرب کا اشعب ایک معصوم سا جوکر لگتا ہے۔ جس غریب کو لالچ اور طمع کی الف ب کی بھی خبر نہ تھی۔

آپ کیا کہتے ہیں؟

■

مفت کی کھجوریں

کتبِ تاریخ میں اشعب کے کئی واقعات منقول ہیں۔ اصمعیؒ کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ کچھ بچے اشعب کے پیچھے لگ گئے اور اسے طرح طرح سے ستانے لگے۔ اشعب تنگ آگیا تو اسے ایک ترکیب سوجھی۔ وہ بچوں سے بولا "جاؤ! سالم بن عبداللہ کھجوریں بانٹ رہے ہیں۔" بچے یہ سن کر سالم بن عبداللہ کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ اشعب نے یہ دیکھا تو خود بھی بچوں کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولا اس خیال سے بھاگا تھا کہ اگر یہ بات سچی ہوگئی اور سالم بن عبداللہ واقعی کھجوریں تقسیم کرنے لگا تو میں مفت کی کھجوروں سے محروم ہی نہ رہ جاؤں۔

عین اُسی وقت فون بجا
ڈائریکٹر پروگرام لائن پر تھے

نمک کا اثر

نگہت یاسمین

نوجوانوں کے ایک کالج میں ہونے والے مباحثہ کی داستان
اُن کے دل بے اطمینانی اور لفظ غصہ سے بھرے تھے
اچانک ناکامی کا ملبہ اُٹھانے کی ہمت ایک لڑکی نے کرلی

"پاکستان ایک ناکام ریاست؟" پس منظر میں آویزاں سیاہ بینر پر سنہری روشنائی سے چمک رہا تھا۔ کالج کے طلبا و طالبات ہوں اور موضوع بھی اتنا حساس ہو تو تصور میں جوش اور جنون کے سوا کچھ نہیں آتا۔ سو ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں اُبھرتے ہوئے پروڈیوسر عامر نے جب اگلی سہ ماہی کے لیے سٹوڈیو میں ٹاک شو کے بجائے تعلیمی اداروں میں مباحثہ کرانے کا خیال پیش کیا تو سب نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔

"بھئی لڑکوں کو قابو میں رکھنا مشکل ہوگا۔"

"توڑ پھوڑ کی ذمہ داری کون لے گا؟" مگر مخالفت کے باوجود اس کے خیال کو منظور کر لیا گیا اور اب یوں لگ رہا تھا کہ پروگرام اور چینل دونوں شہرت کی بلندیوں پر ہوں گے۔ اگرچہ سکرپٹ میں شانے اچکانے، ہاتھ ہلانے تک کی ہدایات درج ہوتی تھیں اور آخر میں ایوانِ طلبہ سے من چاہا نتیجہ اخذ کرانا طے شدہ ہوتا مگر یوں کہ دیکھنے والے اسے حقیقی سمجھتے۔ سو ماحول کی گھٹن اور جذبات کی عکاسی بھی ہو جاتی۔

دھواں دھار بحث جاری تھی۔ نسلِ نو ماضی کی مختلف تعبیر کر رہی تھی۔ "اگر انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے، اپنی سوجھ بوجھ سے حکومت کا انتظام اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ میں لے لیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟؟'' پولیٹیکل سائنس کا انتہائی بااعتماد مقرر طالب علم طنزیہ مسکرایا۔

''اپنی تاریخ اور ورثہ کی دُہائیاں دینے والے بھول جاتے ہیں کہ اس سے قبل یہاں مسلمانوں نے تاراج توڑ حملے کیے تھے اور غارت گری کے بعد عنانِ اقتدار سنبھالا تھا۔ یہ تو زمانے کا اُلٹ پھیر ہے۔ انگریزوں کی روشن خیالی، انصاف پسندی کی داد دیں کہ غلاموں کی خواہش پر آزادی عطا کردی۔'' اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''مسلمانوں کی جنگِ آزادی انگریزوں کے لیے غدر ہے۔ آج تاریخ کا طالب علم دونوں کو یکساں سمجھتا ہے۔'' ایک اور طالب علم نے ہرزہ سرائی کی۔

''اسی لکیر کے فقیر ہونے کے سبب یہی پاکستان آج یکا وتنہا ہے۔ ۶۴ برس کے بعد بھی اقوامِ عالم میں کسی کو اپنا ہم نوا نہ بنا سکا۔ ساری خارجہ اور علاقائی پالیسیاں ازکارِ رفتہ ہیں۔'' دوسرے نے گویا مصرعِ ثانی پیش کیا۔

''کاش! میں وہاں ہوتا۔'' ٹی وی کے آگے بیٹھے عامر کی مُٹھیاں بھنچ گئیں۔ اپنا پرانا خاندانی مرض دردِ شقیقہ اٹھنے پر پورا پروگرام اپنے معاون ہارون پر چھوڑنا پڑا تھا۔

مگر ابھی تو ان طالب علموں کی جانب داری نے سب کو ششدر کردیا تھا۔ ہمارے درمیان اپنی تاریخ سے اس درجہ مغائرت، اپنے نظریات سے اتنا بُعد جنگِ آزادی اور غدر کو یکساں سمجھنے والے اتنے بے باک ہوگئے کہ کھلے بندوں اظہار کرنے لگے۔ اگر بات اپنی کم علمی، نااہلی تک محدود رہتی تو مناسب تھا مگر ان کی جرأت انتہائی معنی خیز تھی۔

''تو گویا پاکستان کی بنیاد ہی..... میزبان نے چبا چبا کر بولنا شروع کیا۔

''مگر یہ کیا! عامر کا افسوس زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ حاضرین و ناظرین بھی ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔ جب ہال کے آخری سرے سے گہری آنکھوں والا ایک طالب علم کھڑا ہوگیا۔ آواز بغیر مائیک کے گونج رہی تھی۔

''فرق پڑتا ہے! بالکل فرق پڑتا ہے! مسلمانوں نے سازش کے جال نہیں بُنے تھے۔ مکر وفریب، حیلوں بہانوں سے اہلِ ہندوستان سے اقتدار نہیں چھینا تھا۔ اپنے نظریہ کی اخلاقی برتری ثابت کی تھی اور یہ نظریہ آج بھی تمام فکرہائے حیات پر فوقیت رکھتا ہے۔ کمی تو ہمارے عمل کی ہے۔''

''بے آئین جمہوریت پر نازاں انگریز، بلیک ہول اور قصہ خوانی بازار جیسے سانحات کو تاریخ میں اپنی کامیابیوں کے نام سے درج کراتے ہیں۔ ٹریفلگر اسکوائر میں نصب جنرل ڈائر کا مجسمہ ان کی روشن خیالی، انصاف پسندی کا پول کھول دیتا ہے جنھوں نے بہادر شاہ ظفر کے ۱۰ بیٹوں کے سر خوان میں سجا کر پیش کیے۔

آخر کیوں ہم اپنی تاریخ اور ورثہ کو یکسر فراموش کردیں؟؟ پاکستان ناکام ریاست تھا اور نہ ہے۔''

اس سے پہلے کہ حاضرین فیصلہ کرتے داد یا احتجاج، اگلی قطار سے جدید انداز واطوار کی لڑکی تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔

''بالکل، ہم کیوں اپنے تحفظ اور اصولِ معاشیات سے دست بردار ہوں؟؟ بس استعمار کے گماشتے معاشرے میں مایوسی پھیلانے کے بجائے یہاں سے روانہ ہوجائیں اور پاکستان کے قیمتی اثاثے لوٹ کھسوٹ کر جو دولت بیرونِ ملک منتقل کی گئی ہے وہ واپس لے آئیں تو پاکستان ناکام ریاست نہیں رہے گا۔''

ان غیر متوقع ناپسندیدہ جوابی حملوں سے پروگرام میں افراتفری نظر آنے لگی تو ایک کمرشل کا اعلان ہوگیا۔ رنگ برنگے اشتہارات کے بعد پروگرام شروع ہوا۔ پاکستان کی ناکامی فیصد کارکردگی، اعداد وشمار کے آئینے میں ثابت کی جانے لگی۔ مصنوعی گرما گرمی بھی ہوئی۔ تند و سوالات بھی اٹھائے گئے۔ ملک کی ناکامی کی وجوہات پان اسلام ازم پر ڈالی گئیں۔ مگر حیرت انگیز طور پر آخر میں جمع تفریق کرکے بھی جواب صفر نہیں آیا۔ طلبہ کی اکثریت نے اپنی تاریخ اور نظریے سے دست بردار ہونے سے انکار کردیا تھا۔ یوں طے شدہ نتیجہ ''پاکستان ایک

ریاست ہے'' نشر نہ ہوسکا۔ میزبان کو حیرت اور صدمہ کے ساتھ پروگرام کا اختتام کرنا پڑا۔ نہ جانے سٹوڈیو میں کون بیٹھا تھا کہ بطور جھلکیاں، مکالمے بار بار دکھا کر رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔

عامر ایم ڈی کے بارے میں سوچنے لگا ''وہ کس قدر نالاں ہوں گے۔ انھوں نے پروگرام کی لائین طے کی تھی اور پروگرام بالکل الٹ گیا تھا۔ عین اسی وقت فون بجا۔ دوسری طرف ڈائریکٹر پروگرامز تھے۔

''اسلام آباد سے فون آرہے ہیں۔ کل آفس آکر ملو۔ وہ کہتے ہیں ٹی وی پر کیا تماشا لگا رکھا ہے؟''

صائمہ نے کھانے کے بعد دوا اور پانی کا گلاس پکڑایا تو آنکھوں میں نمی جھلک رہی تھی۔ چہرہ سُتا ہوا تھا۔ عامر نے بغور دیکھا تو پلکیں جھکا کر مسکراہٹ سجالی۔ ''درد کچھ کم ہوا؟''

''ہاں کافی بہتر ہے کیونکہ ایم ڈی نے بلایا ہے۔ میں نے طے کیا ہے کہ جواب دہی کے لیے ناکامی کا ملبہ ہارون پر نہیں گراؤں گا۔ خود ذمہ داری لوں گا۔'' اب وہ مطمئن تھا۔

''اور تمھارے منہ بسورنے کا سبب کیا ہے؟؟'' صائمہ نے آگے بڑھ کر شیلف میں رکھا اخبار اٹھا کر سامنے کردیا۔ چند سطریں ہائی لائٹ کی ہوئی تھیں۔

''پچھلے ۶۰ برسوں میں پاکستان نے ۳۰ ارب ڈالر کے قرضے لیے لیکن گزشتہ ۳ برسوں میں ۳۲ ارب ڈالر سے زیادہ کے۔ یہ قرضے کیوں لیے گئے؟ ملک میں کہاں لگائے گئے؟ عوام کو کیا سہولت ملی؟ اس سوال کا جواب جس کے پاس بھی ہے وہ بتائے گا نہیں۔'' عامر مسکرایا۔

''آپ کا چینل ۲۰ گھنٹے کی لوڈشیڈنگ اور بیروزگار نوجوان کو رشتہ مانگنے پر زدوکوب کرنے کی خبر ایک سانس میں سنا رہا ہے۔ پریشانی تو ہوگی۔ اصل مسئلے پر کوئی بات ہی نہیں کررہا۔''

''تو گویا تم نے جانچ پڑتال مکمل کرلی؟ اُف! صائمہ تمھاری مہارت تو کیمسٹری ہے۔ معاشی تجزیہ تمھارے بس کی بات نہیں۔'' عامر نے بات پلٹنا چاہی۔

''مگر میں ایک گرہستن بھی ہوں۔ مجھے علم ہے۔ چھوٹا سا آنگن رہن رکھنے سے ساہوکار کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرنی ہوگی۔ گھر کے درودیوار میں پڑنے والی دراڑ مجھے اور میرے خاندان کو غیر محفوظ بنا رہی ہے۔'' صائمہ کے لفظ پھسل گئے۔

''اتنی سادہ سی بات حکمرانوں کو کیوں نہیں سوجھتی؟'' ایک گرہستن نے عامر کو لاجواب کردیا تھا۔

اگلی صبح ڈائریکٹر پروگرامز کے آفس میں عامر اور ہارون ڈانٹ ڈپٹ کے منتظر تھے۔ معافی تلافی کے الفاظ دونوں کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہے تھے۔ جب ڈائریکٹر صاحب نے یہ کہہ کر حیران کردیا۔

'تم فکر نہ کرو۔ میں نے پروگرام دیکھا ہے، مزہ آیا۔ اگر کسی نے جانا ہوا تو صرف تم دونوں نہیں جاؤ گے میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ آخر صرف ترقی پسندوں کے چاچے مامے تو نہیں ہوتے۔ اس ملک کا نمک کھایا ہے کبھی تو اثر ہوگا۔ میں سنبھال لوں گا۔ جاؤ اسی طرح ڈھکے چھپے لگے رہو۔''

عامر نے اُڑ کر گھر جانا چاہا کہ رات کس خلجان میں گزری تھی۔ وہ صائمہ کو ایک مسکراہٹ بکھیرنے والی خبر سنانا چاہتا تھا۔

■

عمل کا بیج

کسی دن کی قدر و قیمت اس چیز سے طے نہ کریں کہ آج آپ نے کیا فصل کاٹی ہے بلکہ اس چیز سے طے کریں کہ آپ نے آج کیا بیج بوئے ہیں۔

(رابرٹ بوسٹن سٹیونسن)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آؤ کہ سر اُٹھا کے چلیں

اے لوگو سنو اور غور کرو!

- موجودہ نظام زندگی ظلم و استحصال اور کرپشن کی بنیادوں پر قائم شیطانی نظام ہے۔
- پچاس مرتبہ الیکشن کروالو یہی لوگ اسمبلیوں میں آئیں گے، وہ بھی
- لوٹ مار اور کرپشن کے نئے عزائم اور ہتھکنڈوں کے ساتھ۔

- اسلامی نظام زندگی عدل و احسان کی بنیاد پر قائم رب العلمین کا نظام ہے جو تمام لوگوں کی ربوبیت کا ضامن ہے۔
- اسلامی معیشت قوم کو اپنے پاؤں پہ کھڑا کر دیتی ہے، اندرونی اور بیرونی قرضوں سے نجات دلا کر مُردہ قوم کو زندہ کر دیتی ہے۔

☆ مسلمانو! زندگی چاہتے ہو تو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف آؤ وہ تمہیں پکار رہے ہیں تاکہ تمہیں زندہ کریں یعنی قُرآن اور اسوۂ حسنہ کے مطابق نظام اسلام قائم کرو اور زندہ ہو جاؤ۔ (الانفال 24:8)۔

☆ مسلمانو! نکلو اللہ کے حکم کے ماتحت اور جہاد یعنی تن من دھن کے ساتھ حسین جدوجُہد کرو نظام اسلام کے نفاذ کے لیے کیونکہ اس کام کے لیے اللہ نے تمہیں چن لیا ہے (الحج 78:22)۔

☆ مسلمانو! جب تُم جہاد کے لیے نکلو گے تو اللہ تعالیٰ پانچ ہزار چیدہ چیدہ فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کو ہوگا اور تمہیں کامیابی سے ہمکنار کرے گا (آل عمران 125:3)۔

آیئے! لوگوں کی غلامی سے نکلیں اور اللہ کی غلامی اختیار کریں۔

☆ اِن الحُکمُ اِلّا لِلّٰہ (الانعام 57:6) "کوئی حکم نہیں سوائے اللہ کے حکم کے"۔ لا الہ الا اللہ "کوئی نہیں حاکم سوائے اللہ کے"۔

باقی سب کو چھوڑ دو قُرآن سے ناطہ جوڑ لو

(نظام اسلام اور اُس کے نفاذ کی مکمل آگاہی کے لیے رابطہ کر کے کتابچے مُفت حاصل کریں)۔

تحریک رحمت

E-155/A-1، غزنی لین، نیو سپر ٹاؤن، لاہور چھاؤنی فون: 042-36621120-21 موبائل: 0323-4011616

ای میل: tehreek-e-rehmat@hotmail.com

ڈاکوؤں کی میرٹ پالیسی

تنویر شہزاد (صدر ایمبرا لاہور)

ایک ایسے وقت میں جب پاکستان میں یہ تاثر عام ہے کہ یہاں تقرریوں، نوکریوں اور ٹھیکوں سمیت بہت سے فیصلے میرٹ پر نہیں ہوتے، یہ بات بہت سے پاکستانیوں کے لیے حیرت کا باعث ہوگی کہ پاکستان میں چور اور ڈاکو ۱۰۰ فیصد میرٹ پر اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ تمام تر تعصبات کے باوجود یہ صرف پاکستان کے چور اور ڈاکو ہی تو ہیں جو رنگ اور نسل کی تمیز کیے بغیر میرٹ پر ڈاکے مار رہے ہیں۔ وہ عام آدمی کے ساتھ ساتھ حساس اداروں کے افسروں، پولیس اہلکاروں، صحافیوں، وفاقی اور صوبائی وزیروں کے علاوہ ارکان پارلیمنٹ کو لوٹ لوٹ کر معاشرے کے محمودوں اور ایازوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کرتے جا رہے ہیں۔

ابھی چند دن پہلے ن لیگ کے لاہور شہر میں ن لیگ کی ایم این اے سمیرا یاسر سے دن دیہاڑے نقدی اور زیورات چھین لیے گئے۔ اقبال ظفر جھگڑا ایک مرتبہ علامہ اقبال ٹاون میں اپنے پرس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ گزشتہ ماہ سینئر صحافی سجاد میر کے گھر کے اندر سے چور ان کی نئی گاڑی لے اڑے۔

اُدھر کراچی میں ڈاکو پروفیسر غفور احمد کی موجودگی میں ان کے گھر کا قیمتی سامان اور نقدی لوٹ کر لے گئے۔ عمران خان اپنے بچوں کو گھمانے مارگلہ گئے اور اپنا موبائل، پرس اور کریڈٹ کارڈ ڈاکوؤں کو دے کر واپس لوٹ سکے۔ ق لیگ کی راہنما سابق وزیر نیلوفر بختیار سے ان کا پرس اسلام آباد کی سُپر مارکیٹ میں اس وقت چھینا گیا۔

گلوکار علی ظفر کو ڈیفنس کے اس علاقہ سے تاوان کے لیے اغوا کیا گیا جہاں سے کچھ عرصہ پہلے ایک صوبائی وزیر کی جھنڈے والی گاڑی دن دیہاڑے چھین لی گئی تھی۔ صوبائی وزیر کھیل نعیم اللہ خان شاہانی بھی تاوان کے لیے اغوا ہوئے۔ ایک حاضر سروس ایڈیشنل انسپکٹر جنرل پولیس چوہدری تصدق حسین کو لاہور کی لبرٹی مارکیٹ میں صرف اس لیے گولی مار دی گئی کہ انھوں نے پرس چھیننے کی واردات کے دوران مزاحمت کی کوشش کی تھی۔

پاکستان کے نائب وزیراعظم چوہدری پرویز الٰہی چند سال پہلے وزیر اعلیٰ پنجاب کے طور پر ننکانہ صاحب کے ایک گوردوارے میں بابا گورو نانک کے جنم دن کے حوالے سے ہونے والی ایک تقریب میں تشریف لائے تھے، وہاں کوئی اُچکا ان کے جوتے لے اڑا، ایک دوسرے چور نے گورنر ہاوس سے پنجاب کے موجودہ گورنر سردار لطیف کھوسہ کے بیٹے کا لیپ ٹاپ چوری کر لیا۔

جرائم کی دنیا پر نظر رکھنے والے لاہور کے کرائم رپورٹر بتاتے ہیں کہ سابق آرمی چیف جنرل (ر) جہانگیر کرامت کے گھر بھی ایک واردات ہو چکی ہے۔ ان کے مطابق ڈاکوؤں کا نشانہ بننے والوں میں پرویز مشرف، نواز شریف اور سابق گورنر پنجاب خالد مقبول کے قریبی عزیز بھی شامل ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں اگرچہ قانون سب کے لیے یکساں نہیں ہے، لیکن چوریاں اور ڈکیتیاں سب کے لیے بلا امتیاز موجود ہیں۔ غریب کی جیب بھی کٹتی ہے اور امیر کا قیمتی موبائل بھی دن دیہاڑے چھین لیا جاتا ہے۔ ہمارے ڈاکوؤں نے جس طرح میرٹ پر ڈاکے مار مار کر میرٹ کا بول بالا کیا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے کبھی کبھار جی چاہتا ہے کہ ان ڈاکوؤں کو اقتدار کے ایوانوں میں بھیج دیا جائے تاکہ وہاں بھی فیصلے میرٹ پر ہو سکیں اور ملک کی گورننس کچھ بہتر ہو سکے۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہاں ڈاکوؤں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہمیں تو ڈر یہ ہے کہ کہیں اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ کر یہ ڈاکو عدالت کو ہی نہ آنکھیں دکھانا شروع کر دیں کہ ہم جسے چاہیں لوٹیں ہمیں سپریم کورٹ بھی نہیں پوچھ سکتی کیونکہ اصل عدالت تو عوام کی ہوتی ہے اور وہی ہمارے بارے میں فیصلہ کرے گی۔ ■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ ہیں بڑھاپے کو خوشگوار بنانے کے کچھ نادر نسخے

خوشگوار بڑھاپا

بڑھتی عمر کے ایسے فوائد بھی ہیں
جن پر عام طور پر دھیان نہیں جاتا

ذکر احمد ندیم قاسمی کی بزرگ عزیز کا جنھوں نے
عمر کے سوال پر انھیں لاجواب کر دیا تھا

امجد اسلام امجد

برسوں پہلے ایک چینی مفکر کی کتاب کا اردو ترجمہ ''جینے کی اہمیت'' کے نام سے نظر سے گزرا تھا۔ روسی ادیب رسول حمزہ توف کی کتاب میرا داغستان کی طرح اس کا بھی ایک ایک ورق دانش اور بصیرت کی باتوں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس کا جو حصہ ذہن سے چپک کر رہ گیا اس کا تعلق بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ایک خوش دلانہ سمجھوتہ کرتے ہوئے اس پر پریشان ہونے کے بجائے اس سے لطف اندوز ہونے کے بارے میں تھا۔ آج کل تو دنیا بھر میں انسان کی اوسط عمر کا دورانیہ بڑھتا چلا جا رہا ہے، یورپ، امریکا، جاپان اور سکینڈے نیویا میں تو ۹۰ ربرس کی عمر ایک عام سی بات بنتی چلی جا رہی ہے اور اس کا اثر باقی دنیا پر بھی پڑا ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں زچہ اور بچہ کی بہتر نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے جو جانیں ضائع ہوتی ہیں ان سے قطع نظر عمر کی اوسط حد میں اضافہ ہوا ہے اور یوں ۶۰ رکی لائن کراس کرتے ہی ''بزرگوں'' کو زندگی کی دوڑ سے خارج کرنے کا رجحان اور رویہ کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ برصغیر کے عوامی محاوروں میں تو ۷۰ رسال کے آدمی کو نیم باؤلا تک قرار دے دیا گیا ہے کہ ان کے مطابق اس کی ذہنی حالت قابل اعتبار نہیں رہتی۔

بڑھاپا کو خوشگوار کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ اس پر چینی مفکر لن یوتانگ کی کتاب کے علاوہ بھی بے شمار دانشوروں نے اظہارِ خیال کیا ہے اور ترقی یافتہ دنیا میں ریٹائرمنٹ کی حد میں نہ صرف مسلسل اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے بلکہ بعض شعبوں میں تو اس کو سرے سے ختم ہی کر دیا گیا ہے اور مختلف فنون کے ماہرین کی خدمات سے اس وقت تک استفادہ کیا جاتا ہے جب تک وہ جسمانی یا ذہنی صحت کے حوالے سے کام کرنے کے قابل رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں سرکاری طور پر اب تک برٹش راج کے زمانے کے بنائے ہوئے قوانین پر آنکھیں بند کر کے عمل کیا جا رہا ہے اور یوں ہمارا معاشرہ اس دانش سے فائدہ نہیں اٹھا رہا جو صرف اور صرف تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ پر بہت سنجیدہ اور فکر انگیز ہے لیکن ہر تصویر کی طرح اس کا بھی ایک دوسرا رخ ہے یعنی اگر اس صورتِ حال کو ہلکے پھلکے اور نیم مزاحیہ انداز میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا ایک اپنا لطف ہے۔ اس حوالے سے جو ۲ر مختلف تحریریں مجھ تک پہنچی ہیں ان کا خلاصہ اپنے قارئین سے Share کرنا چاہتا ہوں مجھے ان کے مطالعہ کے دوران سکول کی جماعتوں میں پڑھی ہوئی Mr. Cheerful کی کہانی بہت یاد آئی کہ

جس نے حادثہ میں ایک ٹانگ ضائع ہو جانے پر کہا تھا ''یہ نقصان اپنی جگہ مگر اس کا ایک فائدہ بھی ہے اور وہ کہ اب آیندہ مجھے جوتے کا صرف ایک پاؤں خریدنا پڑے گا۔''

زندگی کے ۳ر حصوں کو کسی ستم ظریف نے یوں بیان کیا ہے:

نوجوانی کی عمر: آپ کے پاس وقت اور طاقت تو ہوتی ہے مگر دولت نہیں۔

درمیانی عمر: آپ کے پاس دولت بھی ہوتی ہے اور طاقت بھی مگر وقت نہیں۔

بڑھاپا: آپ کے پاس وقت اور دولت دونوں ہوتے ہیں مگر طاقت رخصت ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد پچاس ساٹھ اور ستر سال کی عمر کے لوگوں کو ان کی بڑھتی ہوئی عمر کے کچھ ایسے ''فوائد'' سے آگاہ کیا گیا ہے جو عام طور پر ان کے دھیان میں نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر:

۱۔ بردہ فروش یا اغوا کاروں کی فہرست سے آپ خارج ہو جاتے ہیں۔

۲۔ کسی ایسی صورت میں جب لوگوں کے کسی گروہ کو اغوا کار گرفتار کر لیں تو سب سے پہلے رہا کیے جانے والوں میں آپ کے age group کو ترجیح دی جاتی ہے۔

۳۔ لوگ آپ کو رات ۹ ربجے فون کر کے بات کا آغاز اس جملے سے کر سکتے ہیں ''میں نے آپ کو جگا تو نہیں دیا؟''

۴۔ آپ کو سیکھنے کے لیے پہلے کی طرح محنت نہیں کرنا پڑتی۔

۵۔ جو اشیا آپ خریدتے ہیں ان کے پرانا اور بوسیدہ ہونے کے امکانات کم سے کم ہو جاتے ہیں۔

۶۔ اب آپ چاہیں تو رات کا کھانا ۴ ربجے سہ پہر بھی کھا سکتے ہیں۔

۷۔ آپ سوائے اپنے نظر کے چشمے کے ہر چیز کے بغیر گزارا کر سکتے ہیں۔

۸۔ آپ کو سوائے اپنی پنشن کے معاملات کے کوئی پریشانی باقی نہیں رہتی۔

۹۔ ٹریفک پولیس کی مقرر کردہ حدِ رفتار اب آپ کو مقابلہ کی دعوت نہیں دیتی۔

۱۰۔ آپ لفٹ (Lift) کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر اکیلے بھی گا سکتے ہیں۔

۱۱۔ اب آپ کی آنکھیں مزید خراب نہیں ہو سکتیں۔

۱۲۔ زندگی بھر کی ہیلتھ انشورنس میں کٹوائی ہوئی رقم اب آپ کے کام آنا شروع ہو جاتی ہے۔

۱۳۔ آپ کے گھٹنے محکمہ موسمیات کی نسبت بہتر پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔

۱۴۔ آپ کے راز آپ کے دوست کبھی افشا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ان کی یادداشت سے بھی محو ہو چکے ہیں۔

لیجیے...... ایڈٹ کرنے کے باوجود یہ تفصیل ۳ر چوتھائی سے زیادہ کالم کھا گئی۔ سو اب اسی موضوع پر موصول ہونے والی دوسری دلچسپ تحریر کا ذکر پھر کبھی سہی۔

اصل بات یہی ہے کہ بڑھاپا کو اپنے اوپر طاری کرنے کے بجائے اسے زندگی کا ایک ایسا حصہ سمجھنا چاہیے جس میں انسان جسمانی طور پر شاید کمزور ہوتا چلا جاتا ہے مگر اس کی ذہنی صلاحیتیں زندگی بھر کے تجربات اور وہ دانش جو اس نے مختلف ذرائع سے حاصل کی ہے ایک ایسا خزانہ ہیں جو کسی صدقہ جاریہ کی طرح اس کے بعد آنے والوں کو منتقل ہوتا رہتا ہے اور ان کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ بڑھاپا اور زندہ دلی کے حوالے سے مرحوم احمد ندیم قاسمی ایک بہت دلچسپ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی ایک بزرگ عزیزہ جنھیں وہ بی اماں کہا کرتے تھے، سے پوچھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دنوں میں آپ کی عمر کیا ہوگی؟ اس پر وہ مسکرا کر بولیں۔

''ندیم بیٹا...... ! کچھ ٹھیک سے تو یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ تمھارے افسانے بہت شوق سے پڑھا کرتی تھی۔''

■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسروں کو تنگ کرنے والے
ایک بارُعب داروغہ شہر کا ماجرا

۲۰۹ قبریں

اُسے چیونٹوں سے تیار کردہ مرہم
کی ضرورت آن پڑی تھی

حبیب اشرف صبوحی

میرے والدین کا تعلق دہلی سے تھا۔ میرے والد کا ایک سرکاری محکمہ سے تعلق تھا۔ میرے چچا کی جامع مسجد کے نزدیک کتابوں کی بہت بڑی دکان تھی (کتب خانہ علم و ادب) شام کو دکان پر تمام علمی، ادبی اور مختلف طبقہ ہائے فکر کے لوگ آ کر بیٹھتے تھے۔ علمی، ادبی باتیں ہوتیں، ہنسی مذاق ہوتا۔ چائے کے دور چلتے اور رات گئے تک یہ محفلیں جاری رہتیں۔ دو تین ماہ بعد ایک بار پکنک کا پروگرام بھی بنتا۔ کھانے پکتے اور سب ہنسی خوشی شام کو گھر آجاتے۔

ان محفلوں میں عام طور پر شاعر اور ادیب آتے تھے۔ لیکن آنے والوں میں ایک داروغہ صاحب بھی تھے۔ وہ بھی ان محفلوں کے روحِ رواں ہوتے تھے۔ داروغہ صاحب کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا۔ اُن کا عہدہ موجودہ ڈی ایس پی کے برابر ہوتا تھا۔ جس کا کام شہر میں امن و امان قائم کرنا، چوری چکاری دونگا فساد کو روکنا اور شہر کے نظم ونسق کو بہتر انداز میں چلانا ہوتا تھا۔

داروغہ صاحب بڑے پُررعب آدمی تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کمزور کو دباتے تھے۔ ناجائز طریقہ سے پیسا کماتے اور لوگوں کو تنگ کرتے تھے۔ دوستوں نے اُن کے اس غلط رویہ کے بارے میں بارہا اُن کو سمجھایا اور اُن کو خدا کا خوف دلایا۔ لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور حیلے بہانے سے اپنی حرکتوں کو جائز قرار دیتے رہے۔

دوستوں نے کچھ عرصہ بعد محسوس کیا کہ داروغہ صاحب نے محفلوں میں آنا کم کردیا ہے۔ جب ان کے

بارے میں معلوم کیا گیا تو یہ پتا چلا کہ ان کی کمر میں ایک پھوڑا ہوگیا ہے، جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے قاصر ہیں۔ انھوں نے اس کا بڑا علاج کرایا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ کسی نے اُن کو بتایا کہ دہلی کے مضافات میں ایک حکیم ہے جو ایسے مریضوں کے لیے حرفِ آخر ہے۔ داروغہ صاحب نے اس کو بلوایا۔ اُس نے آ کر مریض کا معاینہ کیا اور کہا اس کا علاج ممکن ہے۔ اس پھوڑے کے لیے ایک خاص مرہم بنانا پڑے گا جس کے لیے خاص قسم کے چیونٹے چاہئیں جن کے زہر سے مرہم بنے گا۔

داروغہ صاحب نے اپنے آدمیوں کو پورے شہر میں اور شہر کے باہر بھیج دیا کہ یہ خاص قسم کے چیونٹے تلاش کر کے لاؤ تاکہ میرا علاج ہوسکے۔ چند روز بعد اُن کا ایک اہلکار یہ خبر لے کر آیا کہ مطلوبہ چیونٹے ایک مقامی قبرستان میں پائے گئے ہیں جو ایک قبر میں داخل ہورہے ہیں اور دوسری طرف سے نکل رہے ہیں۔ چنانچہ فوری طور پر اُن چیونٹوں کو کثیر تعداد میں اکٹھا کیا گیا۔ حکیم صاحب کو دوبارہ بلوایا۔ انھوں نے چیونٹوں سے مرہم تیار کیا اور داروغہ صاحب کو لگایا۔ اس مرہم سے افاقہ ہونے لگا اور داروغہ صاحب سکون میں آگئے۔

کچھ روز بعد داروغہ صاحب کا پھوڑا بالکل ٹھیک ہوگیا اور وہ تندرست ہوگئے۔ اپنے تندرست ہونے اور غسلِ صحت کے موقع پر انھوں نے ایک بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا۔ تمام دوستوں کو بلوایا اور بڑے جشن کا انتظام کیا۔ اسی دوران اُن کو خیال آیا کہ جس اہلکار نے اُن کے لیے چیونٹے اکٹھے کیے وہ خاص طور پر انعام کا مستحق ہے۔ انھوں نے اُس اہلکار کو بلایا۔ اُس کو انعام دیا اور کہا کہ مجھے اُس شخص کی قبر پر لے چلو جہاں سے تم یہ چیونٹے اکٹھے کر کے لائے تھے اور تم نے یہ بتایا تھا کہ یہ چیونٹے قبر کے ایک طرف سے داخل ہو رہے ہیں اور دوسری طرف سے نکل رہے ہیں۔ میں اُس قبر پر جا کر فاتحہ خوانی کرنا چاہتا ہوں اور اُس اہلِ قبر کے لیے دعائے مغفرت کرنا چاہتا ہوں۔

جب داروغہ صاحب اُس قبر پر گئے تو دیکھا کہ چیونٹے اب بھی قبر کے ایک طرف سے داخل ہورہے ہیں اور دوسری طرف سے نکل رہے ہیں۔ انھوں نے اس قبر کو پانی سے صاف کرایا تاکہ اس پر پھول وغیرہ ڈالیں۔ جب قبر کے کتبہ کو پانی سے دھویا تو کتبے پر نام پڑھ کر اُن پر سکتہ طاری ہوگیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور جسم خوف کی وجہ سے کانپنے لگا۔ کچھ دیر بعد اُن کی حالت کچھ سنبھلی تو ساتھیوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ آپ کیوں پریشان ہوگئے اور آپ کی یہ حالت کیسی ہوگئی؟

''یہ قبر میرے پیش رو کی ہے۔'' داروغہ صاحب نے کہا۔ ''مجھ سے پہلے یہ داروغہ تھے۔ میں اُن سے بہت زیادہ متاثر تھا اور اُن کی ساری بُری عادتیں میں نے اپنائی تھیں۔ میں نے لوگوں کے ساتھ بہت ظلم وستم کیا۔ آج میں اُن کی قبر دیکھ کر اپنے انجام کو دیکھ رہا ہوں۔ پتا نہیں میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ میں آج سے توبہ کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔''

انھوں نے فوری طور پر اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا۔ دہلی کے بہت بڑے بزرگ مولانا فضل گنج بخش مُرادآبادی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بقایا زندگی انھوں نے استغفار اور یادِالٰہی میں گزاردی۔

☆☆

شوہر کی رازداں، بیوی کی قبر
(اُس کی میت کئی برس بعد بھی محفوظ تھی)

میرے کئی عزیز و اقربا کی قبور لاہور کے سب سے بڑے قبرستان میانی صاحب میں ہیں۔ میں اُن پر فاتحہ خوانی کے لیے اکثر جاتا ہوں۔ ان قبور کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے میں نے ایک آدمی کو مقرر کیا ہوا ہے جس کا نام یوسف ٹھیکیدار ہے۔ بہت نیک آدمی ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ اُن کا آبائی پیشہ ہے۔ دن رات وہ انھی قبروں کے درمیان رہتے ہیں اور ان کا رزق یہیں سے ملتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے بتایا کہ ایک روز وہ ایک قبر کی کھدائی کر رہا تھا کہ ساتھ والی قبر پر کدال پڑ گئی جس کی وجہ سے وہ قبر کھل گئی۔ میں نے سوچا کہ یہ پُرانی اور شکستہ قبر ہے۔ اس کا کوئی والی وارث بھی نہیں ہے، تو اس کو بھی مسمار کر کے کسی اور کے لیے جگہ نکل آئے گی۔ جب اس قبر کو مزید کھودا تو دیکھا کہ وہ ایک عورت کی قبر ہے اور اس کی میت بالکل اصلی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ میں نے اس قبر پر مٹی ڈال کر پھر سے بند کر دیا اور سوچنے لگا کہ یہ کوئی بہت نیک خاتون ہے جس کی میت کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں تجسس میں رہا کہ معلوم کروں کہ یہ کس جنتی کی قبر ہے؟

کافی عرصہ بعد میں نے دیکھا کہ ایک آدمی جس نے مغربی طرز کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس قبر پر فاتحہ خوانی کر رہا ہے اور قبر پر پھولوں کی چادر بھی پڑی ہوئی ہے۔ میں نے اُس شخص کو جا کر سلام کیا اور پوچھا کہ اس قبر سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ اس قبر پر کوئی فاتحہ خوانی کے لیے نہیں آتا۔ آج آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔

''یہ میری بیوی کی قبر ہے۔'' اُس نے کہا ''چونکہ میں پاکستان سے باہر ہوتا ہوں اس وجہ سے اس پر توجہ نہیں دے سکا۔ جب میں پاکستان آتا ہوں تو فاتحہ کے لیے آجاتا ہوں۔''

میں نے اُس سے پوچھا کہ اس کی بیوی نے کون سا ایسا عمل کیا تھا جس کی وجہ سے اُس کی میت ابھی تک محفوظ ہے اور کفن تک میلا نہیں ہوا اور اُس کو تمام واقعہ سنایا۔ یہ سن کر وہ شخص رونے لگا۔

''میری بیوی بہت نیک خاتون تھی۔'' اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''اس نے میرا راز مرتے دم تک اپنے تک رکھا۔ اللہ نے اُس کو اس نیکی کا اجر دیا ہے۔ آج میں یہ راز کھول رہا ہوں۔ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں پاکستان سے باہر چلا گیا۔ کافی عرصہ وہاں رہا۔ والدین سے ملنے کے لیے آجاتا تھا۔ میرے والدین کی خواہش تھی کہ میری شادی ہو جائے لیکن میں کچھ قدرتی مجبوریوں کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔

والدین نے بتایا کہ انھوں نے خاندان میں ایک لڑکی سے بات پکی کر دی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ شادی نہ ہو لیکن والدین کی خواہش کے آگے میں مجبور ہو گیا۔ مختصر یہ کہ میری شادی ہو گئی۔ شادی کی پہلی رات میں نے اپنی بیوی کو بتا دیا کہ میں تمھارے ازدواجی حقوق پورے نہیں کر سکتا۔ تمھیں طلاق دیتا ہوں۔ تم آزاد ہو۔ تم جہاں چاہو شادی کر سکتی ہو۔''

''میں زندگی بھر آپ کا ساتھ دوں گی۔'' اس نیک بی بی نے پریشان ہوئے بغیر کہا ''اور یہ راز مرتے دم تک اپنے ساتھ رکھوں گی۔''

شادی کے کچھ عرصہ بعد والدین نے کہا کہ تمھارے ہاں اولاد کیوں نہیں ہوتی۔ اپنے ٹیسٹ کراؤ۔ ہم نے جعلی ٹیسٹ رپورٹیں بنوائیں اور والدین کو مطمئن کیا کہ ہم دونوں تندرست اور ٹھیک ہیں۔ قدرتی طور پر اولاد نہیں ہوتی۔ میری بیوی نے میرا پورا ساتھ دیا اور اتنے بڑے راز کو مرتے دم تک اپنے ساتھ رکھا۔ اس نے اپنے آپ کو فلاحی کاموں میں مصروف کر لیا۔ غریب خواتین کی مدد کرنا۔ بچوں کو دینی و دُنیاوی تعلیم دینا اور عبادتِ الٰہی میں وقت گزار دینا۔ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی خدمات کا صلہ دیا ہے۔

''اب میں ہمیشہ کے لیے پاکستان آجاؤں گا۔'' اس نے کہا۔ ''اپنی بیوی کے لیے ہر روز فاتحہ خوانی کیا کروں گا۔ اس کی اتنی بڑی نیکی کا بدلہ اللہ ہی دے سکتا تھا۔ کسی انسان کے بس میں کہاں تھا۔''

اللہ تعالیٰ ستار العیوب ہے اور دوسروں کے عیب چھپانا پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحومہ کو یہ درجہ اسی نیکی کی وجہ سے عطا فرمایا۔

میں نے یوسف ٹھیکیدار کے ساتھ جا کر قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ اس کے بلند درجات کے لیے دعا کی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ انسان کے اچھے اعمال کا صلہ اس کے دنیا سے جانے کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح ملتا ہے۔

■

اپنے جیسے انسانوں کو مارنے کا یہ عمل کیا رنگ لائے گا

نئے عہد کے نئے

اِنسانی بم

عالیہ شاہ

اہم سوال یہ ہے کہ جہاز میں سوار ''ہیومن بم'' کو پھاڑا کیسے جائے گا امریکی بھی نہیں جانتے کہ ''کیمیائی تراقو'' کہاں کہاں استعمال ہونے کو ہے القاعدہ اور اس کے ہم نوا یوں موت بانٹ کر اب تک کیا کسی کو اپنا بنا پائے ہیں؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خطرناک موبائل کال

یہ ۲۰۰۹ء کی بات ہے، سعودی عرب میں جنگجوؤں کے خلاف لڑتی پولیس فورس کے سربراہ، شہزادہ محمد بن نائف سے ایک شخص نے رابطہ کیا۔ وہ جنگجوؤں کا ایک اہم راہنما تھا۔ اس نے شہزادے کو بتایا کہ وہ سعودی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد ختم کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ ان سے ملاقات کے بعد ہی اس امر کا اعلان کرے گا۔ شہزادہ محمد نے اسے بات چیت کرنے کے لیے اپنے محل بلوالیا۔

جب دونوں کی ملاقات ہوئی، تو اس آدمی کو موبائل کال آئی۔ آدمی کا موبائل دراصل ٹائم بم تھا جو کال آتے ہی پھٹ گیا۔ چونکہ موبائل خودکش حملہ آور کے بدن میں پوشیدہ تھا لہٰذا بم پھٹتے ہی اس کا جسم ٹکرے ٹکرے ہوکر چاروں طرف بکھر گیا۔ ایک ہاتھ چھت سے جاچپکا لیکن کرشماتی طور پر شہزادہ محمد بن نائف اس حملے میں بال بال بچ گئے۔

ماہرین میں اب تک یہ بحث جاری ہے کہ خودکش حملہ آور نے موبائل بم کہاں چھپا رکھا تھا؟ بعض کا خیال ہے کہ موبائل بہت چھوٹا تھا، چنانچہ ممکن ہے کہ اُسے مقعد میں چھپایا گیا ہو۔ اسی لیے تلاشی کے دوران وہ مل نہیں سکا یا شاید اس نے زیرجامہ میں چھپا رکھا تھا۔

خودکش حملہ آور کا نام عبداللہ الاصعری تھا۔ وہ ابراہیم الاصعری کا چھوٹا بھائی تھا جو یمن میں القاعدہ کا مشہور راہنما ہے۔ اس کی شہرت کا راز یہ ہے کہ وہ انوکھے طریقوں سے بم بنانے اور پھر انھیں چھپانے میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ امریکا اور اس کے اتحادی طویل عرصے سے ابراہیم کے تعاقب میں ہیں مگر وہ ہاتھ ہی نہیں آتا۔

جوتوں میں چھپے بم

دنیا بھر میں القاعدہ کے راہنماؤں اور ارکان کی کوشش ہے کہ ہر ممکن طریقے سے امریکا کو نقصان پہنچایا جائے۔ اس ضمن میں خصوصاً سامان اور مسافر بردار امریکی ہوائی جہاز جنگجوؤں کا خاص ٹارگٹ ہیں۔ ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ القاعدہ سے وابستہ ڈاکٹر اب ایسے تجربات کرنے میں مصروف ہیں کہ بم یا دھماکہ خیز آلہ جسم کے اندر چھپایا جاسکے۔ اسی باعث ہوائی اڈوں پر القاعدہ اور سیکورٹی فورسز کے مابین ’’چھپن چھپائی‘‘ میں شدت آگئی ہے۔

یاد رہے، یہ ہوائی جہاز ہی ہیں جن کے ذریعے القاعدہ نے ستمبر ۲۰۰۱ء میں سب سے بڑی استعماری طاقت پر حملہ کیا اور اُسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد امریکا اور یورپ میں تمام ہوائی اڈوں پر سیکورٹی سخت کر دی گئی۔ لیکن چند ماہ بعد ایک جنگجو نے جوتوں میں بم چھپایا اور ہوائی جہاز تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ وہ بم صحیح طرح نہیں پھٹا ورنہ امریکی جہاز ہوا میں تباہ ہوجاتا۔ اس واقعہ کے بعد ہی ہوائی اڈوں پر مسافروں کے جوتوں کی تلاشی بھی لی جانے لگی۔

بم بنانے کے نادر طریقوں کی ایجاد

ابراہیم اب تک بم چھپانے کے کئی نادر طریقے دریافت کرچکا ہے مثلاً زیرجامہ میں بم پوشیدہ کرنے کا عمل اسی نے ایجاد کیا۔ پھر ایک بار پرنٹر کی کارٹریج میں بم چھپادیا۔ پھر اس کارٹریج کو ایک امریکی سامان بردار طیارے میں پہنچایا گیا۔ لیکن کسی مخبر نے امریکیوں کو ’’کارٹریج بم‘‘ کی اطلاع دے دی چنانچہ وہ پھٹ نہ سکا۔ ورنہ امریکی طیارہ ہوا میں تباہ ہوجاتا اور سیکڑوں بے گناہ جان سے جاتے۔

مشروب بم

القاعدہ کے ماہرین نے پھر مشروبات کی بوتلوں میں بم چھپائے۔ جب یہ ’’بوتل بم‘‘ پکڑے گئے، تو ہوائی اڈوں پر ہر قسم کی بوتلیں ہاتھ میں لے کر چلنا ممنوع قرار پایا۔ یہ ۲۰۰۶ء کی بات ہے۔

۲۰۰۹ء میں ’’زیرجامہ بم‘‘ سامنے آیا۔ اس سال نائیجیریا کا ایک نوجوان زیرجامہ میں بم چھپا کر ایک امریکی جہاز میں بیٹھ گیا۔ تاہم وہ بم پھاڑنے میں ناکام رہا۔ اس واقعے کے بعد کئی امریکی ہوائی اڈوں میں پڑتال کرنے والی ایکسرے مشینیں نصب ہوگئیں۔

بدن میں پوشیدہ بم

ڈاکٹر رابرٹ بنکر امریکا میں انسدادِ دہشت گردی کے ادارے سے منسلک ہے۔ اس کا کہنا ہے ’’جنگجوؤں کا رجحان یہ ہے کہ بم جسم میں کہیں چھپایا جائے۔ اس رجحان کو دیکھتے ہوئے یہ بعید نہیں کہ مستقبل میں وہ بم بدن کے اندر رکھنے یا چھپانے میں کامیاب ہوجائیں۔‘‘

یاد رہے، منشیات کے سمگلر کئی جسمانی اعضا مثلاً آنت، پیٹ، مقعد، منہ وغیرہ میں پیکٹ چھپا کر سمگلنگ کرتے ہیں۔ اسی طرح ماضی میں افواج کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ لاشوں کے درمیان یا ان کے اندر بم رکھ دیتے۔ یہ ایک قسم کا بوبی ٹریپ یا فریبی چال ہوتی۔ یہ عمل خصوصاً ویت نام جنگ میں بہت اپنایا گیا۔

جانوروں کے جسموں میں بم

جسم کے اندر بم رکھنے کا پہلا مرحلہ ظاہر ہے، آپریشن کرنا ہے۔ اس آپریشن میں کسی جنگجو کا بدن کھول کر اس میں بم رکھا اور پھر کٹاؤ سی دیا جائے گا۔ القاعدہ کے راہنما جانوروں پر یہ عمل آزما بھی چکے ہیں۔

۲۰۱۰ء میں القاعدہ کے ڈاکٹر خطرناک بم کتوں کے پیٹ میں بذریعہ آپریشن نصب کرنے میں کامیاب رہے۔ ان کتوں کو پھر کسی نہ کسی طرح امریکی جہازوں میں سوار کرانا مقصود تھا لیکن کتے مشن انجام دینے سے قبل ہی چل بسے۔

انسانی بدن میں بم

ایک انسان کے جسم میں بم نصب کرنا بچوں کا کھیل نہیں، یہ کام صرف تجربہ کار ڈاکٹر ہی انجام دے سکتے ہیں۔ امریکی انٹیلی جنس ذرائع کا دعویٰ ہے کہ ابراہیم الاصعری القاعدہ کے ڈاکٹروں کی مدد سے ایسے طبی طریقوں کی تلاش میں ہے جن کے ذریعے انسانی جسم میں بم رکھا جاسکے۔

ڈاکٹر رابرٹ کے خیال میں بدنِ انسان میں بم رکھنے کی بہترین جگہ شکم یا پیٹ ہے۔ چنانچہ سرجن پیٹ کھول کر اندرونی اعضا کے ساتھ مناسب جسامت والا دھماکا خیز آلہ رکھ دے گا۔ دیگر ماہرین کا کہنا ہے کہ جنگجو خواتین کے سینے میں بھی بم امپلانٹ کرنا ممکن ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسانی جسم میں واقعی بم یا دھماکا خیز مواد چھپانا ممکن ہے؟ اس سوال پر طبی ماہرین تقسیم ہیں۔

زیرجامہ بم

۲۰۱۰ء میں جو ’’زیرجامہ بم‘‘ پکڑے گئے، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کوئی دھات موجود نہیں تھی۔ چنانچہ دھات کی شناخت کرنے والے آلات انھیں پکڑ نہ سکے۔ انہی واقعات کے بعد پھر امریکا اور یورپ کے کئی ہوائی اڈوں میں ایکسرے مشینیں نصب کی گئیں۔ گو مسافروں کی طرف سے شدید احتجاج بھی ہوا۔ مسافروں کا کہنا تھا کہ یہ مشینیں ان کی نجی زندگی پر حملہ ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ایکسرے مشینیں کپڑوں کے نیچے پوشیدہ بم تو دیکھ سکتی ہیں لیکن جسم میں چھپی دھماکہ خیز شے تلاش نہیں کرسکتیں۔ ہاں طب میں استعمال ہونے والی ایکسرے مشینیں یہ اشیا بھی ڈھونڈ نکالیں گی مگر یہ خطرہ موجود ہے کہ ان کی شعاع ریزی بعض مسافروں کو نقصان پہنچائے گی۔

اسی لیے ماہرین کہتے ہیں کہ اب ہوائی اڈوں میں سیکورٹی فورس کا بنیادی کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ مشکوک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

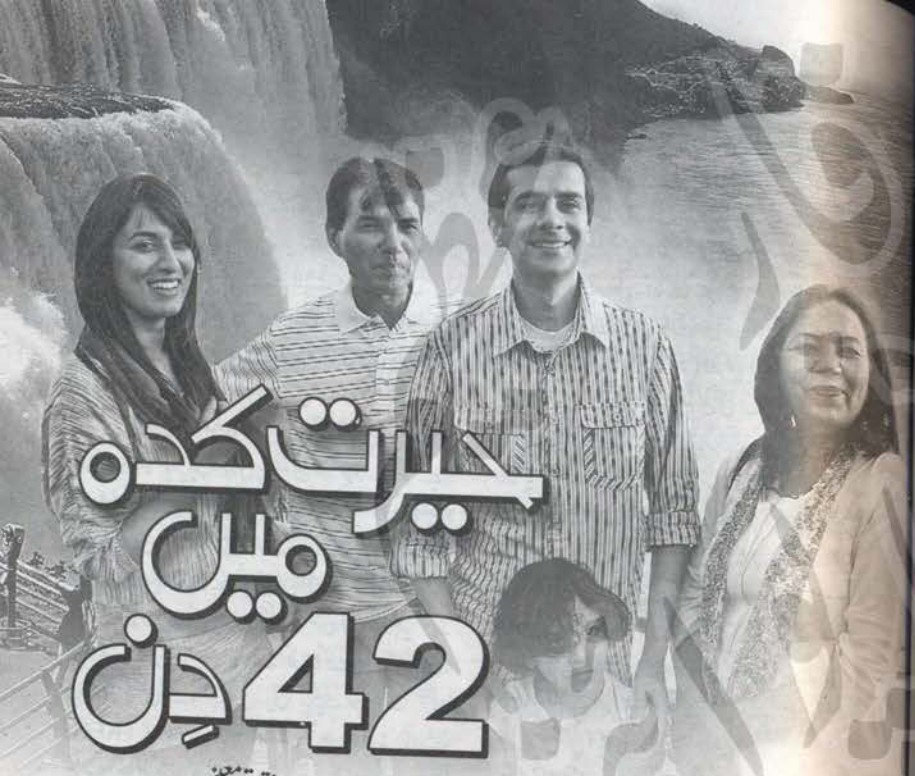

ہوائی اڈوں پر
جسموں کی سکیننگ
کا نیا نظام

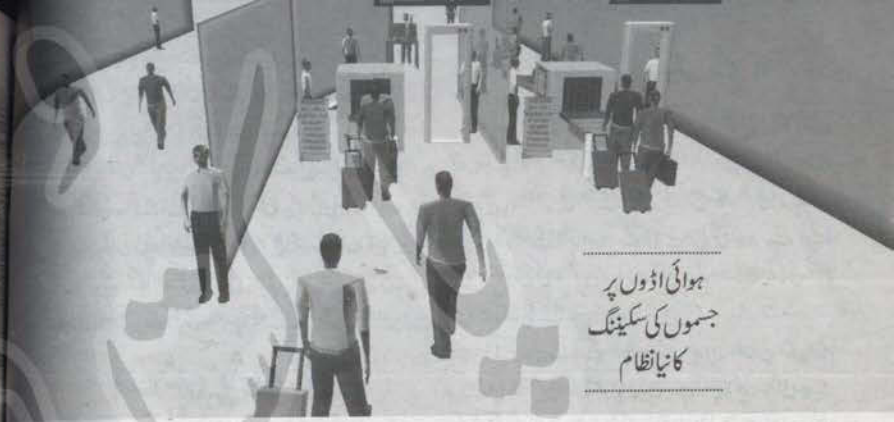

لوگوں پر نظر رکھیں اور شک پختہ ہوجائے، تو ان کی فوری تلاشی بھی لیں۔ یوں کوئی ناگہانی حادثہ جنم نہیں لے گا۔

بہرحال امریکا کے دشمن ارکانِ القاعدہ تو یہی چاہیں گے کہ جسم میں بم چھپانے والی ٹیکنالوجی ان کے ہاتھ آجائے۔ تاہم کئی ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جسم میں بم چھپانا آسان کام نہیں۔ مثلاً وہ سوال کرتے ہیں کہ جب بم کسی شخص کے جسم میں سی دیا گیا تو کیا وہ سفر کر سکے گا؟ اور کیا اس کے بدن سے آپریشن کے آثار نمایاں نہیں ہوں گے۔

کس چیز نے شہزادہ محمد کو بچایا

مزید برآں بم بنانے والوں کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کہیں دھماکے کی ساری توانائی بدن ہی میں جذب نہ ہو جائے۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ یہی بات شہزادہ محمد کو بچا گئی...... یعنی دھماکے کی بیشتر شدت حملہ آور کے جسم نے جذب کرلی اور پھر زمین میں اتر گئی۔

یہ امر جسم میں بم چھپانے کو بے فائدہ کر ڈالتا ہے۔ لیکن ہوائی جہاز کی بات اور ہے۔ اس میں بس اتنے ہی بڑے دھماکے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہوا بند جہاز میں کہیں بھی سوراخ ہوجائے تب اس کی تباہی یقینی ہے۔

ان ''جسمی بموں'' کے ساتھ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ انھیں پھاڑا کیسے جائے؟ بالفرض ٹائم بم بمبار کے بدن میں نصب ہوا، مگر پرواز دیر سے روانہ ہوئی، تو وہ کیا کرے گا؟

۲۰۰۹ء میں نائیجیرین بمبار نے بذریعہ سرنج کیمیائی تڑاقو (ڈیٹونیٹر) سے بم پھاڑنا چاہا تھا لیکن وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا بلکہ خود کو جلا بیٹھا۔

شہزادہ محمد پر حملے کی طرح فون کال کے ذریعے تڑاقو پھوڑنا ممکن ہے۔ لیکن یہ صورت اسی وقت کام دے گی جب ہوائی جہاز پر فون سروس کام دے جبکہ ہوائی جہاز پر عموماً کالیں نہیں ملتیں۔

بے شک القاعدہ راہنماؤں کی راہ میں کئی رکاوٹیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا مستقبل میں وہ ایسے زبردست جنگجو تیار کرلیں گے جو جان ہتھیلی پر رکھ کر ہوائی اڈوں پر یا جہازوں میں بم پھوڑ سکیں گے۔ مگر اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ اپنے جیسے انسانوں کو مارنے اور مارتے چلے جانے کا یہ بے فیض سفر کیا دن دکھائے گا۔ القاعدہ سے تعاون کرنے اور چاہنے والوں کی جان ہی نہیں، ساتھ سیکڑوں اور معصوموں کی جانیں بھی جاتی ہیں۔ ان بے قصوروں کے وارثوں کی آہیں اور سسکیاں، زندگی کو دکھوں اور غصے سے کس قدر بھر دیں گی؟ یہ سوال بھی تو کسی موقع پر اپنا جواب مانگے گا۔ القاعدہ اور اس کے چاہنے والے کیا اب تک موت بانٹ کر کسی کو اپنا بنا پائے ہیں۔

حیرت کدہ میں 42 دن

مشتاق معینی

شکاگو

کے بین الاقوامی ہوائی اڈے اوہیر (O'Hare) پہنچے تو ایک عجیب سا خوف طاری تھا مگر وردی میں ملبوس خاتون امیگریشن افسر کی پیشہ ورانہ فرض شناسی نے ہمیں حیران کر دیا۔ وہ انتہائی چابکدستی سے تمام مسافروں کے پاس فرداً فرداً گئی اور کاغذات کی پڑتال کی اور جس کسی کے بھی مندرجات نامکمل تھے ان کی مدد کی۔ ہماری باری آئی تو کاؤنٹر پر موجود امیگریشن افسر نے ہمارے پاسپورٹ پر مہر ثبت کی اور ہمیں باری باری کیمرے کے سامنے اور کمپیوٹر کے سکینر پر انگلیاں رکھنے کو کہا اور یہ مرحلہ جدید ٹیکنالوجی کی بدولت ایک منٹ میں ہی مکمل ہو گیا۔ یوں ہم نے سرزمینِ امریکا پر قدم رکھا۔ لاؤنج میں ہماری میزبان فیملی ہماری منتظر تھی۔ میں اپنے میزبان اور برادرِ نسبتی سید ندیم اعجاز اور ان کی شریکِ حیات نعمانہ کا شکر گزار ہوں کہ جن کی بدولت ہمارا یہ سفر انتہائی کامیاب اور خوشگوار رہا اور جنھوں نے مسلسل ۴۲ر دن تک میزبانی کی اور ان کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ یہ میری زندگی کی بہترین میزبانی تھی۔

سفر کا یہ دن میری زندگی کا طویل ترین دن تھا جس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دورانیہ تقریباً ۲۴ گھنٹے سے بھی زیادہ تھا۔ امریکی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایک عجیب سی کیفیت نے آن دبوچا۔ ہم اپنی شادی شدہ زندگی کے ۲۵ ویں سال میں امریکا میں اپنا (Belated) ہنی مون منانے آئے تھے۔

ہمارے میزبان' شکاگو کے شمال میں واقع ایک سب ڈویژن واکیگن میں رہائش پذیر تھے، جو اوہیر کے ہوائی اڈے سے تقریباً ۵۰ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ اس سب ڈویژن میں ایک بہترین مسجد سمیت تمام بنیادی سہولتیں موجود ہیں۔ جہاں ہر جمعہ کو مختلف مسلک کے لوگ باری باری نمازِ جمعہ ادا کرتے ہیں اور کسی کا اسلام خطرے میں نہیں پڑتا۔ شکاگو ڈاؤن ٹاؤن سے تقریباً ۵۰ منٹ کی مسافت پر قائم یہ جگہ انتہائی پُرسکون اور جاذبِ نظر ہے۔ ہمارا ارادہ اگلے روز ہی چند جنوبی امریکی ریاستوں کی سیر کو نکلنے کا تھا۔ میری بیگم طویل سفر کی تھکن کے باوجود بھائی کی محبت اور امریکا دیکھنے کے شوق میں انکار نہ کرسکی۔

اگلے روز ہماری منزل کنٹکی، ٹینیسی اور جارجیا تھی۔ ہم شکاگو ڈاؤن ٹاؤن، ریاست انڈیانا سے ہوتے ہوئے ریاست کنٹکی کے شہر لوئی وِل پہنچے۔ ریاست کنٹکی (KFC) کی بدولت دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ ہمارے میزبان ڈاکٹر شاہد کا تعلق لاہور سے ہے اور انھوں نے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ماسٹر کیا اور امریکا سے پی ایچ ڈی مگر اپنے ڈیل ڈول اور حلیے سے بالکل نہیں لگتے۔ گول اور گھنے بالوں والے چہرے پر اُن کی نوک دار مونچھیں اُن کی شخصیت کو اور بھی گمبھیر بنا رہی تھیں۔ انہی مونچھوں کے نیچے چمکتے دانتوں سے لگا کہ وہ ہمیں کشادہ دلی سے اپنے گھر میں خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ اُن کی بیگم نزہت نے ہمارے لیے کئی طرح کے اور وافر مقدار میں دیسی کھانے تیار کیے ہوئے تھے۔ لمبے سفر کے بعد تھکان اور بھوک نے ہمیں تمام تکلفات بالائے طاق رکھنے کو کہا اور ہم کھانے کی میز پر بے طعام پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے بعد رات گئے تک باتوں کا دور چلا اور پھر گھوڑے بیچ کر سو گئے۔

اگلے روز ناشتا کی میز پر صبح سے جمعہ کی نماز تک ڈاکٹر شاہد سے مختلف موضوعات پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ اُنھوں نے بتایا کہ لوئی وِل میں موجود ہمارے غیر سرکاری اسلامی ادارہ نے کچھ عرصہ قبل آنے والے طوفان سے تباہ شدہ گھروں کے متاثرین کی بحالی کے لئے امدادی کاموں میں بھر پور حصہ لیا۔ اُن کے خیال میں امریکا میں مقیم پاکستانیوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے امریکی پڑوسیوں کی قدرتی آفات میں بھرپور مدد کریں کیونکہ امریکا میں آبسنے کی بدولت ہی وہ قیمتی زرِ مبادلہ کما کر پاکستان بھیج رہے ہیں۔ یوں امریکا ان کا دوسرا گھر بھی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مسلم کمیونٹی کے اس فلاحی کام کی ریاست کنٹکی کے ارباب اختیار نے ہر سطح پر پذیرائی کی اور پاکستانی کمیونٹی کے اس جذبۂ خیر سگالی کی مختلف تقاریب میں خوب تعریف کی۔ ڈاکٹر شاہد نے امریکی وزارتِ خارجہ کے اعلیٰ حکام سے بھی ملاقات کی اور یو ایس ایڈ کے تحت پاکستان میں ہونے والے سماجی بہبود کے کاموں کی تعریف کی اور تجویز دی کہ سماجی بہبود کے ان منصوبوں کی پاکستان میں مناسب تشہیر کی جائے تاکہ پاکستانی عوام کو امریکی عوام کے اس جذبۂ خیر سگالی کے بارے میں بھی آگاہی ہو۔

ڈاکٹر شاہد کے گھر کے پاس ہی تھامس ایڈیسن کا گھر تھا، جس کی ایجاد کی وجہ سے آج دنیا روشن ہے۔ تھامس ایڈیسن ۱۹ برس کی عمر میں لوئی وِل میں ایک ملازمت کے سلسلہ میں آیا اور واشنگٹن سٹریٹ کے جس گھر کے ایک حصہ میں ایک سال سے زائد عرصہ تک قیام پذیر رہا۔ گھر کے اس حصہ کو تاریخی گھروں کی فاؤنڈیشن نے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرلیا ہے۔ نمازِ جمعہ میں مختلف رنگ و نسل اور مسلک کے لوگوں کو ایک چھت اور ایک امام کے پیچھے اللہ کے حضور سربسجود دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس مسجد کے قیام کا سہرا بھی ڈاکٹر شاہد کے سر تھا۔

نماز کے فوراً بعد ہم ریاست ٹینیسی کے شہر نیش وِل (Nashville) کے لیے روانہ ہوئے اور شام سے پہلے ہم اپنے میزبان غزالی بھائی کے گھر پہنچ گئے جو حال ہی

میں نیش وِل کے نواح میں نو آباد شدہ سب ڈویژن فرینکلن میں منتقل ہوئے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے آڈیٹر اور گزشتہ ۳۵ برس سے امریکا میں رہ رہے ہیں۔ آرمی کے یہ ریٹائرڈ افسر اپنی زندگی نظم و ضبط سے گزارنے کا سلیقہ خوب جانتے ہیں۔ ان کی بیگم اور ہماری بھابی شاہدہ نے ہماری خوب آؤ بھگت کی اور ہمارے ۴ روزہ قیام میں ہمارے پیٹ کے راستے دل میں گھر کرگئیں۔

اگلے روز ہماری منزل سموکی ماؤنٹین تھی۔ فرینکلن سے تقریباً ۴ گھنٹے کی مسافت پر سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں قائم گیٹن برگ کا چھوٹا سا خوبصورت اور صاف ستھرا شہر ہمیں مری کی طرح لگا۔ انتہائی صاف ستھری مرکزی سڑک کے دونوں طرف سیاحوں کی ایک کثیر تعداد گھوم رہی تھی۔ ہم اس پُرمسرت مقام کے قدرتی حسن سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ کیبل کار، چیئر لفٹ اور بچوں کی دلچسپی کی بہت سی چیزیں تھیں۔ سیاحوں میں کثیر تعداد دیسی (ایشیائی) لوگوں کی بھی تھی۔ دوسرے روز ہم چٹانوگا میں روبی فال کے لیے روانہ ہوئے۔ سڑک کے دونوں اطراف قدرتی حسن بکھرا ہوا تھا۔ روبی فال قدرت کی کاریگری کا ایک عجیب نمونہ ہے۔ لک آؤٹ پہاڑی سلسلے کے بیچوں بیچ زیرِ زمین ۱۴۵ فٹ کی قدرتی آبشار اپنے اندر بے پناہ حسن سمیٹے سیاحوں کو حیرت زدہ کر رہی تھی۔ سطحِ زمین سے آبشار کے زیرِ زمین راستے تک پہنچنے کے لیے لفٹ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم جب ایک ہزار فٹ سے زائد زیرِ زمین ایک غار کے دہانے پر پہنچے تو ایک چاق و چوبند گائیڈ ہمارا منتظر تھا۔ وہاں ہمارے گروپ کو روبی فال سے متعلق ایک مختصر دستاویزی فلم دکھائی گئی اور پھر ایک تنگ راستے کے ذریعے ایک قطار میں ہم روبی فال کی طرف بڑھنے لگے۔ راستہ اتنا تنگ تھا کہ ہمیں جگہ جگہ واپس آنے والوں کے لیے رُکنا پڑتا اور جب وہ گزر جاتے تو ہم پھر آگے بڑھنے لگتے۔ تقریباً ۲۰ منٹ بعد ایک مقام پر ہمیں رُکنے کے لیے کہا گیا اور چند لمحوں بعد ہمارا گائیڈ ہمیں ایک تاریک جگہ پر لے آیا اور پھر یک دم روشنیاں جل اُٹھیں اور ہم قدرت کے اس اُعجوبے کو دیکھ کر تصویرِ حیرت بن گئے۔ یہاں درجۂ حرارت کافی کم ہونے کی وجہ سے ہمیں اور بچوں کو سردی کا احساس ہونے لگا۔ دُنیا کی اس سب سے بڑی زیرِ زمین آبشار کی دریافت کا سہرا ایک امریکی لیفٹیننٹ لمبرٹ کے سر ہے جس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس آبشار کو دریافت کیا اور اسے اپنی بیوی 'روبی' کے نام سے منسوب کر کے اسے ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ روبی فال ایک شوہر کی اپنی بیوی سے محبت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

روبی فال سے قریب ہی واقع راک سٹی (Rock City) پہنچے۔ پتھروں کے اس قدرتی حسن سے ہم پہلے کبھی آشنا نہ تھے۔ امریکا کی ریاست، جارجیا (Georgia) کی سرحد پر واقع قدرتی حسن کا ایک اور مرقع ہمارا منتظر تھا۔ پتھروں کے بیچوں بیچ گزرتے ہوئے ہم ایک ایسے ڈیک (Deck) پر پہنچے جہاں سے امریکا کی ۷ ریاستوں کے لہراتے ہوئے جھنڈے دیکھے جاسکتے تھے۔ 'لورز لیپ' نامی چٹان محبت کرنے والوں کے لیے اپنے اندر ایک خاص دلچسپی اور دلکشی سمیٹے ہوئے تھی۔ چونکہ ہم سیر سپاٹے سے کافی تھک چکے تھے، ہم نے واپسی اختیار کی اور یوں امریکا پہنچتے ہی شروع ہونے والا ۴ روزہ طوفانی دورہ اختتام کو پہنچا اور ہم اگلے روز واکیگن پہنچ گئے۔ اب ایک ہفتہ آرام کے بعد شکاگو ڈاؤن ٹاؤن دیکھنے کا پروگرام تھا۔ میں عادتاً بے کار بیٹھنے کا عادی نہیں ہوں، لہٰذا گھر کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ امریکا میں 'ماسی' کا کوئی تصور نہیں۔ گھر کے تمام کام خاتونِ خانہ یا پھر

حجاب میں ملبوس ۲ خواتین کو نمازِ ظہر باجماعت ادا کرتے دیکھ کر روحانی تسکین ملی

urdudigest.pk
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں میاں بیوی مل جُل کر کرتے ہیں۔ ہماری آمد سے قبل ہمارے میزبان نے اپنے گھر کا سارا باورچی خانہ توڑ کر نئے سرے سے خود بنایا مگر درازوں اور الماریوں کے ہینڈل نہیں لگائے، کیونکہ یہ ہینڈل ہم اسلام آباد سے لے کر گئے تھے۔ مصروفیت کا اچھا موقع تھا۔ ہم نے مشین اُٹھائی اور لگ گئے کام سے اور تمام ہینڈل لگا ڈالے۔

ہفتے کی شام شکاگو ڈاؤن ٹاؤن کے لیے روانہ ہوئے۔ شکاگو ڈاؤن ٹاؤن کی یونین ریلوے سٹیشن کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے تین چار میل تک شکاگو ڈاؤن ٹاؤن کی گلیوں میں پیدل گھومنے کا لطف اٹھایا۔

شکاگو ڈاؤن ٹاؤن کی ہر چیز روبوٹ کی طرح اپنے مقررہ دائرے میں گرداں ترقی کی منزلیں پھاندتی آگے بڑھ رہی ہے۔ دریائے شکاگو کے کنارے ولس ٹاور ہے، جس کا پُرانا نام سیئرز ٹاور ہے اور بیشتر لوگ اسے اب بھی اسی نام سے جانتے اور پکارتے ہیں۔ کالے رنگ کی یہ ۱۱۰ منزلہ پُرشکوہ عمارت امریکا کی بلندترین عمارت ہے۔ اپنی تعمیر سے لے کر ۲۵ برس تک اِس عمارت کو دُنیا کی بلندترین عمارت ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور ایک تیز رفتار لفٹ کے ذریعے صرف ۳ منٹ میں ولس ٹاور کی منزل نمبر ۱۰۳ پر پہنچ گئے۔ شمال میں حدِ نظر تک پھیلی مشی گن جھیل کا نیلا پانی اور اس کے اطراف میں پھیلا بلند و بالا عمارتوں کے سلسلے کا یہ شہر اپنے اندر ایک جادوئی کشش کے ساتھ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سیاح چاروں اطراف گھوم گھوم کر شہر کی مختلف زاویوں سے تصاویر بنانے میں مصروف تھے۔ اس منزل پر شیشے کے ۲ دریچے ہیں۔ ان دریچوں کے پانچوں اطراف شیشہ ہے، یعنی فرش بھی شیشے کا ہے۔ دریچے میں داخل ہونے والا اپنے پاؤں تلے شہر کا نظارہ کر کے بہت محظوظ ہوتا ہے۔ سیاح ان دریچوں میں تصویر کشی کے لیے بڑے نظم و ضبط سے قطار بنا کر کھڑے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے پیچھے آنے والے کا احترام کرتے ہوئے چند منٹ بعد ہی دریچے سے باہر آجاتا ہے اور باری کا منتظر دوسرا سیاح دریچے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کوئی دھکم پیل نہیں ہوتی۔ ہر سال دُنیا بھر سے تقریباً ۲۵ ملین سیاح اس عمارت کی سیر کو آتے ہیں۔

شکاگو ڈاؤن ٹاؤن کی گلیوں میں پیدل چلتے چلتے ہم میلینیم پارک پہنچے۔ اس پارک میں سب سے نمایاں لوبیے کی شکل کا 'شکاگو بین' کا مجسمہ ہے، جس کا اصل نام کلاؤڈ گیٹ ہے۔ مانع پارہ کے لہلہاتے قطرے سے متاثرہ فنکار نے اس دیو ہیکل مجسمے کی تخلیق کا آغاز ۲۰۰۴ء میں کیا اور تعمیر ۲ سال میں مکمل ہوئی۔ یہ مجسمہ سٹیل کی ۱۶۸ پلیٹوں کو ویلڈنگ سے باہم جوڑ کر بنایا گیا ہے اور اس کی بیرونی سطح کو انتہائی مہارت سے اس طرح پالش کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی جوڑ نظر نہیں آتا۔ اس کا سائز ۳۳ فٹ، ۶۶ فٹ اور ۴۲ فٹ ہے۔ سیاح، شیشے کی طرح چمکتی ہوئی بیرونی سطح میں اپنا اور ارد گرد کی عمارتوں کا عکس دیکھ کر خوش ہوتے اور تصاویر بناتے ہیں۔

اگر آپ نے شکاگو ڈاؤن ٹاؤن کی وینڈیلا کشتی کی سواری نہیں کی تو آپ نے کچھ نہیں کیا۔ ہم نے ٹرمپ ٹاور کے پہلو میں قائم وینڈیلا کشتی کے ڈوک سے ٹکٹ لیے اور کشتی کی چھت پر سوار ہو کر دریائے شکاگو کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔ جیسے جیسے کشتی آگے بڑھتی، کشتی کی چھت پر موجود ہماری خوبصورت گائیڈ اطراف میں آسمان سے باتیں کرتی عمارات کی تاریخ اور طرزِ تعمیر کے بارے میں بتاتی جاتی۔ کشتی گھوم کر مشی گن جھیل میں داخل ہوئی تو رات ہو چکی تھی۔ جھیل مشی گن کی آبی سطح دریائے شکاگو کی آبی سطح سے تقریباً ۳ فٹ بلند ہے۔ لہٰذا وینڈیلا دریا سے جھیل میں داخل ہونے سے قبل ایک ڈوک میں چند منٹ کے لیے رُکتی ہے تو ڈوک میں داخلے کے واٹر گیٹ بند اور جھیل میں داخلے کے واٹر گیٹ کھول دیے جاتے، جس سے جھیل کا پانی ڈوک میں داخل ہو کر ڈوک کی آبی سطح کو بلند کر کے جھیل کے برابر لے آتا ہے اور یوں وینڈیلا کشتی جھیل مشی گن میں داخل ہو جاتی ہے اور یہی عمل واپسی کے لیے دُہرایا جاتا ہے۔ جھیل سے شکاگو شہر کی بلند و بالا عمارات سے جھلمل کرتی روشنیاں جھیل کے پانی میں عکس بناتے ہوئے ایک دلفریب منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہم اپنے امریکا میں قیام کے دوران کئی بار شکاگو ڈاؤن ٹاؤن گئے۔ ایک ہفتے کے اختتام پر ہم جھیل مشی گن اور دریائے شکاگو کے سنگم پر واقع ایک میوزیم دیکھنے پہنچے تو کار پارکنگ سے ملحق پارک میں حجاب میں ملبوس ۲ خواتین کو نمازِ ظہر باجماعت ادا کرتے ہوئے دیکھ کر روحانی تسکین ملی اور ساتھ ہی امریکا میں مذہبی آزادی کے عملی مظاہرے نے ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ہاں تو ذکر ہو رہا تھا میوزیم کا۔ یہ میوزیم پانی میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ درجنوں مچھلی گھروں (Aquariums) میں طرح طرح کی سمندری مخلوق رکھی گئی ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی کے لیے ڈولفن مچھلی کے عملی مظاہرے کا بھی بندوبست ہے۔ میوزیم سے باہر نکلیں تو مشی گن جھیل کے کنارے بیٹھ کر اُس پار شکاگو ڈاؤن ٹاؤن کا نظارہ بہت مسحور کن ہوتا ہے۔ ایک روز ہم کچھ سودا سلف خریدنے اور بال کٹوانے ڈیوون سٹریٹ گئے۔ جہاں سڑک کے دونوں اطراف پاکستانی اور بھارتی باشندوں کے کاروبار ہیں۔ بریانی، پاپڑی چاٹ، گول گپے، دہی بڑے، شادی بیاہ کے دیسی ملبوسات، دیسی مسالہ جات اور دوسری اشیائے ضرورت غرض ایشیائی لوگوں کی پسند کے تمام لوازمات یہاں موجود ہیں۔

اپنے قیام کے آخری ہفتے میں واشنگٹن ڈی سی اور نیاگرا فال جانے کا پروگرام ترتیب دیا اور اپنی سٹیشن ویگن میں ریاست اوہائیو کے شہر کولمبس کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ شہر ریاست اوہائیو کا صدر مقام اور امریکا کا سولہواں بڑا

شدید طوفان نے بجلی کا نظام درہم برہم کر دیا

نیاگرا فال دراصل ساتھ ساتھ جُڑی ۳ آبشاروں ہارس شُو، امریکن اور برائیڈل وِیل کا مشترک نام ہے

شہر ہے۔ کولمبس میں ایک رات قیام کے بعد ہم ویانا پہنچے۔ ویانا میں قائم ایئر اینڈ سپیس میوزیم دیکھنے کا موقع ملا جہاں خلائی شٹل 'ڈسکوری' حال ہی میں نمائش کے لیے رکھی گئی تھی۔ 'ڈسکوری' نے مارچ ۲۰۱۱ء میں اپنی ۲۷ سالہ خلائی زندگی کا آخری سفر ختم کیا۔ اس دوران ڈسکوری نے خلا کے ۳۹ کامیاب سفر کیے اور خلا میں ۳۶۵ دِن گزارے۔ بہت سے سیاح انسانی سوچ کے اس ارتقائی سفر میں کام آنے والے اُعجوبے کو بڑی دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ڈسکوری کی بیرونی سطح عام جہازوں سے یکسر مختلف تھی۔ اگلے حصے میں انتہائی جدید طرز کی سرامک ٹائلیں نصب ہیں، جو تیز رفتاری سے پیدا ہونے والی انتہائی حرارت کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ میوزیم سے واشنگٹن کے لیے روانہ ہوئے۔

اُس روز واشنگٹن ڈی سی کا درجۂ حرارت ۱۰۴ ڈگری فارن ہائٹ تھا۔ سورج آگ اُگل رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے فوراً بچوں اور خواتین کے لیے ہیٹ خریدے۔ سب سے پہلے وہائٹ ہاؤس اور پھر واشنگٹن نیشنل مونومنٹ اور پھر ہمت جواب دے گئی، تو تیز قدموں سے امریکن ہسٹری میوزیم میں جا سر چھپایا۔ ڈی سی شہر کے کسی میوزیم میں داخلے کا کوئی ٹکٹ نہیں۔ امریکن ہسٹری میوزیم ایک بہترین کتاب کی طرح کھلا، امریکا کی تاریخ کے اوراق پلٹ پلٹ کر دکھا رہا تھا۔ اس شہر سے امریکا جیسی سُپر پاور دُنیا بھر میں اپنی سفارتی، اقتصادی، سیاسی غرض ہر رابطے کی دھاک بٹھا رہی ہے۔ یہاں سے ہم میوزیم آف نیچرل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں ایک ہی مسجد میں ہر مسلک کے لوگ باری باری نماز جمعہ ادا کرنے آتے ہیں

ہسٹری پہنچے۔ میوزیم میں جنگلی حیات کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ انسانی ارتقاء کے مختلف مدارج آویزاں تھے۔ اس میوزیم سے ہم کمپیٹل ہل گئے جسے امریکا کا دل کہا جاتا ہے۔ یہاں کانگریس، سینیٹ، سپریم کورٹ، لائبریری آف کانگریس اور بوٹانک گارڈن کے علاوہ سیاحوں کے لیے اور بہت کچھ ہے۔ ہم نے صرف باہر سے ہی عمارت کا نظارہ کیا، چند تصاویر بنائیں اور واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔

رات ۱۰ بجے جیسے ہی ہم ہوٹل پہنچ کر بستر پر لیٹے تو شدید طوفانِ باد و باراں اور ٹورنیڈو (Tornado) نے بجلی کا نظام درہم برہم کر دیا۔ صبح تک بجلی غائب رہی۔ اگلے روز صبح نیاگرا فال کے لیے روانہ ہوئے۔ ریاست پن سلوانیہ سے نیاگرا فال تک ڈرائیو کے دوران خوبصورت وادیوں اور قدرتی حسن نے ہمیں وادیٔ سوات کی یاد دلا دی۔ نیاگرا فال، امریکا اور کینیڈا کے بارڈر پر واقع قدرت کا حسین تحفہ ہے۔ یہاں قدرت کی صناعی کا وہ منظر دیکھا جسے دیکھتے ہی بے اختیار منہ سے سبحان اللہ نکلا۔ یہاں اونٹاوہ، کینیڈا سے ہمارے بھتیجے سلمان اور اس کی نئی نویلی دلہن سُندس ۷ر گھنٹے کی ڈرائیو کر کے ہم سے ملنے آئے تھے۔ ان سے مل کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔

نیاگرا فال در اصل ساتھ ساتھ جڑی ۳ر آبشاروں ہارس شو، امریکن اور برائیڈل ویل کا مشترک نام ہے۔ یہ دُنیا میں سب سے زیادہ پانی پھینکنے والی آبشار ہے۔ یہاں سیاحوں میں بیشتر 'دیسی' (یعنی ایشیائی) تھے۔ ہم نے ''کیو آف دی ونڈ'' نامی غار کا ٹکٹ لیا اور آبشار کے گرتے پانی کو قریب سے محسوس کرنے آبشار کے نیچے پہنچ گئے۔ شام کے وقت کینیڈا کی سرزمین سے طاقتور تیز رنگ برنگی روشنیوں نے امریکا کی طرف سے گرنے والی آبشاروں کو اور بھی دلفریب بنا دیا تھا۔ سیر سپاٹے سے فارغ ہو کر ایک ڈھابے سے بریانی کھائی اور مینگولسی سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ اگلے روز واپسی ہوئی اور پھر ۲ر روز بعد ہی پاکستان روانگی اور یوں ہمارا دورۂ امریکا اپنے اختتام کو پہنچا۔

اگر میں یہ کہوں کہ علم کے بغیر آگہی، آگہی کے بغیر شعور اور شعور کے بغیر مشاہدے کی منزل پا لینا ناممکن ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ مگر اپنے اس حالیہ دورۂ امریکا کے دوران میں نے ایک ایسی قوم کا مشاہدہ کیا جو مرنے تک پہنچ چکی ہے۔ ابراہم لنکن کی ریاست الینوائے (Illinoise) کے شہر شکاگو سمیت میں امریکا کے چند دوسرے بڑے شہروں اور اُن حیرت کدوں سے گزرا جہاں ''عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی''۔

مسلمان ہونے کا دعویٰ ہمارا مگر علم، تحقیق، تدبّر، غور و فکر کی منازل انھوں نے طے کیں۔ خطبۂ حجۃ الوداع ہمارا مگر اس پر عمل پیرا وہ ہوئے۔ کسی گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں۔ اگر فوقیت ہے تو صرف علم و حکمت کی۔ جو چیز آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ شاید اہلِ علم و آگہی کے لیے تسخیر ہوا۔ اُس معاشرے میں جھوٹ بولنا، بد دیانتی کرنا، کسی کو دھوکا دینا، ہمسائے کے آرام کا خیال نہ رکھنا انتہائی بُرا تصور کیا جاتا ہے۔ صفائی نصف ایمان ہونے کا دعویٰ ہمارا مگر صفائی کی اصل روح امریکا میں دیکھی۔ مجھے ایک بڑے سیاست دان کا ایک فقرہ یاد آرہا ہے ''میرا بیت الخلاء اِتنا صاف ہونا چاہیے کہ اگر میں چاہوں تو اس میں اپنی مقدس کتاب پڑھ سکوں۔'' کاش کل کوئی ہمارے ملک کا سفرنامہ لکھے تو ایسی ہی باتیں یہاں بھی دیکھ سکے۔ حیرتیں اسی دنیا میں ملتی ہیں۔ ہم کیوں نہیں اپنے ملک کو ایک حیرت کدہ بنا سکتے.....

(مضمون نگار سفارت خانہ جاپان اسلام آباد میں سینیئر کلچرل ایڈوائزر ہیں)

واقعات کی توجیح ممکن ہے؟

مُحَیِّرُ العُقُول

جب عقل ناکام ہوتی ہے، ایمان کام آتا ہے
انسانی عقل کی بھی ایک حد ہے
سائنسدان کوشش کے باوجود روح کی حقیقت کو آج تک نہیں پا سکے

پروفیسر عطاء الحق سجانی

راقم

۱۹۶۰ء کے عشرہ میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم ایس سی (فزکس) کا طالب علم تھا۔ ہمارے صدر شعبہ جناب ڈاکٹر عبدالبصیر پال تھے جو انتہائی محنتی اور شفیق استاد تھے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کلاس میں پڑھا رہے تھے اور گمک (Resonance) کا موضوع زیرِ بحث تھا جو کہ خاصا گمبھیر ہے۔ استادِ محترم کو قدرت کی طرف سے یہ ملکہ حاصل تھا کہ دقیق سے دقیق موضوع کو بھی نہایت آسان پیرائے میں سمجھا دیتے تھے۔ لہٰذا موضوع زیرِ بحث کی مناسبت سے آپ نے اپنا ایک دلچسپ واقعہ سُنایا جس میں انھوں نے بتایا کہ انسانی زندگی میں بہت سے ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ اگر اُن پر غور کریں تو اُن کی کوئی نہ کوئی سائنسی توجیہہ مل جاتی ہے لیکن عام طور پر ہم ایسے واقعات کو کسی غیر مرئی قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے آپ نے فرمایا:

دھمک اور گمک

''پاکستان بننے سے پہلے ہم لوگ امرتسر میں ایک مکان کی بالائی منزل میں رہتے تھے اور مکان کے نچلے حصہ میں دکانیں تھیں۔ ایک روز میں کالج سے فارغ ہو کر گھر آیا تو بیگم صاحبہ نے کہا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے لہٰذا کوئی اور مکان کرائے پر لے لیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو بیگم صاحبہ نے بتایا کہ میں آج گھر کے کام کاج میں مصروف تھی تو اچانک دیکھا کہ دروازہ کی زنجیر جو لٹک رہی تھی ہلنا شروع ہوگئی اور کافی دیر ہلتی رہی۔ خیر میں نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ بعد میں بھی بیگم صاحبہ! نے دو تین دفعہ یہ شکایت کی اور اصرار کیا کہ مکان جس قدر جلدی ہو سکے تبدیل کر لیں۔ لیکن میں نے اسے معمولی واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ ایک دفعہ اتوار کا دن تھا اور میں گھر پر ہی موجود تھا کہ اچانک بیگم صاحبہ نے حیرانی کے عالم میں مجھے بتایا کہ اب آپ خود دیکھ لیں دروازہ کی زنجیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کافی تیزی سے ہل رہی ہے جس طرح بچے کا جھولا ہلتا ہے۔ میں نے دیکھا تو واقعی دروازہ کے ساتھ لٹکتی ہوئی زنجیر کافی تیزی سے ہل رہی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر غور کیا تو کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ اِسی ٹوہ میں مَیں مکان سے نیچے اُترا اور اردگرد دیکھا تو اچانک میری نظر لوہار کی دکان پر پڑی جو ہمارے مکان کے بالکل نیچے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھا لوہار گرم گرم لوہے کو ہتھوڑا کی مدد سے تیزی سے کُوٹ رہا تھا۔ میں بوڑھے لوہار کے پاس گیا اور اُس سے درخواست کی کہ تھوڑی دیر کے لیے اپنا کام بند کردیں۔ میں اوپر مکان میں گیا تو دروازہ کی زنجیر نے آہستہ آہستہ ہلنا بند کردیا۔ پھر میں واپس نیچے آیا اور بوڑھے لوہار سے درخواست کی کہ لوہے کو کوٹنے کا کام جاری کردیں۔ اُس نے لوہا گرم کرنے کے بعد پھر زور زور سے اس پر ہتھوڑا مارنے شروع کردیے۔ اتنی دیر میں مَیں اُوپر اپنے مکان میں آیا تو دیکھا کہ دروازہ کے ساتھ لٹکتی ہوئی زنجیر نے پھر ہلنا شروع کردیا اور تھوڑی ہی دیر میں اس کے ہلنے کی رفتار تیز ہوگئی۔ پھر میں نے بیگم صاحبہ کو پوری تفصیل بتائی تو اُن کی تسلی ہوگئی۔"

قارئین کرام طبیعات (Physics) میں اس واقعہ کی سادہ سی تشریح یوں ہے کہ بوڑھے لوہار کا ہتھوڑا مارنے کا عمل دیواروں کے ذریعہ اپنی توانائی (یعنی دھمک) اوپر کی منزل میں منتقل کر رہا تھا۔ قدرتی طور پر ہتھوڑا چلنے کے عمل اور زنجیر میں ہم آہنگی تھی یعنی دونوں کا ٹائم پیریڈ (Time Period) ایک تھا۔ لہٰذا طبیعیات کی رو سے زنجیر دیواروں کے ذریعہ منتقل شدہ توانائی کے باعث (توانائی جو ہتھوڑا لوہے پر مارنے سے پیدا ہوتی تھی) ہلنا شروع کر دیتی تھی۔ طبیعات میں اس مظہر (Phenomenon) کو گمک (Resonance) کہتے ہیں۔

ہڈیوں کے جلنے کی بُو

۸۵-۱۹۸۴ء میں ہم لوگ فیصل آباد پیپلز کالونی میں کرایہ کے مکان کی بالائی منزل میں رہائش پذیر تھے۔ اچانک کبھی کبھی گھر میں کچھ اس قسم کی بدبو آتی تھی جس طرح ہڈیوں کے جلنے یا باسی گوشت سے آتی ہے اور پھر چند گھنٹوں بعد یہ بدبو ختم ہوجاتی۔ ہم نے گھر کی ہر طرح سے صفائی کی مگر اس بدبو کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ہر چند روز بعد یہ واقعہ پیش آتا۔ میرے دونوں بڑے بچے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں لیبارٹری ہائی سکول میں پڑھتے تھے اور وہ یونیورسٹی کی بس میں روزانہ آتے جاتے تھے۔ ایک روز انھوں نے گھر واپس آکر بتایا کہ صبح جب وہ بس میں سوار ہوئے تو تھوڑی دیر بعد اُن کو بس میں بھی ویسی ہی بدبو آئی جیسی گھر میں کبھی کبھی آتی ہے۔ میں نے اپنے بچوں سے کہا کہ اب جب تمھیں یہ بدبو بس میں آئے تو دوسرے بچوں سے پوچھنا کہ آیا اُن کو بھی یہ بدبو آتی ہے۔ چار پانچ روز بعد میرے بچوں نے بتایا کہ آج پھر اُن کو بس میں صبح سکول جاتے وقت بدبو آئی تھی۔ مزید یہ کہ انھوں نے دوسرے بچوں سے پوچھا تو اُن کو بھی بدبو آرہی تھی۔ جس سے مجھے کچھ تسلی ہوئی کیونکہ ہمیں ایک بزرگ نے یہ شک ڈال دیا تھا کہ آپ کے پیچھے کچھ مؤکل کسی نے جادو کے ذریعہ چھوڑے ہوئے ہیں۔ اُس بزرگ نے یہ بھی کہا تھا کہ جب آپ اپنے گھر میں جائیں گے تو میں آپ کو تعویذ دوں گا۔ وہ تعویذ مکان کی بنیاد میں دبا دینا تو یہ مؤکل آپ کا پیچھا چھوڑ دیں گے لیکن سچ پوچھیں تو میرا دل اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔

تقریباً ایک سال بعد ہم نے قریب ہی ایک گھر خرید لیا۔ ایک روز سردیوں میں بچے مکان کی چھت پر دھوپ میں بیٹھے تھے تو انھوں نے مجھے نیچے آکر بتایا کہ ابو اوپر چھت پر پھر ویسی ہی بدبو آرہی ہے جیسی کہ کرایہ کے مکان میں آتی تھی۔ میں اوپر گیا تو واقعی چھت پر بدبو آرہی تھی۔ میں تفتیش کی خاطر نیچے اپنی گلی میں آیا تو وہاں بھی مجھے ویسی ہی بدبو آئی۔ اب میں نے اس پر مزید غور کیا تو یہ راز کھلا کہ اُس وقت خاصی تیز ہوا چل رہی تھی اور جس طرف سے یہ ہوا آرہی تھی اس طرف تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلہ پر تیزاب مِل ہے۔ میرے ذہن نے فوراً کام کیا کہ یہ تو تیزاب مِل سے بدبو آرہی ہے۔ لہٰذا جب بھی تیزاب مِل کی طرف سے ہوا آتی تو یہ بدبو آتی۔ میں نے اوپر چھت پر آکر بچوں کو جب یہ وضاحت کی تو وہ بھی بالکل مطمئن ہوگئے۔

زرد رنگ کے داغ

فیصل آباد میں رہائش کے دوران ہفتہ میں ایک دو بار کپڑے ضرور دھوتے تھے۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ کبھی کبھار جب سوکھے ہوئے کپڑوں کو رسی یا تار پر سے اُتارتے تو سفید رنگ کے کپڑوں پر زرد رنگ کے داغ لکیر کی شکل میں ہوتے۔ یہ زرد رنگ کے داغ کپڑوں کے اس حصہ پر ہوتے جو رسی یا تار پر ہوتا۔ بعد میں صابن سے دھونے پر بھی یہ داغ بڑی مشکل سے صاف ہوتے۔ لیکن یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر یہ زرد رنگ کے داغ کہاں سے آتے ہیں۔ گھروں میں اس قسم کے واقعات ہوں تو بہت سے وسوسوں کو جنم دیتے ہیں۔ بہرحال میں اکثر اس بات پر غور کرتا مگر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ایک روز اپنے ایک ساتھی پروفیسر سرور کے ساتھ کالج میں بیٹھے ماحولیات پر بات چیت ہو رہی تھی تو دورانِ گفتگو پروفیسر سرور نے کہا کہ آج کل انڈسٹری اور ٹریفک کی وجہ سے ہماری فضا اس قدر آلودہ ہوگئی ہے کہ بارش میں بچوں کو نہانے نہیں دینا چاہیے اور نہ ہی بارش کا پانی پینا چاہیے کیونکہ بارش میں تیزابی مادوں کی بہتات ہوتی ہے یعنی کہ آج کل بارش کو تیزابی بارش (Acid Rain) ہی سمجھیں۔ جونہی پروفیسر صاحب نے تیزابی بارش کا نام لیا میرا ذہن فوراً گھر میں دُھلے ہوئے سفید کپڑوں پر زرد رنگ کے دھبوں کی طرف گیا اور میرے ذہن میں اچانک یہ خیال آیا کہ کپڑوں پر زرد رنگ کے دھبے ہمیشہ اس وقت پڑتے تھے جب کبھی دُھلے ہوئے کپڑوں پر اچانک بارش پڑتی تھی۔ فیصل آباد میں چونکہ کیمیکل انڈسٹری بہت ہے بشمول تیزاب مل کے جو ہمارے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ معما بھی حل ہوگیا کہ کپڑوں پر زرد رنگ کے دھبے کیوں پڑتے تھے۔

قارئین..... یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مافوق الفطرت واقعات کی توجیہہ پیش کرنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ انسانی عقل کی ایک حد ہوتی ہے۔ اسی لیے تو علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں

آج سے ہزاروں سال قبل جب انسانی شعور نے ابھی انگڑائی نہیں لی تھی تو سورج کا طلوع اور غروب ہونا، چاند کا بڑھنا اور گھٹنا، بارش کے بعد آسمان پر قوسِ قزح کا نمودار ہونا، زلزلے آنا وغیرہ وغرہ کو انسان غیر مرئی تصور کرتا تھا اور ان کی پرستش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ مائیخو لیا اور شیزوفرینیا جیسی ذہنی امراض بھی اسی زمرے میں آتی تھیں۔ لیکن آج کل سائنس کی بدولت چونکہ ان عجوبات کی وجوہات اور حقیقت کو سمجھتے ہیں اس لیے ہم ان باتوں سے حیران نہیں ہوتے اور انھیں معمول کے واقعات گردانتے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق عام انسان اپنی خداداد صلاحیتوں کا صرف ۸ر یا ۱۰ر فیصد بروئے کار لاتا ہے۔ جوں جوں انسان اپنی خفیہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا جائے گا تو نہ جانے کیا کیا نئے سے نئے انکشافات سامنے آتے جائیں گے۔ لیکن پھر وہی بات کہ انسانی عقل کی ایک حد ہے۔ سائنس دان اپنی انتہائی کوشش کے باوجود آج تک روح کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے۔ اسی لیے تو سائنسدان اور مُفکرین کہتے ہیں کہ

"When reason fails, faith begins",

یعنی جب عقل انسانی ناکام ہوجاتی ہے تو ایک لامحدود سُپر پاور یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم اتنا خوش تھے کیونکہ گولی نشانہ پر لگی تھی
خوبصورت سینگوں والا بارہ سنگھا ہمارے سامنے تھا
وادی کولمبیا میں بارہ سنگھا کے شکار پر نکلے دوستوں کی دلچسپ داستان

بارہ سنگھا کا شکار

صبا شفیق

یہ اکتوبر کی سہانی شام تھی۔ جب میں پیٹر، کینٹ اور ڈسٹن دیودار کے درختوں، سفید شفاف جھیلوں اور ہری بھری چراگاہوں سے سجی کولمبیا کی اُس وادی میں پہنچے جو بارہ سنگھا کے شکار کے لیے مشہور تھی۔ ہم نے ایسی جگہ پر خیمہ لگایا جس کے ایک طرف چراگاہ اور دوسری طرف ندی تھی۔ ہم روزانہ صبح سویرے اُٹھتے، لکڑیاں اکٹھی کرتے، آگ جلاتے، ناشتا کرتے اور شکار کو نکل جاتے۔ ایسا نہیں تھا کہ ہمیں شکار ملتا نہیں تھا مگر ہر بار شکار ہاتھ سے نکل جاتا تھا۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ بارہ سنگھا کے ٹیڑھے سینگوں کی طرح بارہ سنگھے کا شکار بھی خاصا ٹیڑھا ثابت ہوگا۔ یہ ہماری مہم کا تیسرا دن تھا۔ جب کینٹ نے بارہ سنگھے کے گھروں کے نشانات سے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ دیر قبل ہی ہمارے کیمپ کے قریب سے گزرے ہیں۔ ہم گھروں کے نشانات کا پیچھا کرنے لگے۔ راستے میں تازہ کھائی کی جھاڑیاں بھی اس بات کا ثبوت تھیں کہ بارہ سنگھے قریب ہی ہیں اور پھر ڈسٹن چلایا ''وہ دیکھو! سامنے چراگاہ کے کنارے پر ایک بہت بڑا بارہ سنگھا کھڑا ہے۔'' وہ پہاڑی پر کھڑا تھا اور پہاڑی ہم سے تقریباً دو میل دور تھی۔ پیٹر کہنے لگا ''ہم اس کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ وہ ایک شاندار بارہ سنگھا تھا جس کے سینگ بھی اسی کی طرح شاندار تھے۔'' ہم اس کی طرف بڑھنے لگے کیونکہ اتنی دور سے نشانہ خطا ہونے کا خطرہ تھا۔ مگر وہ بھی بے حد چالاک تھا۔ اُس نے شاید ہماری بُو پالی تھی۔ وہ ایک دم بھاگ اُٹھا اور ہم ایک بار پھر ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ابھی ہم وہیں کھڑے تھے کہ کچھ دیر بعد اُسی پہاڑی سے ایک نر بارہ سنگھا، اُس کی مادہ اور بچھڑا نیچے اُترتے دکھائی دیے۔ مادہ بارہ سنگھا کے سر پر سینگ نہیں ہوتے مگر یہ نر بارہ سنگھا بھی کچھ زیادہ شاندار نہ تھا۔ اس کے سینگ چھوٹے چھوٹے تھے۔ اس لیے ہم نے اسے شکار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

رات ہم نے پوری نیند لی تھی۔ اس لیے ابھی ہم تازہ دم تھے۔ سو ہم نے ندی کے پار چراگاہ میں جا کر شکار ڈھونڈنے کا ارادہ کیا۔ کہیں کہیں ندی کا شفاف پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا مگر ندی کا زیادہ تر حصہ برف سے ڈھکا تھا۔ ہم نے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں سے ندی تقریباً کم چوڑی اور گہری تھی اور ندی کے یخ پانی میں اُتر گئے۔

ہم تیز تیز چلتے ہوئے ندی کے یخ پانی سے گزر کر دوسرے کنارے پہنچے۔ ندی کے قریب ہی جھاڑیوں میں ایک مادہ بارہ سنگھا کھڑی تھی۔ پیٹر کہنے لگا ''نر بھی کہیں قریب ہی ہوگا، ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔'' ہم سب نے اُس کی تائید کی اور ندی کے قریب چٹان کے پیچھے جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ مادہ آرام سے چرتی رہی۔ پھر وہ ندی کی جانب آئی اور پانی پی کر اوپر پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ ہمارا انتظار لاحاصل رہا تھا کیونکہ اتنی دیر میں کوئی نر بارہ سنگھا اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وادی میں شام اُترنے لگی تو ہم نے کیمپ کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا اور سارا دن مارے مارے پھرنے کے بعد گرتے پڑتے کیمپ میں پہنچ کر گھوڑے بیچ کر سو گئے۔

اگلی صبح بے حد خوبصورت تھی۔ برف زاروں کے درمیان گھری خوبصورت وادی دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ بادل سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ دور ایک پہاڑ سے پہاڑی بکریوں کا ریوڑ نیچے اتر رہا تھا جو ملتے ہوئے کالے سفید اور خاکی نقطوں کے مانند لگ رہا تھا۔ ہم پانی لینے ندی کی جانب گئے تو جھاڑی میں پھنسے جنگلی بھالو کے بال دیکھ کر ہمیں معلوم ہوا کہ رات بھالو صاحب بھی اپنی پیاس بجھانے ہمارے خیمہ کے قریب سے ہی گزرے ہیں۔ ندی کے پار ہمیں بارہ سنگھوں کا ایک غول نظر آیا۔ اُس میں کئی بڑے بڑے بارہ سنگھے تھے۔ ہم بھاگم بھاگ واپس خیمے میں پہنچے اپنی بندوقیں لیں اور ندی کی طرف بھاگے مگر جب تک ہم وہاں پہنچے آخری بارہ سنگھا بھی ندی کے پار پہاڑی سے دوسری طرف کی وادی میں اُتر رہا تھا۔ ہم ایک بار پھر ناکام ہو گئے تھے۔

ہم نے لکڑیاں اکٹھی کیں اور دوپہر کے کھانا کی تیاری کرنے لگے۔ کھانا کھا کر ہم نے ندی پار کی اور ایک بار پھر سے شکار کی تلاش میں نکلے۔ اب ہم دو دو کی ٹولیوں میں مخالف سمتوں میں ایک شاندار بارہ سنگھا کی تلاش میں تھے۔ پیٹر مادہ بارہ سنگھے کی آواز نکالنے میں ماہر تھا۔ وہ آواز نکالنے لگا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد دور جھاڑیوں میں سے ایک نر بارہ سنگھا آتا دکھائی دیا۔ میں اور ڈسٹن اُن سے مخالف سمت جا رہے تھے۔

جب پیٹر نے وہ مخصوص آواز نکالی جو ہم نے ایک دوسرے کو اشارہ کرنے اور اپنی پوزیشن بتانے کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ میں اور ڈسٹن بھی مڑ کر پیٹر اور کینٹ کی جانب آئے۔ یہاں ایک شاندار بارہ سنگھا ہم سے تقریباً ۱۰۰ گز دور کھڑا تھا اور دوسری جانب پیٹر اور کینٹ تقریباً ۳۰۰ گز دور اُس کا نشانہ باندھے تیار کھڑے تھے۔ بارہ سنگھا اکیلا ہی تھا اور اپنی دُھن میں چر رہا تھا اور پھر ہم نے پیٹر کو نشانہ لگانے کو کہا۔ کیونکہ وہ ہم سب میں سے ماہر نشانہ باز تھا۔ پیٹر نے اپنی رائفل کندھے پر رکھی اور لبلبی دبا دی۔ ٹھاہ! کی آواز آئی اور شاندار بارہ سنگھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پیٹر کی گولی نشانے پر لگی تھی۔ ہم سب بے انتہا خوش تھے۔ ہمارے اتنے دنوں کی کوششیں بالآخر کامیاب ہو ہی گئی تھیں۔ بارہ سنگھا کے سینگ بے حد خوبصورت تھے۔ ہم نے اُس کے ساتھ جی بھر کر تصویریں بنائیں اور پھر بارہ سنگھا کی کھال اُتارنے لگے۔ کیونکہ آج رات ہمیں اپنا مزیدار شکار ہی بھون کر کھانا تھا۔

اگلی صبح ہم ایک بار پھر شکار پر روانہ ہوئے۔ کل کی کامیابی نے ہمارے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ ابھی ہم خیمہ گاہ سے کچھ دور ہی گئے تھے کہ ہمیں دور پہاڑی کے اوپر چراگاہ کے آخری سرے پر ایک نہایت شاندار بارہ سنگھا نظر آیا۔ یہ کل والے سے بھی بڑا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ مجھے اسی کو شکار کرنا ہے۔ ہم جلدی جلدی بندوقیں لے کر ندی کے پار پہنچے۔ اس اثنا میں بارہ سنگھا بھی ہم سے اور دور ہو گیا۔ ہم دور بین سے اسے ڈھونڈنے لگے

urdudigest.pk
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ندی کا شفاف پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا مگر ندی کا زیادہ تر حصہ برف سے ڈھکا تھا

اور پھر ہمیں وہ نظر آگیا۔ اس کے ساتھ مادہ اور بچھڑا بھی تھا۔ اُس کے سینگ بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ”اُف یہ ان کا وزن کیسے اُٹھاتا ہوگا۔“ پیٹر جوش سے چلایا۔ صبح کی نمدار ہوا میں پسینے سے بھیگے ہم پہاڑی پر اُس کے پیچھے چڑھنے لگے۔ یہاں کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ پہاڑی پر پہنچے تو ایک شاندار منظر تھا۔ ہری بھری چراگاہ کے عین درمیان میں رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ ہم بارہ سنگھا کو بھول کر قدرت کی رنگینی میں کھو گئے۔ برف زاروں سے اُترتی ندی پھولوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ یہ منظر واقعی سحر انگیز تھا۔ بارہ سنگھا ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اس لیے ہم نے کچھ دیر اس خوبصورت مقام پر ستانے کا ارادہ کیا۔ کچھ دیر بعد ہم اٹھے اور بارہ سنگھا کے کھروں کے نشانات سے اُس کا پیچھا کرنے لگے۔ نشانات اُس خوبصورت سی چراگاہ سے نیچے اُتر کر پھر دوسری پہاڑی کی جانب جا رہے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر واپسی کا سفر شروع کر دیا کیونکہ ہم سب بے انتہا تھک چکے تھے اور ایک اور پہاڑی پر چڑھنے کی ہم میں ہمت نہ تھی۔ اس کے علاوہ شام بھی ہو رہی تھی اور ہمیں معلوم تھا کہ خیمہ گاہ تک پہنچتے پہنچتے بالکل اندھیرا ہو جائے گا۔ واپسی کا سفر بے حد کٹھن ثابت ہوا۔ اندھیرے میں ڈسٹن ایک درخت کی اُبھری ہوئی شاخ سے ٹکرا کر گرا تو کانٹے دار جھاڑیوں نے اس کے جسم اور چہرے کو لہولہان کر دیا۔ ہم سب اُسے سہارا دے کر جب خیمہ گاہ تک لائے تو بے حد تھک چکے تھے اور بھوک سے ہمارا بُرا حال تھا۔ ہم سب نے گزشتہ روز کے شکار سے پیٹ بھرا اور چائے کے کئی کئی کپ پی ڈالے۔ ڈسٹن کی مرہم پٹی اور اسے دوائی دینے کے بعد ہم سب بھی اس طرح بے ہوش ہو کر سوئے کہ اگلے دن صبح ۱۰ بجے کے قریب اٹھے۔

پیٹر چونکہ اپنا بارہ سنگھا شکار کر چکا تھا اس لیے اسے ڈسٹن کے پاس خیمہ میں چھوڑ کر میں اور کینٹ شکار کے لیے نکلے کیونکہ کل ہمیں ہر صورت واپس جانا تھا اور میں ناکام واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ ابھی ہم ندی پار کر رہے تھے کہ ہمیں سامنے پہاڑی پر ایک شاندار بارہ سنگھا نظر آیا۔ کینٹ نے مجھے چھیڑا ”وہ رہا تمھارا بارہ سنگھا......“ وہ بالکل وہی بارہ سنگھا تھا جس نے ہمیں گزشتہ روز ناکوں چنے چبوائے تھے۔ اب کی بار بھی اُس کے ساتھ مادہ اور بچھڑا تھے۔ آج ہوا کا رُخ موافق تھا۔ ہوا بارہ سنگھا کی جانب سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس لیے وہ ہماری بُو نہ پا سکا اور ہم اس کے قریب پہنچ گئے۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ اتنا شاندار تھا جیسے کوئی بادشاہ...... اور اُس کے سینگ اُس کا تاج تھے جو دھوپ میں چمک رہے تھے۔ میں نے نشانہ باندھا اور اللہ کا نام لے کر لبلبی دبا دی۔ ٹھاہ کی آواز آئی، بارہ سنگھا وہیں گر گیا جبکہ مادہ اور ہرنوٹا بھاگ اٹھے۔ ہم تیز تیز چلتے ہوئے بارہ سنگھا کے قریب پہنچے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بارہ سنگھا اتنا وزنی تھا کہ ہم اسے اُٹھا کر نہ لے جا سکتے تھے۔ اس لیے میں نے کینٹ کو خیمہ گاہ کی جانب بھیجا تاکہ وہ وہاں سے گھوڑا لے آئے۔ کچھ دیر بعد کینٹ گھوڑا لے آیا۔ ہم دونوں نے مل کر بارہ سنگھا کو گھوڑے پر ڈالا اور خیمہ گاہ میں لے آئے۔

ڈسٹن اور پیٹر بھی بارہ سنگھا کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور ڈسٹن کہنے لگا ”اگلی بار جب ہم آئیں گے تو میں تمھیں اس سے بڑا بارہ سنگھا شکار کر کے دکھاؤں گا۔“ میں نے مسکرا کر کہا ”دوست یہ بھی تمھارا ہی ہے۔“ اس رات وادی دیر تک ہمارے قہقہوں سے گونجتی رہی۔ ہماری یہ مہم تو اختتام کو پہنچی تھی مگر ہم ایک بار پھر جلد لوٹ کر آنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ ■

Public Health Engg. Division, Multan

SHORT TENDER NOTICE

Sealed tenders based on item rates/Percentage above or below as per MRS rates mentioned in DNIT, which can be seen on web site www.punjab.gov.pk/Finance/Market Rates/ for Multan District for Civil, Building & PHE works are hereby invited, for the works mentioned below, from the Contractors/Firms enlisted/renewed during this financial year i.e. 2012-2013 with Public Health Engineering Department in the field of Public Health Engineering works.

Tender documents can be obtained from the Divisional Head Clerk of this office situated at Shamsabad Colony, Multan on payment of tender fee as prescribed in the rules. The attested copies of enlistment, upto date renewal letter, fee deposit receipt, Pakistan Engineering Council license, authority letter on writing pad of contractor/Firm, Identity Card of Contractor/Managing partner of the firm along-with original registered power of attorney should be accompanied with the application.

Tendered rates and amounts should be filled in figures as well as in words on every page of bid. The tenders should be signed as per general directions given in the tender document. No rebate on tendered rates will be acceptable.

Tenders will be issued by the Head Clerk of the undersigned on 13.10.2012 and will be received / opened on 15.10.2012 at 2.00 P.M. in the presence of participating contractors or their representatives. The member of the District tender board will monitor the tendering process.

Conditional tender or the tenders not accompanied with earnest money in shape of deposit at call from Scheduled Bank will not be entertained. Attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms may be provided on demand during process of tendering. The undersigned has full rights of rejecting any or all of the tenders without assigning any reason thereof.

In case of tendered amount is less than 5% of the estimated cost the lowest tenderer will have to deposit the additional performance security in the shape of deposit at call from any scheduled bank which will be refunded on completion of work. Failure to deposit the performance security in shape of deposit at call within 15 days would result into forfeiture of earnest money without any further notice.

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Sl. No.	Name of work.	Tender Cost (in million)	Earnest Money (in Rupee)	Time for completion	Tender Fee (in Rupee)
	Chief Minister Directive (MNA/MPA's Schemes 2012-13)				
	Mr. Mehdi Abbas Langah, MPA, PP-205				
1	Rural Drainage Scheme, Basti Ahmad Wali, Hayatpur Arien, Basti Mochi Punohan & Extension Water Supply Scheme, Mouza Hoot Wala, Tehsil Jalalpur Pirwala, District Multan. Surface Drain Type-I, Brick Pavement, Pacca Sullage Carrier. (Detail as per DNIT)	2.548	50,960/-	2 months	1275/-
2	Rural Drainage Scheme, Basti Karari Awan Mouza Theklan, Basti Saich, Basti Hafiz Abad, Basti Noon, Tehsil Jalalpur pirwala, District Multan. Surface Drain Type-I, Brick Pavement, Pacca Sullage Carrier. (Detail as per DNIT)	1.960	39,200/-	2 months	980/-
3	Rural Drainage Scheme Basti Malkani and Basti Bhalar Basti Addu Wali & Basti Arian, Basti Inayatpur, Mouza Shadi Kachala, Tehsil Jalalpur Pirwala, District Multan. Surface Drain Type-I, Brick Pavement, Pacca Sullage Carrier. (Detail as per DNIT)	2.352	47,100/-	2 months	1180/-
4	Rural Drainage Scheme Basti Khadim Hussain Chijra & Mouza Kikri, Basti Khakhi, Ghazipur Shahpur, Basti Bhatti, Zawarabad, Mouza Behly, Tehsil Jalalpur Pirwala, District Multan. Surface Drain Type-I, Brick Pavement, Pacca Sullage Carrier. (Detail as per DNIT)	2.450	49,000/-	2 months	1225/-

Sh. M. Munir Akhtar.
Executive Engineer,
PHE: Division Multan.
Ph # 061-9200701

IPL # 12980

کچھ معروف غلطیاں
اور ان کی اصلاح

اصلاح زبان

زبان و بیان کی سادگی اور خوبصورتی درست الفاظ
کے انتخاب اور ان کی ادائی میں ہے

پروفیسر محمد بابر انور

ہمارے ملک کی عوام کو مہنگائی نے پیس کر رکھ دیا ہے

عوام کے لفظی معنی ”عام لوگ“ کے ہیں۔ یہ لفظ مذکر ہے اور اس کو بصورتِ جمع بولنا صحیح ہے۔ صحیح فقرہ یوں ہوگا۔ ہمارے ملک کے عوام کو مہنگائی نے پیس کر رکھ دیا ہے۔ کچھ عرصہ سے سیاست دان اور صحافی حضرات اپنی تقریروں اور تحریروں میں عوام کو مؤنث اور بصورتِ واحد بول اور لکھ رہے ہیں۔ یہ طرزِ عمل درست نہیں۔

سرحدی علاقوں میں آباد لوگوں کی حفاظت کے لیے حکومت نے دلیرانہ اقدام اٹھایا ہے

اِقدام مصدر ہے جس میں اُٹھانا معنوی طور پر موجود ہے اس لیے اقدام اُٹھانا کے بجائے ”اقدام کیا ہے“ ہونا چاہیے۔ اسی طرح دوسرے عربی مصادر کے ساتھ بھی کرنا یا ہونا ہی لگانا چاہیے۔

علامہ صاحب مختلف دینی علوم کا بحرِ ذخّار تھے

ذخّار کے بجائے زخّار لکھنا چاہیے جس کا مطلب ہے لبالب بھرا ہوا، موجیں مارتا ہوا، طغیانی پر آیا ہوا، اُمنڈنے والا......لغت کی کسی مستند کتاب میں ذخّار کا لفظ نہیں ملتا جو لوگ بحرِ ذخّار لکھتے ہیں وہ غلط ہے۔ بحر کے ساتھ زخّار ہی صحیح ہے۔

کل اس قدر بارش ہوئی کہ جل تھل ہوگیا

جل کا مطلب پانی اور تھل کے معنی ریگستان یا خشک زمین کے ہیں۔
”جل تھل ہونا“ بے معنی ترکیب ہے۔ صحیح ترکیب ”جل تھل ایک ہوگیا“ ہے۔ یعنی بارش سے اتنا پانی جمع ہوگیا کہ خشکی اور تری برابر ہوگئے۔

انشاءاللہ

انشاءاللہ کے بجائے اِنْ شَاءَ اللّٰہ لکھنا چاہیے۔ قرآنِ حکیم میں ہر جگہ (۶ر مقامات پر) اِنْ شَاءَ اللّٰہ ہی آیا ہے۔ آج کل اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی تحریروں میں ”انشاءاللہ“ دیکھنے میں آتا ہے، یہ طرزِ تحریر درست نہیں۔

آج کے جلسے میں حاضرین کی تعداد قریباً قریباً ۱۰ر ہزار تھی

قریباً قریباً کی جگہ قریب قریب یا تقریباً لکھنا چاہیے۔ قریباً قریباً لکھنا بالکل غلط ہے۔

ہمارا مطمع (م ط م ع) نظر یہ ہے کہ اس ملک میں قرآن وسُنّت کے خلاف کوئی قانون نہیں بننا چاہیے

اس جملے میں مطمعِ نظر کی جگہ مطمح (م ط م ح) ہونا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہیے۔ مطمع (م ط م ع) کے معنی ہیں جس کی طمع کی جائے یعنی خواہش رکھی جائے۔ مطمح (م ط م ح) کے معنی ہیں مقام جگہ یا مقصد جس پر نظر ہو۔

اس لیے صحیح فقرہ یوں ہوگا:

ہمارا مطمحِ نظر یہ ہے کہ اس ملک میں قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بننا چاہیے۔

شاگرد اپنے استادوں کو دیکھ کر ان کی نقل کرنے لگ جاتے ہیں

اس فقرے میں ''جاتے'' کا استعمال غیر ضروری ہے۔ صحیح فقرہ یوں ہوگا۔ شاگرد اپنے استادوں کو دیکھ کر ان کی نقل کرنے لگتے ہیں۔

ٹیکسلا میں کئی ہزار سال پہلے کے شہروں کے کھنڈرات بکھرے پڑے ہیں

''کھنڈر'' ہندی لفظ ہے۔ عربی قاعدے سے اس کی جمع (کھنڈرات) بنانا غلط ہے۔ صحیح فقرہ یوں ہوگا۔

''ٹیکسلا میں کئی ہزار سال پہلے کے شہروں کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں۔

اختر کا مکان لبِ سڑک واقع ہے

سڑک ہندی ہے اور لب فارسی۔ اس لیے لبِ سڑک کی ترکیب غلط ہے۔ صحیح جملہ یوں ہوگا:

اختر کا مکان سڑک کے کنارے (یا سرِ راہ) واقع ہے۔

وہ عورت بڑی لڑاکی ہے

لڑاکی بجائے لڑاکا ہونا چاہیے جو مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ صحیح جملہ یوں ہوگا:

''وہ عورت بڑی لڑاکا ہے۔''

میں کبھی ملک سے باہر نہیں گیا

باہر کی جگہ باہَر ہونا چاہیے۔ یہ ہندی لفظ ہے۔ اس میں ''ہا'' پر زبر ہے..... صحیح جملہ یوں ہوگا:

میں کبھی ملک سے باہر نہیں گیا۔ (باہَر اندر کی ضد ہے) باہر عربی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں روشن اور ظاہر اور اس کا محلِ استعمال باہَر سے مختلف ہے۔

وہ بکریاں چَر رہیں ہیں

وہ مؤنث افعال جو ''ہیں'' سے پہلے آئیں وہ جمع ہونے کے باوجود واحد لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے صحیح فقرہ یوں ہوگا: ''وہ بکریاں چر رہی ہیں۔''

وہ جوتے کے ساتھ مسجد کے اندر چلا گیا

ایسے فقروں میں ساتھ کا استعمال فصاحت کے خلاف ہے۔ صحیح فقرہ یوں ہوگا:

وہ جوتے سمیت مسجد کے اندر چلا گیا۔

مجھے براستہ فیصل آباد کراچی جانا ہے

ایسے فقروں میں ''ب'' کا استعمال درست نہیں ہے۔ صحیح فقرہ یوں ہوگا۔

''مجھے فیصل آباد کے راستے کراچی جانا ہے۔''

اگر ''ب'' کا استعمال ضرور کرنا ہو تو اس کے ساتھ فارسی لفظ راہ لگائیے اور اس طرح لکھیے: ''مجھے براہِ فیصل آباد کراچی جانا ہے۔''

خالص اردو لفظ ''راستہ'' کے ساتھ ب کا استعمال فصاحت کے خلاف ہے۔

ہماری زمین کو وجود میں آئے ہوئے لکھوکھا سال گزر چکے ہیں

''لکھوکھا سال'' کے بجائے لاکھوں سال ہونا چاہیے۔ لکھوکھا لکھنا اور بولنا بالکل غلط ہے۔ صحیح جملہ یوں ہوگا۔

''ہماری زمین کو وجود میں آئے ہوئے لاکھوں سال گزر چکے ہیں۔''

عرب نوجوان کا گستاخانہ فلم کا منفرد ویڈیو جواب

محمد فلیح حسین

اسلام سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مذہب امن پسند نہیں ہے۔ جو لوگ اسلام کو تشدد کا مذہب قرار دیتے ہیں انھوں نے اسلام اور اس کی تعلیمات کا مطالعہ نہیں کیا۔ ان خیالات کا اظہار امریکا میں پیدا ہونے والے ایک عراقی مسلمان، جس کے والدین عیسائی ہیں، نے اُس ویڈیو دستاویزی فلم میں کیا ہے جو عبیر علی نامی ایک عرب مسلمان نوجوان نے تیار کی ہے۔

عبیر نے یہ دستاویزی فلم امریکا میں بنائی جانے والی گستاخانہ فلم کے جواب میں بنائی ہے جس نے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کو غم ناک اور غضب ناک بنا دیا ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمدؐ کی شان میں گستاخی سے جہاں تمام مسلمانوں کے دل تڑپ اٹھے ہیں وہاں اُن کے اندر یہ جذبہ بھی بیدار ہوا ہے کہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کو اسلام دشمن قوتوں کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہنا ہوگا۔

امریکی پادریوں اور قبطیوں کی شیطانی فلم کے ردِعمل میں لاکھوں مسلمانوں نے پُرتشدد احتجاجی مظاہروں کے ذریعہ اپنے ردِعمل کا اظہار کیا ہے لیکن عرب نوجوان عبیر نے اس گستاخانہ فلم کے مقابلہ میں ایک مختصر دورانیہ کی ویڈیو بنائی ہے۔ یہ ایک دستاویزی فلم ہے جو انگریزی زبان میں تیار کی گئی ہے۔ اس دستاویزی فلم میں پیغمبر اسلام اور قرآن پاک کے بارے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آراء حاصل کی گئی ہیں۔ ویڈیو فلم میں اسلام کے تصور، صبر، حلم اور بردباری کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔

فلم سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غیر مسلم نوجوان مذہب اسلام کو کرۂ ارض کا سب سے زیادہ برداشت اور تلقین کا مذہب ماننے پر مجبور ہیں کیونکہ اسلام کی تعلیمات نے اُن کو یہ بتایا ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ امن بقائے باہمی کے اصول کے تحت مل جل کر رہنے اور آگے بڑھنے کی تاکید کرتا ہے۔

ویڈیو فلم میں پوری اسلامی دنیا میں اشتعال کا مُوجب بننے والی گستاخانہ فلم کی طرف توجہ مبذول کرانے والے سوالات غیر مسلم نوجوانوں سے پوچھے گئے ہیں۔ سوال پوچھنے پر اس نے جواب میں کہا ''اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی پر مبنی مہم محض تعصّب اور تنگ نظری کا شاخسانہ ہے۔'' ایک دوسرے غیر مسلم نوجوان نے کہا کہ چونکہ عام لوگ ذرائع ابلاغ سے زیادہ متاثر رہتے ہیں اور میڈیا جس انداز میں اسلام اور اس کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے، وہ یقیناً عام لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ خود لوگوں کو اسلام کا مطالعہ کرنے کا موقع کم سے کم ملتا ہے۔ اس لیے وہ میڈیا کی کہی سنی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ایک اور غیر مسلم کے مطابق غیر مسلم ذرائع ابلاغ اور سخت گیر مذہبی شخصیات اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے خلاف توہین آمیز رویہ اس لیے روا رکھے ہوئے ہیں کیونکہ وہ تنگ نظر اور مذہبی انتہا پسند اور متعصّب ذہنیت کے مالک ہیں۔ دستاویزی ویڈیو فلم میں بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان قدامت پسند نہیں بلکہ ترقی پسند ہیں۔ دبئی شہر اور اس میں تعمیر ہونے والا خلیفہ ٹاور (برج الخلیفہ) مسلمانوں کی تمدنی ترقی کی روشن مثال ہے جبکہ دبئی ایک ایسے بین الاقوامی شہر کی صورت اختیار کر چکا ہے جہاں ۲۰۰ ممالک کے شہری ایک خاندان کے افراد کی شکل میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان تمام سوالات کا جواب یہی ہے کہ اسلام برداشت، صبر، حلم و بردباری کا دین ہے۔ اسلام نفرت نہیں بلکہ محبت بانٹنے کا مذہب ہے۔

ایک آسٹریلین غیر مسلم کا کہنا ہے کہ اس نے مسلمانوں سے ملنے سے قبل ذہن میں یہ سوچ رکھا تھا کہ مسلمان وحشی ہوتے ہیں اور میں جب اور جہاں کہیں بھی ان سے ملوں گا وہ مجھے اذیت پہنچائیں گے لیکن اب میں مسلمانوں میں خود کو زیادہ محفوظ خیال کرتا ہوں۔

العربیہ ڈاٹ نیٹ کے مطابق عبیر علی کی یہ دستاویزی ویڈیو ''یوٹیوب'' پر ''ہمارے بولنے کا وقت آگیا'' کے عنوان سے موجود ہے۔ ■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

از سر رشتہ تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن ملک وال

ٹینڈر نوٹس

تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن ملک وال ڈسٹرکٹ منڈی بہاؤالدین کو PPRA رولز 2009 رول 42(b) کے تحت ٹی ایم اے ملکوال اور ضلع کے دیگر ٹی ایم ایز کے منظور شدہ ٹھیکیداران جنہوں نے برائے سال 13-2012 کی رجسٹریشن فیس / تجدید فیس متعلقہ ٹی ایم اے میں جمع کروادی ہو سے بمطابق ترمیم شدہ ورکس رولز 2003 درج ذیل کاموں کے لیے سربمہر ٹینڈر مارکیٹ ریٹ سسٹم B-1 سیکنڈ ششماہی (اگست 2012 تا جنوری 2013) سے نافذ شدہ پر کم یا زائد آئٹم ریٹ / پرسنٹیج ریٹس پر مبنی مطلوب ہیں۔ ٹینڈر دفتر ٹی ایم اے / لوکل گورنمنٹ کی ویب سائٹ سے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ جو تخمینہ کا 2% کال ڈیپازٹ کے ساتھ مورخہ 12-10-10 بوقت 12:00 بجے دن تک ٹینڈر باکس میں ڈالے جاسکتے ہیں۔ جو اسی دن 12:00 بجے دن حاضر و آمدہ ٹھیکیداران کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ جس ٹھیکیدار کو کام الاٹ کیا جائے گا اس کو سات دن کے اندر اندر تخمینہ کا 10% بطور پرفارمنس سیکورٹی ادا کرنی ہوگی۔ بصورت دیگر اس کی جمع شدہ 2% زر ضمانت بحق ٹی ایم اے ملکوال ضبط کر کے کام منسوخ کر دیا جائے گا۔ زیر دستخطی کو اختیار حاصل ہوگا کہ کوئی ایک یا تمام ٹینڈرز بغیر وجہ بتائے مسترد کر دے اور کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔ مزید تفصیلات دفتر تحصیل آفیسر (آئی اینڈ ایس) سے دفتر اوقات کار میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

نوٹ: جو ٹھیکیداران ٹینڈرز میں حصہ لیں گے ان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے ٹینڈر کے ساتھ رجسٹریشن کی تصدیق شدہ کاپی ساتھ لف کریں۔

نمبر شمار	نام منصوبہ جات	تخمینہ لاگت	زرضمانت	فنی منظوری نمبر و تاریخ	معیاد تکمیل
1	تعمیر ویئر ہاؤس ملک وال	998000/-	20000/-	798/TO(I&S)MBDin Dated 13-09-12	بمطابق ورک آرڈر

1- کوٹیشن برائے خرید ملٹی میڈیا

تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن ملک وال اپنے دفتر کیلئے ملٹی میڈیا خریدنا چاہتی ہے۔ خواہشمند حضرات اپنی کوٹیشنز ہمراہ 5000 روپے کال ڈیپازٹ مورخہ 10.10.12 تک بوقت 12:00 بجے دن دے سکتے ہیں جو اسی روز بوقت 2:00 بجے دن حاضر کوٹیشن دہندگان کی موجودگی میں کھولی جائیں گی۔ مزید معلومات دفتری اوقات کار میں دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہیں زیر دستخطی کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ بغیر وجہ بتائے ایک یا تمام کوٹیشنز منظور یا مسترد کر دے۔

2- کوٹیشن برائے خرید گھاس کٹر بمعہ پیٹر

تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن ملک وال ایک عدد گھاس کٹر مشین جس کے اوپر 5.5HP کا پیٹر انجن نصب ہو اور پیٹر انجن بغیر پانی کے چلتا ہو خریدنا چاہتی ہے۔ خواہشمند حضرات اپنی کوٹیشنز ہمراہ 5000 روپے کال ڈیپازٹ مورخہ 10.10.12 تک بوقت 12:00 بجے دن دے سکتے ہیں جو اسی روز بوقت 2:00 بجے دن حاضر کوٹیشن دہندگان کی موجودگی میں کھولی جائیں گی۔ مزید معلومات دفتری اوقات کار میں دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہیں زیر دستخطی کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ بغیر وجہ بتائے ایک یا تمام کوٹیشنز منظور یا مسترد کر دے۔

المشتہر

TEHSIL MUNICIPAL ADMINISTRATION MALAKWAL
تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن ملکوال

Administrator
M.A Malakwal
ایڈمنسٹریٹر
تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن ملکوال

IPL # 12965

ہم کسی سے کم نہیں

تحریم حنا صدیقی

ماہ رفتہ میں رونما ہونے والے اہم واقعات اور اُن سے وابستہ شخصیات کا اجمالی تذکرہ جو ملک کا وقار بڑھنے کا باعث ہیں

اُن کے لیے خاص جنھیں پاکستان اور پاکستان کی عزت بے حد عزیز ہے

ہمارے

نوجوان ہی ہمارے ملک کے مستقبل کے معمار ہیں لیکن مناسب رہنمائی اور مطلوبہ ملازمتیں نہ ملنے کی وجہ سے بے حساب نوجوان غلط راستوں پر چل نکلتے ہیں جبکہ زیادہ تر مایوسی کا شکار ہیں۔ ہم اپنی یہ ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے ان نوجوانوں کا پاکستان پر اعتماد بحال کریں۔ ہمارے جو نوجوان طلبہ و طالبات نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں یہ صفحات انہی کی حوصلہ ہیں۔

سب سے پہلے آپ کی ملاقات قیانوس خان اور محسن علی سے کروا رہے ہیں۔ یہ دونوں نوجوان مبارک بعد کے مستحق ہیں کیونکہ عدم وسائل اور نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے یقیناً ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کے اس کارنامے پر حوصلہ افزائی کے لیے وزیراعلیٰ شہباز شریف نے نہ صرف ۱۰/لاکھ روپے کی انعامی رقم کا اعلان کیا بلکہ محسن علی کو ایک گھر بھی الاٹ کردیا ہے۔ یہ اقدامات قابل تعریف ہیں۔ وزیراعظم راجہ پرویز اشرف نے بھی ۱۰/لاکھ روپے دیے۔ شباب ملی نے ایک لاکھ روپے اور سہارا نے ۵۰/ہزار روپے دیے۔ ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور ڈھابوں پر بیراگری کا کام ہو یا ردی چننے اور رزقِ حلال کمانے کا۔ بے شک کام اور محنت کرنے میں کوئی شرم کی بات نہیں۔ یورپ اور امریکا میں بہت سارے نوجوان اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ہوٹلوں، ریستورانوں، اسٹورز اور پٹرول پمپوں پر کام کرتے ہیں۔ لیکن ان کے لیے تعلیم کے مواقع بھی ہوتے ہیں۔

ردی اکٹھی کرنے والا قیانوس خان

کوٹلی آزاد کشمیر میں رہنے والے، چودہ سالہ قیانوس خان نے آزاد کشمیر انٹرمیڈیٹ بورڈ، میرپور سے (آرٹس گروپ) میں نہ صرف آزاد کشمیر میں دوسری اور ضلع کوٹلی میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے پاکستان اور آزاد کشمیر بھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے عوام کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس نوجوان کے پوزیشن لینے پر لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا اور اس کی وجہ قیانوس خان کے حالات ہیں۔ قیانوس خان کے والد معلم خان اپنے بڑے بھائی نوشاد خان کے ہمراہ تقریباً بیس سال قبل پاکستان کے صوبہ خیبر پختون خواہ کے شہر، پشاور کے علاقے، شاہین آباد نمبر ۲ مسلم ٹاؤن سے محنت مزدوری کی غرض سے کوٹلی آگئے اور یہاں پر ردی اور اسکریپ کا کام شروع کر دیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ حالات بھی تبدیل ہوتے رہے، معلم خان کی سکریپ کی دکان (کباڑ خانہ) ہے۔ وہ اپنے مالی حالات تو مستحکم نہ کر سکا مگر اس نے اپنے بچوں کو عزت کی روٹی ضرور فراہم کی۔ یہاں تک کہ معلم خان کی شادی ہوگئی اور وہ اپنی اہلیہ کو بھی کوٹلی لے آیا۔ معلم خان کے ۹ر بچے ہیں، جن میں قیانوس خان دوسرے نمبر پر ہے۔ قیانوس خان نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے والد کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا، وہ کوٹلی شہر کی گلیوں میں گھوم پھر کر ردی اکٹھی کرتا اور اپنے کباڑ خانے کو بھی بھرپور وقت دیتا۔

قیانوس خان کا کہنا ہے، جب میں بچپن میں شہر کی گلیوں میں روزی روٹی کی تلاش میں گھوم پھر رہا ہوتا تو سویرے حصولِ علم کی غرض سے اپنے ننھے اور کمزور کندھوں پر بیگ لگائے اسکولوں کی جانب جاتے بچوں کو دیکھتا تو میرا جی چاہتا کہ میں بھی علم حاصل کروں۔ ایک دن میں نے اپنے والد سے اپنے دل کی خواہش بیان کی تو انہوں نے میرا شوق دیکھ کر نامساعد حالات میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ گھر کے قریب ہی ایک پرائیویٹ اسکول (آئیڈیل پبلک اسکول) میں داخلہ بھی کرا دیا۔ تعلیم کے شوق کی وجہ سے میں جلد ہی اسکول کے اچھے طلباء میں شامل ہوگیا اور اساتذہ نے خصوصی توجہ دینا شروع کر دی۔ قیانوس خان نے کہا، میں سکول داخل ہونے اور علم حاصل کرنے پر خوش تھا مگر یہ بھی احساس تھا کہ میرے والد کے کندھوں پر بہت بوجھ ہے، یہی احساس مجھے اسکول سے چھٹی کے بعد والد کا ہاتھ بٹانے کی طرف راغب کرتا اور میں جتنی محنت تعلیم حاصل کرنے میں صرف کرتا، اس سے کہیں زیادہ محنت کر کے شہر بھر میں گھوم کر ردی اکٹھی کرتا اور اپنی دکان کو بھی وقت اور توجہ دیتا۔

قیانوس خان کا کہنا تھا کہ وقت گزرتا گیا اور میں مڈل کلاس تک پہنچ گیا مگر روز بروز بڑھتی مہنگائی نے میرے سر پر خوف کی تلوار لٹکائے رکھی کہ کب والد صاحب تعلیم کا خرچ برداشت نہ کر سکنے کا کہہ کر اسکول سے پکی چھٹی کا اعلان کر دیں گے مگر میرے والد نے میرا بھرپور ساتھ دیا، اس لیے میں نے جو پوزیشن لی ہے اس سے ملنے والی عزت اور وقار کا سب سے زیادہ کریڈٹ والدِ محترم کو دیتا ہوں۔

قیانوس خان نے کہا کہ میرے والد کے بعد میری کامیابی کا سارا کریڈٹ میرے اساتذہ کو جاتا ہے۔ مڈل تک تعلیم میں نے آئیڈیل پبلک سکول دھڑا منڈی سے حاصل کی، وہاں پر سکول کے پرنسپل، عبدالرحمان چوہدری نے مجھ پر بھرپور توجہ دی اور جب کرایہ کا مکان تبدیل کرنے کے باعث مجھے وہ اسکول چھوڑنا پڑا تو میری خوش قسمتی تھی کہ جموں کشمیر ہائیر سیکنڈری اسکول ڈھنگروٹ کے پرنسپل نے میرے حالات اور تعلیم کا شوق دیکھتے ہوئے مجھے خصوصی

توجہ دی۔ سکول ٹائم کے بعد بھی وقت دینے کے ساتھ ساتھ رات کو ادارہ ہذا کے ہاسٹل میں بلا کر اپنے دو، تین قیمتی گھنٹے میری تعلیم کے لیے وقف کرتے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ عمل ایسا تھا جس نے میرے ٹیلنٹ میں نکھار پیدا کیا۔ مجھے اللہ کے کرم سے جو مقام حاصل ہوا ہے وہ والدین کی دعا، سرپرستی اور اساتذہ کی محنت کے بغیر کبھی حاصل نہ ہو پاتا۔ میں اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہوں کہ مجھے دوسرے بچوں کی نسبت اَن پڑھ ہونے کے باوجود اپنے والدین کی مثبت سوچ اور سختی اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہی اور یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دوسرے بچوں کی نسبت بہتر اعزاز سے نوازا۔

قیانوس خان کا کہنا تھا کہ تعلیم کے حوالے سے میرے بہت سے خواب ہیں، جو اس وقت پورے ہوں گے جب میں اپنی تعلیم مکمل کر لوں گا۔ اپنی تعلیم کے سفر کی تکمیل کے لیے پرامید ہوں مگر اب اپنے والدین پر مزید بوجھ بننا میرے لیے انتہائی مشکل ہوگا۔

قیانوس خان کے والد معلم خان نے اپنے بیٹے کی کامیابی پر اپنے تاثرات یوں بیان کیے۔ ان خوشی کے لمحات کو الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ناممکن ہے، ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے بیٹے قیانوس نے میری محنت کا پھل مجھے دے دیا ہے۔ اللہ پاک کی مہربانی سے میری محنت کا مقصد بھی پورا ہوگیا ہے۔ میں اور میری اہلیہ سمیت میری فیملی کے تمام افراد ان پڑھ ہیں، قیانوس سے قبل میرے بڑے بھائی، نوشاد خان کے بیٹے نے میٹرک کیا وہ ہماری فیملی کا پہلا پڑھا لکھا نوجوان تھا اور اب قیانوس نے تو ہماری فیملی کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ انہوں نے بتایا میں چونکہ خود اَن پڑھ تھا، اس لیے پڑھائی کی قدر تھی اور پھر قیانوس کا شوق دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جتنی محنت کرنا پڑے کروں گا مشکل سے مشکل حالات کا مقابلہ کروں گا مگر اپنے بیٹے کو تعلیم ضرور دلاؤں گا اور اس کے خواب میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں آنے دوں گا۔

محسن علی
پنجاب یونیورسٹی میں اول

محسن علی پنجاب یونیورسٹی کے بی اے کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والا نوجوان ہے، جو تندور پر روٹیاں لگاتا تھا اور لاہور میں کرائے کے ایک ایسے کمرے میں رہتا تھا جہاں مزدوری کرنے والے ۱۲ر سے ۱۸ر مزید مزدور رہائش پذیر تھے لیکن تمام تر مشکلات کے باوجود اس

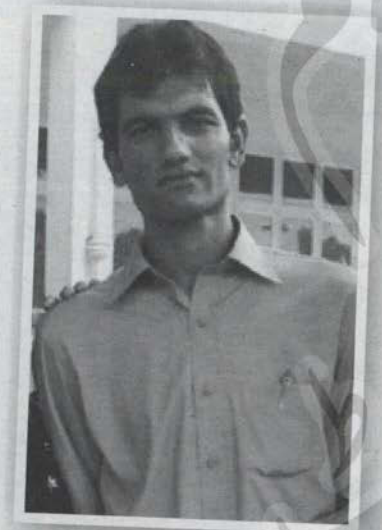

نوجوان نے اپنے تعلیم کے شوق کو جاری رکھا اور پنجاب یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ محسن کی اس کامیابی میں اس کا چھوٹا بھائی بھی قابل تعریف ہے۔ جس نے اپنا شوقِ تعلیم پسِ پشت ڈال کر اپنے بڑے بھائی کا ساتھ دیا اور اس تندور پر بعض اوقات خود ڈبل شفٹ لگاتا، جب اس کے بڑے بھائی کے امتحانات ہوتے یا اس نے زیادہ پڑھائی کرنا ہوتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کومل علی کی خوش قسمتی

''اگست ۲۰۰۸ء کی بات ہے جب کومل نے یوتھ ایکسچینج اینڈ اسٹڈی پروگرام کے لیے درخواست دی۔ اس پروگرام کے تحت ۱۷/سال سے کم عمر طلباء طالبات کو اس بات کا موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ کسی امریکن ہائی اسکول میں داخلہ لیں اور ایک سال کے لیے کسی امریکن فیملی کے ساتھ رہتے ہوئے تعلیم حاصل کریں۔ اس کے لیے طلبہ کو امریکی حکومت کی جانب سے ایک سال کے لیے مکمل وظیفہ دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں، جب کومل نے اپنی درخواست مکمل کی اور دستاویزات چیک کرنی شروع کیں، تو کئی افراد نے یہ کہہ کر حوصلہ شکنی کی کوشش کی، ''تم نے صرف میٹرک کیا ہے، جبکہ وہاں اے لیولز کے طلبہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے تبصروں سے اس کا دل دُکھتا اور کم ہمتی سی محسوس ہوتی، تاہم اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ نہ صرف ٹیسٹ اچھے نمبروں سے پاس کیا بلکہ انٹرویو میں بھی کامیابی حاصل کرلی اور اُن ۶۱/ پاکستانی طلبہ میں شامل ہوگئی، جن کو سال ۲۰۰۹ء-۲۰۰۸ء کے لیے امریکا میں پاکستان کی نمائندگی کا موقع ملا۔

اس ایک سال کے اختتام تک اپنے ساتھی طالب علموں کے ساتھ دوستی اور محبت کا نہ ختم ہونے والا تعلق قائم ہوچکا تھا۔ امریکا میں رہتے ہوئے متنوع پاکستانی ثقافت، لذیذ کھانوں اور فنونِ لطیفہ کو متعارف کروانے کا موقع بھی ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کے طلبا کے ساتھ دور دراز علاقوں میں کام کرتے ہوئے مختلف پس ہائے منظر کے افراد سے باہمی رابطوں کا موقع بھی حاصل ہوا۔ ایک ہی سال کے دوران اُسے ممتاز بین الاقوامی اداروں اور امریکا کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے تعریفی اسناد اور ایوارڈز سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ امریکا کے صدر باراک اوباما کی طرف سے صدارتی طلبہ سروس کے تحت ایک سرٹیفکیٹ بھی دیا گیا۔ سال ۲۰۰۹ء میں وطن واپسی پر، گھر والوں اور دوستوں نے شاندار تعلیمی ریکارڈ اور کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے اے لیولز کے لیے حوصلہ افزائی کی۔ آغا خان یونیورسٹی، ایگزامینیشن بورڈ (اے کے یو۔ ای بی) کے تحت امتحان دینے کے دوران طلبہ میں نصاب کی جو سمجھ بوجھ پیدا ہوتی ہے اور جس بہترین انداز میں امتحانات لیے جاتے ہیں، اس کی بنا پر اے کے یو۔ ای بی کے تحت انٹرمیڈیٹ امتحان دینے کا فیصلہ کیا۔ وقت تیزی سے گزرا اور پھر ماؤنٹ ہولی اوک کالج میں درخواست دے دی، جو امریکا کے قدیم ترین لبرل آرٹس انسٹی ٹیوٹس میں سے ایک ہے۔

اسکولسٹک اسیسمنٹ ٹیسٹ (SAT) کی تیاری کرتی رہی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلی ہی کوشش میں SAT اسکور ۲۱۵۰ رہا، جو سہیلیوں کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا۔ سردیوں کی ایک صبح جب اس نے اپنی ای میلز چیک کیں، تو ایک ای میل کا عنوان دیکھ کر دل زور سے دھڑکا۔ اس ای میل میں ماؤنٹ ہولی اوک کالج کی انتظامیہ کی جانب سے اس کے داخلے کا فیصلہ اس کا منتظر تھا۔ داخلہ ملنے کی خوشی سے دل بلیوں اچھلنے لگا۔ تعلیمی اخراجات کا ۹۲/فیصد حصہ وظیفہ کے طور پر دیا جارہا تھا، جو ۴/برس کے لیے مکمل طور پر ۴۶/ہزار امریکن ڈالر کی رقم تھی۔ اُس نے اپنے والدین کو یہ خبر آنسوؤں اور مسکراہٹ کے عجیب وغریب امتزاج کے ساتھ سنائی۔ ان کی خوشی بھی دیدنی تھی۔

جولائی ۲۰۱۱ء میں، ہارورڈ یونیورسٹی کے میلینیم کیمپس کانفرنس میں شرکت کے لیے درخواست دی اور خوش قسمتی سے مکمل اسکالر شپ پر وہاں بھی شرکت کے لیے منتخب ہوگئی اور اب اُسے گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اپنی زندگی کی دو بڑی کامیابیوں کا انتظار تھا، یونیورسٹی کی تعلیم کی شروعات اور کانفرنس میں شرکت۔ ■

ایک دلچسپ آپ بیتی

لاہور میں حجامت کی دکان سے شروع ہونے والے

۱۰۰ سالہ سفر کی حیرت افزا داستان

جو تیسری نسل میں رائل ہیرڈریسنگ سیلون، بیوٹی پارلر، ہیرڈریسر میگزین اور بیوٹی کالج بنانے تک نہیں بلکہ رائل گروپ کے نام سے ایک پورا بزنس گروپ بنانے، کامیابی سے چلانے کی حیرت انگیز تفصیلات لیے ہوئے ہے

تحریر و تہذیب: اختر عباس

رائل ہیرڈریسر لاہور گولڈن سیزرز دبئی کے مختار احمد امتیاز احمد کی کہانی

ہیئرسٹائلسٹ کے حیران کُن عروج کی داستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۱۰۷

سال پہلے ۱۹۰۵ء میں میرے دادا حاجی اللّٰہ بخش نے نجیب آباد اُتر پردیش سے ہجرت کی۔ وہ اپنے کسب میں کمال پانے کے خواہش مند تھے۔ بمبئی کے بجائے انھوں نے لاہور آنے کا فیصلہ کیا اور یہاں آ کر انھوں نے انارکلی میں بال تراشنے کی دکان بنائی۔ ڈلہوزی شوز سے پانچویں دکان تھی، بائیبل سوسائٹی کے ساتھ۔ اُنھیں تب اندازہ تھا کہ یہ جگہ گورنمنٹ کالج، پنجاب یونیورسٹی اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج جیسے اداروں میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کے قریب تھی۔ لوگ بڑے شوق سے بال کٹوانے اور شیو کرانے کے لیے آتے۔ ان کے پاس کام کرانے کے لیے آنے والے سارے لوگ ہی ''جنٹری'' کے تھے۔

دادا نے ۱۹۲۹ء میں حج کیا۔ وہ ہمارے خاندان کے پہلے آدمی تھے جنھوں نے بیت اللّٰہ کی زیارت کی۔ ان کا دل بڑا اچھا اور بڑا تھا۔ شاگردوں کو کام سکھاتے اور ترغیب دیتے کہ اپنا کام کرو۔ اپنی دکان بناؤ اور اچھا کام کرو۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حجام صندوقچی لے کر گلی کی نکڑ پر بیٹھ کر حجامت کر دیتے تھے۔ شیو کے لیے کوئی تھڑا دیکھ لیا۔ درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ دادا نے لکڑی کی ۳ر سیٹیں بنوائیں، فریم بنا کر۔ دکان بھی اندر سے صاف ستھری تھی۔ ۶۰ء کا زمانہ شروع ہوا تو وہ پگڑی کے ساتھ کاٹن کی پوشاک پہننے لگے۔ اب وہ اپنے گاہک کے گلے پر جو کپڑا باندھتے وہ بھی سفید کلف لگا ہوتا۔ یہ کپڑا دوبارہ دُھلے بغیر استعمال نہیں ہوتا تھا۔

ہمارے والد امتیاز احمد ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ جیسے مچھلی کے بچے کو تیرنا سیکھنا نہیں پڑتا اس کی جبلّت میں ہوتا ہے، اسی طرح اچھی حجامت اور شیو کا فن ہمارے والد صاحب کو ورثہ میں ملا۔ دادا نے تب تک مزنگ میں ۳ر منزلہ گھر بنا لیا تھا۔ وہ بوڑھے ہوئے تو اللّٰہ نے خوشحالی عطا کر رکھی تھی۔ ہمارے کئی عزیز ۴۷ء کے بعد پاکستان آئے تو انھوں نے چمڑے کا کام شروع کیا۔ وہ شوز کے Upper بناتے تھے۔ والد صاحب نے پیشہ تبدیل نہیں کیا۔ اسی کو پوری محنت، توجہ اور سمجھداری کے ساتھ جاری رکھا۔ لکڑی کی سیٹیں لیدر میں بدل گئیں۔ سیلنگ والی فریمنگ آ گئی۔ اعلیٰ پتھر کا فرش بن گیا۔ انھوں نے سٹاف کے لیے یونیفارم شروع کر دیا۔ سفید پینٹ، سفید شرٹ، کسٹمرز میں کئی ڈاکٹر تھے۔ انھی کے مشورے سے اوزاروں کو سٹریلائز کرنے کا آغاز کر دیا۔ ایک سپرٹ لیمپ جلتا رہتا تھا۔ اس کے شعلے سے اوزار گزرتے اور جراثیم سے محفوظ ہو کر استعمال ہوتے تھے۔

والد صاحب کی محنت اور ایمانداری کو اللّٰہ نے بہت برکت دی۔ ۶۵ء تک ان کی شہرت ان کے ایک نئے کٹ ''کریوکٹ'' (Crew cut) سے ہو چکی تھی۔ یہ اسٹائل جاپانی بالوں کی کٹنگ جیسا تھا۔ آرمی اور پولیس کے لوگ شوق سے آتے تھے۔ بال مہارت سے یوں کٹتے جیسے اوپر لنٹر ڈال دیا ہو بالکل سیدھے، بال بڑے انوکھے اور منفرد لگتے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ ۱۰ر سے ۱۲ر منٹ میں حجامت بنا دیتے تھے۔ میں کافی مہارت اور سالوں کے بعد بھی ۴۵۔۴۰ر منٹ لیتا ہوں۔

۷۹ء میں کاروبار میں ایک ٹرن آیا۔ دکان اوقاف کی تھی۔ انھوں نے بنا بنایا، جما جمایا اڈا واپس لے لیا۔ ۸۱ء تک ہم نے معینہ وقت سے پہلے ہی وہ جگہ خالی کر دی۔ والد صاحب نے کہا میں اور میرے بچے مقدموں میں نہیں پھنسیں گے۔ انھوں نے ہمت کی اور ریواز گارڈن آ گئے۔ پلازہ کے مالک ملک ستار والد صاحب کے کسٹمر تھے۔ انھوں نے والد صاحب کو پریشان دیکھ کر کہا باقی کام بعد میں پہلے آپ کی دکان تیار کر کے دیتا ہوں۔ یہاں پہلی مرتبہ لیڈیز کے لیے علیحدہ سے پورشن بنایا گیا۔ ۵ر سیٹیں مردوں کی اور ۲ر سیٹیں خواتین کی۔ اللّٰہ کا کرنا یہ ہوا کہ انارکلی کی نسبت ۳ر گنا کام بڑھ گیا۔ پارکنگ کی کھلی جگہ تھی۔ والد صاحب سکوٹر پر آتے اور کاؤنٹر پر بیٹھتے تھے۔ کوئی لڑکا کام صحیح نہ کر رہا ہوتا تو ٹیبل پر ہاتھ مارتے اور وہیں سے اسے ٹھیک کرا دیتے۔ ایسا گر بتاتے کہ بال کِھل کر سامنے آ جاتے۔

میری انٹری ۷۹ء میں ہوئی میٹرک کے بعد، والد صاحب کی زیرِ نگرانی ۸۵ء تک کام کیا اور پھر شان پلازا سانده میں شفٹ ہو گیا۔ ہم نے ۸۵ء میں ''پرم بالوں'' کا کریز ڈالا۔ ہمارے پاس گاہکوں کی لائنیں لگی ہوتی تھیں جو اپنے بالوں کو پرم کرانے آتے تھے۔ اس سال میں نے ''رائل کٹ'' متعارف کرایا۔ موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے بال اُڑ کر عجیب شکل اختیار کر لیتے تھے۔ اس

روسانو فیریٹی (Rossano Ferretti) دنیا کا سب سے مہنگا ہیر ڈریسر مانا جاتا ہے اور اس کا تعلق اٹلی سے ہے۔ اس کے نیو یارک، میامی، پیرس اور میلان سمیت دنیا کے ۲۰ر شہروں میں سیلون (Salon) ہیں۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ ہر کسٹمر کو ذاتی توجہ ملتی ہے۔ مین ہٹن (Manhatten) میں ایک ہیر کٹ ایک ہزار ڈالر میں کی جاتی ہے۔

فیریٹی کا کہنا ہے کہ میں اپنی ٹیم خود تیار کرتا ہوں اور انھیں ۶ر ماہ کے لیے اٹلی میں ٹریننگ دی جاتی ہے۔ لیڈی گاگا اور انجلینا جولی جیسی معروف شخصیات (Celebrities) اس کی خدمات حاصل کر چکی ہیں۔ اس ہیر ڈریسر کا کہنا ہے کہ میں آج جو کچھ ہوں اپنے کام کی وجہ سے ہوں۔ ایسی باتیں بے شک ہمیں کہانیاں لگتی ہیں مگر مغربی ممالک میں یہ کہانیاں عام ہیں۔ مشرق میں بادشاہوں کے دربار سے وابستہ حجام شاہی حجام کا عہدہ پاتے تھے۔ بادشاہوں کے جانے سے پھر بادشاہت بھی نہ رہی مگر معاشرے کی خدمت کرنے والے دوسرے پیشوں کی طرح اس سے وابستہ لوگ بھی زندگی کی گاڑی کو کھینچنے لگے۔

کبھی غور کیجیے تو گزشتہ چند دہائیوں سے مالی آسودگی آنے کے بعد ان پیشوں سے وابستہ لوگوں نے بھی اپنے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا شروع کیا مگر عام طور پر یہ ہوا کہ قصائی کے بچے پڑھ لکھ کر واپس اس شعبے میں آئے نہ نانبائی کے اور نہ حلوائی کے۔ لوہار کے بچے کالج تک پہنچے یا ترکھان کے انھیں اپنے لیے کامیابی کسی اور پروفیشن میں نظر آئی۔ اپنے کام میں واپس آتے شرمندگی محسوس ہوئی۔ اکثر نے نوکریاں کر لیں۔

آپ بیتی کا سلسلہ شروع کرتے وقت ہمارا خیال تھا کہ وہ لوگ جو بڑے کاروبار میں تو نہیں ہیں مگر اپنے کاروبار میں مسلسل محنت سے، خدمت سے آگے بڑھے ہیں، ان کی آپ بیتی آپ کو سنوائیں، ان سے ملوائیں۔ یہ لوگ ہمارے آپ کے آس پاس موجود ہوتے ہیں مگر ہم نے کبھی اس خیال سے ان پر ان کی کامیابی اور محنت پر غور ہی نہیں کیا ہوتا۔ اس ماہ ہم رائل ہیر سیلون اینڈ بیوٹی پارلر کے مختار احمد ولد امتیاز احمد کے علاوہ ان کے بھائی خورشید احمد اور فیاض احمد سے ملے۔ ان کے بچوں سے بھی ملاقات کی، ان کے پارلر بھی دیکھے۔ یہ ساری ملاقاتیں اس آپ بیتی میں ڈھل گئیں جو آپ کے لیے کئی حیرتیں لیے ہوئے ہے۔ آپ نے پہلے کم ہی ایسی آپ بیتی سنی ہوگی۔ آپ نے بھی اپنے شعبے میں کامیابی پائی ہے تو اپنی آپ بیتی کے ساتھ رابطہ کیجیے۔ ہمارے ہاں اس شعبے سے وابستہ ہزاروں خاندان ہیں مگر کبھی کسی نے اتنی بلند آہنگی کے ساتھ نہ تو اپنے کام اور نہ پیشے کو Own کیا ہے نہ اس پر فخر کیا۔ رائل سیلون بیوٹی پارلرز کی کامیابی، اعلیٰ معیار اور صاف ستھرا ماحول ایسا ہے کہ روایتی ہیئر ڈریسنگ کا سارا تصور ہی بدل کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ اسی خاندان کے موجودہ سربراہ مختار احمد کی کہانی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو میں نے بیک سے ٹرن دے دیا، وہ بہت ہی شاندار بن گیا۔ رائل کٹ نے وحیدمراد کٹ کو مات کر دیا۔ کام اتنا بڑھ گیا کہ ہمیں کھانا کھانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ یہ زمانہ تھا جب ٹی وی کا کریز بڑھا۔ بڑے بڑے ٹی وی آرٹسٹ اور کرکٹر ہماری طرف آنے لگے۔

مجھے نیا نیا کام سیکھنے اور کرنے کا شوق ہوا۔ والدصاحب کو بتایا اور میں ایک ماہ کے لیے فرانس چلا گیا۔ وہاں فیصلہ کیا کہ یہاں کام سیکھوں گا۔ ابھی واپس نہیں جانا۔ پونے دو سال وہاں رہا۔ داخلہ لے لیا۔ کافی کام سیکھ کر آیا مگر والدصاحب ناراض تھے۔ ان کا خیال تھا اگر نہ جاتا تو اب تک وہ ریواز گارڈن میں پلاٹ لے چکے ہوتے۔ ۹۰ء میں والدصاحب نے ہیئر اینڈ بیوٹی آرٹ کالج کے نام سے ایک ادارہ قائم کرکے اس پروفیشن کو ایک نئی جہت دے دی۔

والدصاحب نے کمیونٹی کے نمایاں لوگوں کو بورڈ میں رکھا تاکہ ان کے زیادہ سے زیادہ بچے یہ ہُنر سیکھ سکیں۔ کالج کے نام میں رائل کا لفظ بھی نہیں رکھا چونکہ برادری میں بعض لوگوں کے دل چھوٹے ہوتے ہیں۔ انھیں لگتا ہے اپنا ہی جھنڈا بلند کر رہے ہیں۔ سارا خرچ والدصاحب ہی کرتے تھے۔ مجھے انھوں نے فرانس سے واپسی پر یہ اعزاز دیا کہ اس کالج کا پہلا پروفیسر بنا دیا۔ ہفتے میں ایک دن سانده برانچ میں کام بند کر دیتا اور اس روز طالب علموں کو لیکچر دیتا جو یہاں سیکھا وہ بتاتا جو فرانس میں پڑھا وہ سمجھاتا۔ ۹۶ء تک خدمت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران بیرونِ ملک سے ہمارے پروفیشن سے وابستہ وفود کے آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ہم نے الحمراء ہال ون بک کراکے بہت بڑی تقریب کی اور طلبہ میں اسناد تقسیم کیں۔ دلدار پرویز بھٹی مرحوم کے والدصاحب سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ انھوں نے میزبانی کی۔ منظور وٹو صاحب سپیکر تھے۔ انھوں نے آنے کا وعدہ کیا مگر اپنے سیکرٹری ارشاد لیسی سے کہا کہ ہال میں حاضرین دیکھ کر بتانا، ان کا خیال تھا پتا نہیں چار لوگ آئیں گے یا نہیں۔ وٹو صاحب کو بتایا گیا کہ ہال کی سیڑھیاں بھی بھری ہوئی ہیں، وہ پھر بھی باربر کمیونٹی یا زلف تراشوں کے پہلے فنکشن میں آنے سے جھجک رہے تھے۔ ۱۵ منٹ کا کہہ کر آئے۔ ہم نے سب سے پہلے ان سے اسناد دلوائیں پھر ان کو شیلڈ دی۔ تقریر کے لیے بلایا تو ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہی گزر چکا تھا۔ ۴۵ منٹ انھوں نے تقریر کی۔ ۹۶ء میں ہی ہماری زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ میں نے دبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ والدصاحب پھر ناراض ہوگئے کہ جب کام سیدھا ہونے لگتا ہے یہ نکل جا ہے۔ وہاں جا کر میں نے ''گولڈن سیزرز سیلون'' کے نا سے دکان شروع کی۔ والدصاحب کو بلوایا تو بہت خوش ہوئے۔ وہاں یونیفارم کے ساتھ نیم پلیٹ، شوز، ہر چی لازم کی۔ اب وہاں ۴ برانچیں ہیں کراما، المظہر ون او المظہر ٹو اور لیڈیز کے لیے الراشدیہ۔ کام کرنے وال لڑکے یہیں لاہور سے لے کر جاتا ہوں۔ جو یہاں اچ کام کرتا ہے، اُس کی پروموشن ہو جاتی ہے۔ وہاں میر پاس ۱۵ لڑکے کام کر رہے ہیں۔ آج کل یہاں لاہور آ ہوں تو لیپ ٹاپ کی مدد سے دبئی کی شاپس کا سارا کا دیکھ لیتا ہوں۔ کیمرے لگے ہوئے ہیں۔

پیسا آنے کے بعد بھی ہم میں سے کسی نے اپنے خاندانی کام کو چھوڑنے کا نہیں سوچا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۲۰۰۹ء میں سیلون اور بیوٹی پارلر ایسوسی ایشن مہاراشٹر (بھارت) نے شاہ رخ خان کی فلم بلو باربر میں باربر کے لفظ پر احتجاج کیا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا اس کا نام بلو ہیرڈریسر کیا جائے۔ شاہ رخ خان نے فلم پوسٹرز میں اس لفظ پر سفید کاغذ لگا دیا کیونکہ پوسٹرز کو دوبارہ چھاپنا اچھا خاصا مہنگا تھا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں ٹی وی ڈراموں میں حجام کے کردار ہمیشہ مشہور رہے۔ منور ظریف کا بھائی مجید ظریف آخری عمر تک ایک ایسے ہی کردار سے پہچانا جاتا رہا۔ فلموں میں تو یہ کردار ہیرو کے دوست اور قریبی جانے جاتے رہے ہیں۔

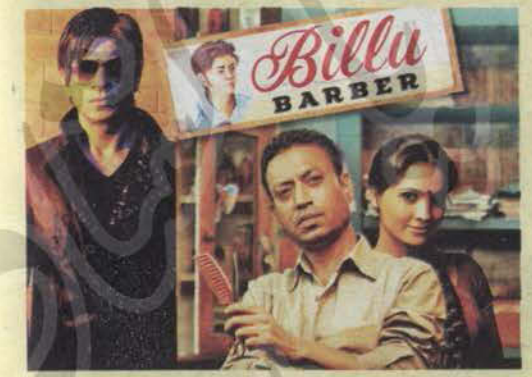

ہمارے ہاں گاؤں کے کلچر میں بھی یہ لوگ بہت اہم ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ کے پیغامات سے لے کر کھانے پکانے کا سارا اہم ترین کام انہی کے بڑے سمجھتے اور سنبھالتے آئے ہیں۔ ہندوؤں کی ذات برادری کے تصورات بہت سخت ہیں۔ ان سے نجات پاتے پاتے ہمیں کافی وقت لگا ہے۔ اگرچہ معاشرے میں آج بھی ہیئر ڈریسنگ، زلف تراش جیسے شعبوں کو کم حیثیت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن بہت سے ایسے لوگ اس پروفیشن سے اچھی کمائی کر رہے ہیں۔ جو مستقل مزاجی کے ساتھ اس کام سے جڑے رہے اور اس میں خدمت اور عمدگی لاتے رہے۔ بھارت میں یہ مسئلہ بہت زیادہ گمبھیر ہے۔ وہاں محنت کرنے والے پیشوں کو زیادہ عزت نہیں دی جاتی۔ ایک سگما بنا کر سمجھ لیا گیا ہے کہ نسل در نسل اس طرح غربت میں رہنا ان پر لازم ہے۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہوا۔ یہاں وقت کے ساتھ ساتھ خیالات اور حالات سب بدل گئے۔

۲۰۰۶ء میں ہمارے خاندان کے ہیرڈریسنگ کے شعبے میں ۱۰۰؍سال مکمل ہونے پر جشن منایا گیا اور جوہر ٹاؤن میں ایک جدید ترین شاپ کا آغاز کیا۔ اسے چھوٹا بھائی فیاض دیکھتا ہے۔ اس نے بی کام کیا ہے۔ پھر اسے کمپیوٹر کورس کرائے ہیں۔ اس نے پہلی بار رائل میں بال بنانے سے پہلے کمپیوٹر میں تصاویر بنا کر دکھانے کا آغاز کیا کہ کون سا سٹائل آپ کے چہرے کو سوٹ کرے گا۔ اس چیز نے بڑی دھوم مچائی۔ ہماری ساری شاپس صحت کے لحاظ سے بہت ہائی جینک ہوتی ہیں۔ صفائی ستھرائی کے علاوہ ہم سارے اوزار سٹرلائز کرتے ہیں۔

نعیم بخاری کے شو میں مسرت مصباح نے والد سے کہا ایسا کام پہلے ہوتے نہیں دیکھا

ایک لیزر اوون میں وہ محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

ہمارے والد صاحب کی سبھی لوگ تعریف کرتے ہیں۔ اس کی ۲؍وجوہ جو مجھے سمجھ آتی ہیں ایک تو ان کا ایمان کہ محنت کرو، رزق دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ وہ کہتے تھے ساتھ والی دکان پر مت دیکھو کہ کون آیا کون گیا۔ یہ کم عقلی ہوگی۔ تیرا نصیب تیرے ساتھ اس کا نصیب اس کے ساتھ۔ دوسری وجہ یہ کہ وہ بات کہتے نہیں اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ کبھی کوئی کسٹمر چلا گیا تو مڑ کر پوچھا نہیں، واپس آ گیا تو شکوہ کا لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ وہ کہتے تھے حسد نہیں کرنا، غریبوں کو حسد ہی کھا جاتا ہے۔ نہ ترقی کرنے دیتا ہے نہ ترقی کرانے۔ وہ برادری کے کمزور لوگوں کو سپورٹ کر کے دکان کھڑی کرا دیتے تھے۔ مجھے اب کام کرتے ۳۷؍سال ہو گئے ہیں۔ میرے نام کے ساتھ والد صاحب کا نام جُڑا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے یہ عزت دی ہے کہ لوگ ایک باربر کو، شیو بنانے والے محنتی آدمی کو عزت سے سیٹھ امتیاز کہتے ہیں۔ ہماری بنیاد وہی سیٹھ امتیاز احمد ہے جس نے کبھی ہمارے دلوں میں تکبر نہیں آنے دیا۔ کام سکھایا، علم سکھایا، آپس میں جڑ کر رہنا سکھایا۔ میرا دوسرا بھائی خورشید احمد ہے۔ آئی کام کے بعد اسے مزید پڑھایا بی اے کرایا۔ کمپیوٹر کورس کرایا۔ وہ ریواز گارڈن والی برانچ دیکھتا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں والد صاحب کی خواہش پوری کرنے کا موقع ملا۔ ریواز گارڈن جہاں اب ہمارا ہیڈ آفس اور رائل ہیرڈریسر اینڈ بیوٹی پارلر ہے اور اسے خورشید بڑی سمجھداری کے ساتھ چلا رہا ہے۔ یہ جگہ بک رہی تھی۔ پتا چلا ۳؍کروڑ کی ہے۔ ایک کروڑ ۳۰؍لاکھ ہمارے پاس تھا۔ وہ دے دیا۔ پھر اللہ سے دعا کی یا اللہ! تو ہی کوئی سبب بنا دے۔ اُس نے سبب بنا دیا۔ دبئی میں ایک کسٹمر نے پریشان دیکھ کر پوچھا تو میں نے وجہ بتائی۔ اس نے لاہور الفلاح بینک کے مینیجر کو فون کیا۔ مینیجر نے اگلے روز ملنے کو کہا۔ میں رات ہی دبئی سے لاہور پہنچ گیا۔ ایک کروڑ ۷۰؍لاکھ چاہیے تھا۔ بینک مینیجر صاحب نے سوچا ہوگا کہ ایک ہیرڈریسر کو اتنا قرضہ کیسے

میرے بیٹے اے لیول کر رہے اور کام سیکھ رہے ہیں بھائیوں کے بچے بھی تیار ہو رہے ہیں۔ ۳؍سیٹوں کے کام نے اب ۱۰۰؍سیٹوں کی شکل لے لی ہے

L'ORÉAL
PARIS

L'Oreal کو دنیا کی سب سے بڑی کاسمیٹکس اور بیوٹی کمپنی کہا جاتا ہے۔ اس کا فرانس میں ہیڈ آفس ہے۔ اس کمپنی کے انڈیا کے ۷۰؍شہروں میں ۴؍ہزار ہیر سیلون ہیں۔ ہمارے ہاں ملکی سطح کی کوئی بیوٹی بزنس کی چین نہیں ہے۔ انفرادی طور پر شہروں کی سطح پر بیوٹی پارلرز کی برانچز ہیں۔ فیشن شوز اور میڈیا کے باعث میک اپ اور میک اوور نے باقاعدہ ایک مہنگے شعبے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہیر سٹائلسٹ مسرت مصباح کے Depilex بیوٹی پارلرز نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ خواتین و حضرات کے لیے الگ الگ برانچز اب فرنچائز بھی دی جا رہی ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیں۔ انھوں نے اپنی ٹیم کو سروے کے لیے بھیجا۔ واپس آ کر ٹیم نے کہا گڈول اچھی ہے۔ قرضہ دیا جاسکتا ہے۔

قرضہ منظور ہوگیا مگر پلازا پر کسی نے کیس کر دیا۔ ہم نے قرضہ اٹھانے کے بجائے کام پر دھیان دیا۔ اگلے ۱۰ر مہینے کیس بھی چلتا رہا اور ہماری دن رات محنت سے کمائی کرنے والا میٹر بھی رواں دواں رہا۔ اتنی محنت اس لیے کر رہے تھے کہ گناہ گار آدمی ہیں۔ سود لے کر استعمال کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ سود حرام ہے تو بس حرام ہے۔ تینوں بھائی دعا بھی کرتے جاتے تھے اور محنت بھی۔ اللہ نے کرم کیا۔ ۱۰ر ماہ ختم ہوئے اور ہم نے ایک کروڑ ۷۰ر لاکھ کما کر بغیر قرضے کے پلازا خرید لیا۔ پھر یہاں اپنی مرضی کا دفتر

کوئی کسٹمر چلا گیا تو مڑ کر پوچھا نہیں، واپس آ گیا تو منہ سے شکوہ کا لفظ نہیں نکالا۔ وہ کہتے کہ حسد نہیں کرنا، غریبوں کو حسد ہی کھا جاتا ہے۔ ترقی کرنے دیتا ہے نہ ترقی کرانے

اور سیلون بنایا۔ جو کام ۱۰۰ر سال پہلے لاہور میں دادا نے شروع کیا تھا اب چوتھی نسل میں آنے والا ہے۔ میرے بیٹے اے لیول کر رہے اور ساتھ ساتھ کام بھی سیکھ رہے ہیں۔ بھائیوں کے بچے بھی تیار ہو رہے ہیں۔ ۳ر سیٹوں کے کام نے اب ۱۰۰ر سیٹوں کی شکل لے لی ہے۔ چھوٹے بھائی فیاض نے بی کام کیا۔ اس سے والد صاحب نے کہا جہاں پڑھنا چاہتے ہو پڑھو۔ اس نے LUMS ٹیسٹ پاس کر لیا تھا ایم بی اے کے لیے، مگر پھر کام میں آ گیا۔ اب جوہر ٹاؤن کی شاپ وہی چلاتا اور بہت اچھا کام کرتا ہے۔ اب اسی کے فیوچر پلان ہیں کہ کاسمو پولیشن کے نام سے بیوٹیشن، میک اپ اور ڈریسنگ کا کام اکٹھا کرنا ہے

لیعنی ون ونڈو سہولتیں میسر ہوں گی۔

ہمارے کام میں زیادہ پیسا اور عزت ۲۰۰۸ء سے آنی شروع ہوئی۔ ہم سب نے اپنے کسٹمرز کا زیادہ خیال رکھنا شروع کیا۔ جس کو اب لوگ پی آر کہتے ہیں۔ تبھی لوگوں نے ہمیں صاحب حیثیت سمجھنا شروع کیا۔ اب کسی پارٹی میں جائیں لوگ اپنے دوستوں سے فخر سے ملواتے ہیں، انھیں ہمارے بارے میں بتاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ سال میں ایک برانچ تو ضرور کھلنی چاہیے۔ نعیم بخاری کے شو میں ایک بار والد صاحب گئے تو مسرت مصباح بھی وہاں تھیں۔ والد صاحب تصاویر لے کر گئے تھے کہ کس چہرے کو کون سا انداز اچھا لگتا ہے۔ مسرت مصباح نے کہا، میں اتنے برسوں سے اس پروفیشن میں ہوں مگر اس طرح کام کرتے کسی کو نہیں دیکھا۔

پیسا آنے کے بعد بھی ہم میں سے کسی نے اپنے خاندانی کام کو چھوڑنے کا نہیں سوچا۔ اس کو اور بہتر کرنے کا سوچتے اور اکٹھے رہتے ہیں۔ ہم اپنی ماں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہی کی دعاؤں کے صدقے مل جل کر رہتے ہیں۔ ہم نے اپنی دکان کا افتتاح اپنی والدہ سے کرایا کسی وزیر سے نہیں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے سبھی کو محنت کرتے پایا ہے۔ اسی لیے گھر میں آسانی اور خوشحالی دیکھی ہے۔ ہمارے پارلرز پر ریسپشن ایک ہی ہوتی ہے تاکہ میاں بیوی کو کسی اور جگہ چھوڑنے نہ جائے۔ وہ اپنے سیکشن میں چلی جاتی ہیں اور میاں اپنے سیکشن میں۔

اب ہم رائل گروپ کہلاتے ہیں۔ ۲۰۰۸ء میں ہم نے Most Wanted Hair Styles کے نام سے رسالہ بھی نکالا۔ شعیب بٹ ایڈیٹر تھے۔ خورشید بھائی ایگزیکٹو ایڈیٹر اور فیاض بھائی سب ایڈیٹر۔ رسالے میں سارے لوکل ماڈل تھے۔ شائل ہمارے اپنے بھی تھے اور مشہور بھی۔ یہ ۳ر ماہ بعد چھپتا ہے۔ آرٹ کارڈ پر اخبار جہاں/فیملی سائز میں۔ پہلے "کیونے" نے سپانسر کیا پھر "نوکیا" نے۔ یہ رسالہ ہم فری دیتے ہیں، پیسے نہیں کماتے۔ پروفیشن کی خدمت کرتے ہیں۔ بڑا بول نہیں بولنا چاہیے۔ خدمت میں عزت بھی ہے اور سہولت

میں نے اخلاص ایک حجام سے سیکھا

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اخلاص ایک حجام سے سیکھا۔ جب میں مکہ معظمہ میں تھا، ایک حجام ایک خواجہ سرا کی حجامت بنا رہا تھا۔ میں نے کہا "کیا میرے بال بھی اللہ کے لیے کاٹ دو گے؟" اس نے کہا "ہاں"۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ابھی تک اس خواجہ سرا کی حجامت پوری نہ بنی تھی کہ حجام نے کہا "آپ اب اٹھ جائیے کیونکہ جب اللہ کا نام درمیان میں آ گیا، میں نے سب کچھ پا لیا۔" پھر مجھ کو بٹھایا۔ میرے سر کو بوسہ دیا، میرے بال مونڈ دیے۔ اس کے بعد مجھے ایک کاغذ دیا، اس میں ریزگاری تھی۔ مجھے کہا "اے اپنی ضرورت پر خرچ کرنا۔" میں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو نیت کی کہ اوّل جو کشائش مجھے نصیب ہوگی، میں اس کے ساتھ مروت کروں گا۔ ابھی کچھ دن گزرے تھے کہ لوگوں نے مجھے بصرہ سے ایک اشرفیوں کی تھیلی بھیج دی۔ میں اشرفیاں لے کر اسی حجام کے پاس گیا۔ جب میں نے وہ تھیلی اس کو دی، تو اس نے کہا "یہ کیا ہے؟" میں نے کہا "میری نیت یہ تھی کہ جو کشائش اوّل ہوگی، وہ میں تمھیں دوں گا۔" اس نے کہا "مجھے اللہ سے شرم نہیں آتی؟ تُو نے مجھے کیا تھا کہ اللہ کے لیے میری حجامت بنا دے، اور اب یہ کیا لے کر آیا ہے؟ کیا یہ اس کا عوض ہے؟ بھلا تُو نے نہیں یہ دیکھا ہے کہ کوئی شخص اللہ کے لیے کام کرے اور اس کا عوضانہ طلب کرے؟"

والد صاحب کہتے تھے

ساتھ والی دکان کے گاہک مت دیکھو، تمھارا نصیب تمھارے ساتھ، اُس کا اُس کے ساتھ

بھی۔ کسی کو یقین نہیں تو ہمیں دیکھ لے۔ زندہ مثال ہیں۔ ہم ۱۰۰ر سال بعد بھی اپنی برادری، اپنے پیشے سے پوری عزت، پورے وقار کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ہم سارے بھائی اکٹھے بھی ہیں۔ الگ الگ برانچوں کو سنبھالتے بھی ہیں۔ پڑھ لکھ بھی گئے مگر نہ اپنا ہنر چھوڑا نہ فن۔ آج بھی جو کسٹمر ہمارے ہاتھوں اور کام کے قدردان ہیں ان کا کام ہم خود کرتے ہیں۔ ان کے بال خود تراشتے ہیں۔ علم نے، ہنر نے نہ صرف ہمیں زیادہ اچھا کاریگر بنا دیا بلکہ اپنے پیشے کو باعزت بنانے کے ساتھ ساتھ اور ان لوگوں کے لیے کامیابی کی ایک مثال بنا دیا۔ جو چار جماعتیں پڑھ جائیں تو سب سے پہلے اپنا خاندانی کام چھوڑ کر بھاگتے ہیں پھر چار پیسوں کے لیے دوسروں کی

کرناٹیکا (Karnataka) بھارت کے چیف منسٹر بی ایس یدیورپا (Yeddyurappa) نے کرناٹیکا میں لفظ حجام کے استعمال پر پابندی لگانے کا وعدہ کیا تاکہ اس شعبے کی معاشرے میں عزت بڑھائی جا سکے اور اس لفظ کے ساتھ موجود تصور کو ختم کیا جا سکے۔ ہمارے ہاں حجام کے بعد باربر کی اصطلاح بڑا عرصہ استعمال ہوئی۔ اس کے بعد ہیئر ڈریسر اور اب ہیئر سٹائلسٹ اور ہیئر کنسلٹنٹ کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ جیسی دکان ویسا پکوان۔ ممکن ہے کچھ برس بعد کچھ اور نئی اصطلاحات سامنے آ جائیں۔

نوکری کرتے ہیں۔ میرے بچے دنیا کی بہترین اور مہنگی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، مگر تعلیمی ادارے سے آ کر اپنا کام سیکھتے ہیں۔ چوتھی نسل پورے اعتماد سے کام سنبھالنے والی ہے۔ ہم اپنے خدا کی مہربانیوں کا کیا شمار کریں جس نے ہمیں علم دیا، تمیز سکھائی، کام سکھایا۔ خدمت کے کام پر لگایا اور اس میں ساری عزت اور رزق کی فراوانی رکھ دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہد کا معجزہ

آیئے اللہ کی تخلیق کردہ اس ناقابلِ یقین
غذا کی تفصیلات دیکھتے ہیں

ہارون یحییٰ

خون میں جلد شامل ہو جانا

شہد نیم گرم پانی میں لیا جائے تو صرف ۷/منٹ میں دورانِ خون میں داخل ہو جاتا ہے اور ۲۰/منٹ میں جب ٹھنڈے پانی کے ساتھ پیا جائے۔ اس میں پائے جانے والے شکر کے آزاد سالمے دماغ کی کارکردگی کو آسان بناتے ہیں۔

خون پیدا کرنے میں مدد دینا

شہد نیا خون بنانے میں توانائی کے ذخیرے کا کردار ادا کرتا ہے اور خون کی کمی کے مریضوں میں اس عمل کو تیز کرنے میں معاون ہے۔ یہ خون کی صفائی اور اس کے مقوی ہونے میں بھی مدد دیتا ہے۔ اس سے خون کی گردش باقاعدہ ہوتی ہے۔ یہ خون کی چھوٹی نالیوں کے عوارض میں بھی مفید ہے۔

معدے کا دوست

شہد تیزابیت یا تخمیر کا باعث نہیں بنتا کیونکہ یہ جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر موجود آزاد ذرات چکنائی کو ہضم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ ماں اور گائے کے دودھ میں آئرن کے نہ ہونے کو بھی پورا کر دیتا ہے۔ آنتوں کے عمل کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ یہ اندرونی سکون کا بھی باعث ہے اور بھوک میں اضافہ کرتا ہے۔

رائل جیلی

رائل جیلی چھتے کے اندر کارکن مکھیوں کا بنایا ہوا سفید سیال مادہ ہے۔ اس قوت بخش مادے میں شکر، لحمیات، چکنائی اور بہت سے حیاتین پائے جاتے ہیں۔ یہ جسم کی کمزوری اور بڑھاپے کے جسمانی اثرات جیسے مسائل میں استعمال ہوتا ہے۔

جراثیم کش خصوصیات

شہد کی یہ خصوصیت مزاحمتی اثر (Inhibition Effect) کہلاتی ہے۔ شہد پر کیے گئے تجربات نے ثابت کیا ہے کہ جراثیم کش اثرات، شہد کو پانی میں ملا کر پتلا کر کے پینے سے دوگنے ہو جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شہد کی وہ مکھیاں جو نوزائیدہ مکھیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، وہ بھی ان کو پتلا شہد ہی پلاتی ہیں۔ ■

مُشکل فیصلہ

ان کے لیے خاص
جن کے پاس
دلیلیں بہت ہوتی ہیں

کلینک پر آنے والی متذبذب مریضہ کا ماجرا
وہ ایک مشکل صورتِ حال میں گھر گئی تھی

ڈاکٹر زاہدہ پروین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس

دن میرے کلینک میں آنے والی آخری مریضہ بیس، اکیس سال کی ایک لڑکی تھی جو ایک اوھیڑ عمر، باوقار خاتون کے ساتھ آئی تھی۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ انھیں بیٹھنے کا کہا اور پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہوئی:

''جی فرمایئے؟'' وہ تذبذب کے عالم میں بیٹھی رہی جیسے سمجھ نہ پارہی ہو کہ بات کیسے شروع کرے۔

''آپ کچھ بتایئے؟'' میں نے خاتون سے استفسار کیا۔

''یہ میری بیٹی ہے۔'' انھوں نے کہنا شروع کیا۔ ''۲/ ماہ پہلے اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اب کچھ دن سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، نورین بتاؤ نا ڈاکٹر صاحبہ کو۔'' جملے کا آخری حصہ انھوں نے بیٹی سے کہا۔

''مجھے بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے، چکر آتے ہیں، دل متلاتا اور، الٹیاں آتی ہیں۔'' میں فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔ وہ دوبارہ امید سے تھی۔

''آپ نے حمل ٹیسٹ کرایا ہے؟'' میں نے براہِ راست نورین سے پوچھا۔

''جی'' وہ نظریں جھکا گئی۔ ''پازیٹو (مثبت) آیا ہے۔''

''اسی لیے تو آپ کے پاس آئے ہیں۔'' اس کی والدہ نے وضاحت کی۔ ''دیکھیں نا ابھی تو بچہ بہت چھوٹا ہے۔''

میرے اندر ناگواری کی لہر اُبھری، قلم پر گرفت سخت ہوئی، آخر لوگ ڈاکٹر سے ایسی امید کیوں وابستہ کر لیتے ہیں، کیا ہم نے آخرت میں جوابدہ نہیں ہونا۔ عام طور پر ایسے مریضوں کو میں صاف انکار کر کے جانے کا کہہ دیتی ہوں مگر اس دن جی میں آئی کہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں شاید وہ ارادہ تبدیل کرلیں۔ چند لمحات لگے اپنے آپ کو سنبھالنے میں پھر نورین سے پوچھا۔

''اب آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''ابارشن (اسقاط) کرانا چاہتی ہوں۔''

''آپ بھی جانتی ہیں کہ یہ گناہ کا کام ہے، اگر میں اس میں مدد کروں گی تو اللہ کے ہاں میرا بھی مواخذہ ہوگا۔ اللہ نے مجھے ڈاکٹر اس لیے تو نہیں بنایا کہ میں حد سے تجاوز کروں۔''

''مگر میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''یہ حمل کس کے حکم سے ہوا ہے؟'' میں نے رسان سے پوچھا۔

''ظاہر ہے اللہ کے حکم سے۔''

''تو کیا اللہ کو علم نہیں تھا کہ آپ کا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے؟''

''مگر مجھے ابھی اس بچے کی ضرورت نہیں ہے، میرے شوہر بھی نہیں چاہتے۔''

''فرض کریں کہ آج وزیراعلیٰ آپ کے گھر آئیں اور تحفہ میں ایک دیوار گیر گھڑی پیش کریں تو کیا آپ یہ کہہ کر ان کو انکار کر سکتی ہیں کہ ابھی مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، آپ واپس لے جائیں۔ کیا انھیں بُرا نہیں لگے گا، ہو سکتا ہے اس کے انکار کے بعد آپ ان کے عتاب کا نشانہ بنیں تو اللہ کے معاملہ میں آپ اتنی بے خوف کیوں ہیں؟''

''مگر لوگ کیا کہیں گے؟'' میری دیورانی باتیں بنائے گی۔''

''جب روزِ قیامت آپ سے پوچھا جائے گا تو کیا یہ لوگ آگے بڑھ کر آپ کی وکالت کریں گے کہ ہماری وجہ سے اس نے یہ گناہ کیا......؟ نہیں نا! اس وقت تو سب کو اپنی فکر ہوگی، لوگوں کے لیے اپنی آخرت خراب نہ کریں۔''

''لیکن میں بہت کمزوری محسوس کرتی ہوں۔ میری صحت مزید خراب ہو جائے گی۔''

''اچھی خوراک، ذہنی سکون اور قوت بخش ادویات سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔''

''کیا بچے کا حق نہیں ہے کہ اسے ماں کا دودھ ملے؟ حمل کی صورت میں تو بچے کا دودھ چھڑانا پڑے گا۔''

''اللہ تعالیٰ آپ سے زیادہ آپ کے بچے کے خیر خواہ ہیں، اس بات کو ذہن میں بٹھالیں۔ بہت سے بچے اوپر کے دودھ پر پل جاتے ہیں۔'' میرے پاس ہر اعتراض کا جواب تھا۔

کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر وہ دھیرے سے بولی ''لیکن یہ بہت مشکل ہے؟''

''بالکل مشکل ہے مگر ناممکن تو نہیں، آپ یوں سمجھیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمایش ہے۔''

''ہم آزمایشوں کے قابل کہاں۔'' اس کی والدہ گویا ہوئیں۔

''آزمایش تو نیک لوگوں پر آتی ہے۔''

''کیا خبر اس آزمایش میں پورا اُترنے پر آپ کے درجات کتنے بلند ہوجائیں، ہوسکتا ہے یہ حمل خود بخود ضائع ہوجائے مگر اس وقت تو اللہ جی یہ دیکھ رہے ہیں کہ میری یہ بندی کرتی کیا ہے، میری خوشی کے لیے اس تکلیف کو برداشت کر لیتی ہے یا دوسرے راستے پر چلتے ہوئے صرف اپنے نفس کی خوشی کو مقدم رکھتی ہے۔''

نورین خاموش رہی، وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ میں نے سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑا۔ ''حضرت مریمؑ پر تو اس سے کئی گنا بڑی آزمایش آئی تھی۔ وہ کنواری تھیں اور امید سے ہو گئیں تو انھوں نے کیا کیا؟ کیا رب کی رضا میں راضی نہ رہیں۔ ان کی قوم نے ان پر باتیں نہ بنائیں؟ الزامات نہ لگے؟ آپ اس امتحان سے گزرنے کا ارادہ تو بنائیں اللہ آسانیاں پیدا کرے گا، کیا خبر یہ بچہ اتنا نیک اور سعادت مند ہو کہ آپ اس پر فخر کریں۔''

نورین کے چہرے پر آمادگی کے آثار دیکھ کر مجھے حوصلہ ہوا۔

''سمجھ لیں کہ جڑواں بچے تھے ایک ذرا لیٹ ہوگیا ہے۔'' دونوں کے چہرے پر مسکراہٹ تیر گئی، ماحول میں [illegible] ہوا۔ ''دونوں اکٹھے پل جائیں گے، اس کی پیدایش [illegible] ہفتے کے اندر اندر آئے گا، پھر منصوبہ بندی پر بات کریں گے تاکہ دوبارہ یہ مسئلہ نہ ہو۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے نسخہ لکھ کر نورین کی طرف بڑھایا۔ اس پر روزانہ کی صرف ایک گولی فولک ایسڈ لکھی تھی اور ساتھ الٹی کی دوا۔

''کیا اس سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

نورین نے نسخہ لیتے ہوئے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

مجھے اپنی ساری محنت اکارت جاتی محسوس ہوئی۔ میری مسکراہٹ سمٹ گئی اور بے تاثر لہجہ میں جواب دیا۔ ''نہیں یہ آپ کے بچے کے لیے فائدہ مند ہے۔'' اور اپنی دراز کھول کر چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی گویا یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب آپ جائیں۔

دروازہ پر پہنچ کر نورین کی والدہ واپس مڑیں۔ ''آپ کسی اور ڈاکٹر کا بتادیں جو اس سلسلہ میں ہماری مدد کر سکے۔''

''اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے کہ گناہ کے کاموں میں تعاون نہ کرو، اس لیے میری طرف سے معذرت۔'' میں رکھائی سے بولی تو وہ کچھ کہے بغیر رخصت ہوگئیں۔ میں نے دل سے دعا مانگی کہ اللہ ان کو سیدھے راستے پر چلا، ان کی مدد فرما۔

اس واقعہ کو کافی دن گزر گئے۔ اس دن میرا اپنی سہیلی کے ساتھ بازار جانے کا ارادہ تھا۔ اپنے گھر میں ہی اس نے ایک حصہ میں کلینک شروع کر رکھا تھا۔ میں وہاں گئی تو اس نے مجھے ایک رسالہ پکڑاتے ہوئے معذرت کی کہ بس ۲/ مریض ہیں ان سے فارغ ہولوں تو چلتے ہیں۔

میں ''کوئی بات نہیں'' کہتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی اور رسالہ کھول لیا۔ معاً میرے کانوں میں ایک مانوس آواز آئی ''میرا بیٹا صرف ۳/ ماہ کا ہے اور میں دوبارہ اُمید سے ہوں، اس کا دودھ چھڑانا ہے، آپ کوئی اچھا سا ڈبا لکھ دیں۔''

میں نے چونک کر سر اٹھایا، سامنے میری سہیلی کے پاس نورین بیٹھی تھی، اسی وقت اس نے بھی میری طرف دیکھا۔ نظر ملتے ہی ہم دونوں طمانیت سے مسکرا دیں، آخر اُس نے ایک مشکل فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ ■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابھی

رات اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ مگر بہتے والی نہر کے کچے پر تاریکی یوں بچھی بیٹھی تھی جیسے گاڑھے کے ریشم کی سیاہ بانات ہو۔ فضا میں معمولی سا حبس جسے وقفے وقفے سے چلنے والی ہوا کے اتفاقی جھونکے اچانک چھیڑتے تو کنارے پر ایک ہی سیدھ میں لگے سفیدوں کے پتے تالیاں بجانے لگتے۔ کہیں کہیں کائی کھائے سبزے میں اکا دکا جھینگر بول پڑتا اور پُل سے پرے ''بڈھے پیر'' کے مزار کے احاطے میں پرانے برگد کی رسیاں لٹکاتی شاخوں پر بوڑھے الو کی آنکھیں گول گول گھومنے لگتیں۔

ایسے میں جب وہ دونوں پل کے پار نشیب میں اترے، تو کلونس کھائے ماحول کا ایک حصہ ہی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں نے اپنے چہروں پر گس کے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ چودھری شیر کے داہنے ہاتھ میں لوہے کی ''کھرپی'' اور لمبا سا خنجر تھا۔ جبکہ ''ماکھے'' نے جدید طرز کا ریوالور تھام رکھا تھا۔ اس کا جسم کسرتی تھا اور چال میں چودھری کی نسبت پھرتی اور فطری سا بہاؤ تھا۔ اس نے دانستہ خود کو اس سے دو قدم پیچھے رکھا ہوا تھا۔ نشیبی حصہ کھیتوں کے دائرے میں اُترا، تو چودھری نے رُک کر دائیں بائیں دیکھا۔ پھر دور ''رانجھوں'' کے ڈیرے پر ٹمٹماتی لرزتی مدقوق روشنی پر نظریں گاڑ کر بولا۔

''لے ماکھے! یہاں تک تو پہنچ آئے ہیں۔ اب آگے بھی اللہ کا آسرا ہے۔''

کالے ڈھاٹے کے اندر ماکھے کے کالک زدہ ہونٹ آپس میں ملے۔ مگر ان کی ہلکی بڑبڑاہٹ ڈھاٹے کی تہہ بہ تہہ سلوٹوں میں گم ہو کر رہ گئی۔

چودھری نے اپنے منہ سے کپڑا ہٹایا اور چہرہ اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان پر تھوڑی دیر پہلے تک چھائی بدلیوں کی چادر رفتہ رفتہ ہٹ رہی تھی اور ان کے درمیان سے آدھا ادھورا چاند کا مکھڑا نمودار ہو رہا تھا۔

چودھری کی دیکھا دیکھی ماکھے نے بھی چہرہ کھول دیا اور جس زدہ ماحول میں کھل کے سانس لینے لگا۔

چودھری کی نگاہ چاند سے ہٹ کر ماکھے کے چہرے پر پڑی اور اس کی ہنسی نکل گئی۔

''ماکھے!'' وہ پیٹ پکڑے ہنسی روکنے کی کوشش میں نیچے بیٹھ گیا۔

''چاند بھی تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اوئے! تو تو کالی رات ہے۔ ابے کوئلے کے دلال اس وقت تجھے سلطان خان دیکھ لے تو بھوت جان کر یہیں چت ہو جائے۔''

ماکھا چُپ کھڑا رہا۔ اس کا چہرہ کسی پتھر کی طرح جامد اور سپاٹ تھا۔ چودھری کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ماکھے کو اس کے زیرِ سایہ آئے ۱۵ سال تو ہونے کو تھے۔ اس عرصے میں چودھری نے تو کیا، کسی نے بھی اس کے چہرے پر کبھی جذبات کا مدّ و جزر نہ دیکھا تھا۔ وہ بحرِ منجمد کے اُن افتادہ ساحلوں کا سا تھا جن پر برف اپنے اثرات ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاتی ہے اور ان کی کٹی پھٹی شورہ زمین پر جلی بھسی کائی بھی نہیں اُگتی۔

حتیٰ کہ آس پاس بھنکتی سرگوشیاں بھی اس پر اثر انداز نہ ہوتیں۔

لوگ کہتے تھے ''ماکھا بے حس ہے اور بے حس پر کسی بات کا کیا اثر۔''

کوئی کہتا ''چودھری نے لونڈا گس کے رکھا ہوا ہے۔ مجال ہے پتھے پر ہاتھ دھرنے دے۔''

گاؤں کی سب سے بوڑھی اور تجربہ کار ''مائی بھاگی'' نے تو یہ تک کہہ دیا ''ماکھے پر کسی ہوائی چیز کا اثر ہے جس نے بالک عمر میں اسے پتھر کا کر دیا تھا۔ نیا نیا شہر کے سکول میں جا کر پڑھنے والے سلیم احمد نے اسے ''روبوٹ'' قرار دیا اور پھر سب کو مثالیں دے دے کر جتنوں سے سمجھایا کہ امریکا کے لوگوں نے کس طرح بجلی کے بندے بنائے ہیں جو بٹن دباتے ہی اُن کی ہدایت کے مطابق حرکت کرتے ہیں تو سب دل ہی دل میں مان گئے کہ ماکھا بھی کوئی ایسی ہی چیز ہے۔ جس کا بٹن ہمیشہ چودھری شیر کے ہاتھ میں رہتا ہے اور مضبوط بدن اُس کی ہدایت پر حرکت کرتا ہے۔

اس وقت بھی چودھری اس کی بے تحاشا سیاہ اور کلونسی رنگت پر چوٹ کرتے ہوئے ہنس رہا تھا اور ماکھا یوں کھڑا تھا جیسے گندم کے کھیتوں میں الٹی سیدھی لکڑیوں سے بنایا پتلا جو چڑیوں کو فصل سے دور رکھنے کو گاڑا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تک اکیلا ہی ہنستے رہنے کے بعد چودھری ''ریتی'' کا سہارا لیتے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بھوسلی بھنوؤں کو سکیڑ کر ماتھے کے اوپر ہتھیلی کا چھجا سا بنا کر رانجھوں کے ڈیرے کی طرف بغور دیکھنے لگا۔

''تیرا کیا خیال ہے ماکھے، سلطان خان آج ڈیرے پر اکیلا ہوگا؟''

''اطلاع تو ایسی ہے مالک۔'' ماکھے نے اب کی بار لب کھولے۔

''اسے ہونا بھی اکیلا ہی چاہیے۔ چودھری نے گردن کو آگے پیچھے ہلاتے ہوئے کہا۔ کوئی ایک آدھ بندہ شادی پر جانے سے رہ بھی گیا ہو تو کوئی بات نہیں۔ چودھری شیر کے بازوؤں میں ابھی بہت طاقت ہے اور میری سب سے بڑی طاقت تو تُو ہے ماکھے تُو۔''

چودھری نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ اُسے لگا اس کا ہاتھ لکڑی کے بے ڈھب تختے سے ٹکرا کر رہ گیا ہو۔

تھوڑی دور چل کر چودھری دوبارہ رُک گیا۔

''ہتھیار تیار ہے ناں ماکھے؟''

ماکھے کا سر اثبات میں ہلا۔ ''جی مالک۔''

''چل پھر تو بھی تیار رہنا۔ میرے پیروں میں ابھی سے گدگدی ہونے لگ گئی ہے۔ سلطان خان کی اصیل گھوڑی کی رکابیں کتنی چکنی اور ڈھلواں ہیں۔ واہ بھئی مزہ ہی آجائے گا۔''

یہ کہتے ہوئے چودھری نے اپنی رفتار تیز کر لی۔

اور اس کے پیچھے ماکھے نے بھی۔

انھیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔

ڈیرے کے وسیع و عریض کھلے احاطہ میں بیری اور شہتوت کے درختوں کے جھنڈ کے قریب جنتائی سائز کے پایوں والی سلطان خان کی مخصوص چارپائی بچھی ہوئی تھی

جراثیم سے محفوظ

کیا آپ جانتے ہیں ماں کے پیٹ کے اندر بچہ بیکٹیریا جیسے جراثیم سے بالکل محفوظ ہوتا ہے۔ جیسے ہی وہ دنیا میں آتا ہے اسے کئی ملین جراثیم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جس پر وہ چادر تانے دنیا و مافیہا سے بے نیاز سو رہا تھا۔ قریب ہی چند فرلانگ کے فاصلہ پر جانور بندھے ہوئے تھے، جن میں بڑے سینگوں والی بھوری بھینسوں، اعلیٰ نسل کی ساہیوالی گایوں اور دیگر چھوٹے موٹے ڈنگروں سے داہنی جانب ذرا سا پرے ہٹ کر سلطان خان کی وہ اصیل گھوڑی بندھی تھی جس کی خاطر وہ دونوں آج یہاں نظر آ رہے تھے۔ فضا میں گوبر کی باس رچی ہوئی تھی اور چاندنی اِکا دُکا کرنیں شہتوت کی گھنیری شاخوں سے چھن چھن کر سیدھی گھوڑی کی چکنی سفید کھال پر پڑ رہی تھیں۔

چودھری نے توصیفی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور دبے قدموں آگے بڑھتے ہوئے ماکھے کو اشارہ کیا۔ ماکھے نے چودھری کے ہاتھوں سے ریتی پکڑی اور اُسے ہاتھ میں تولتے ہوئے درزیدہ نظروں سے سلطان خان کی چارپائی کی جانب دیکھ کر بولا:

''مالک! گھوڑی بول پڑی تو؟''

''تو میں اس کا علاج کر لوں گا۔'' چودھری نے کندھے پر پڑی زائد چادر اتاری اور گھوڑی کے منہ کے قریب جا کر کھڑا ہو کے اُسے پچکارنے لگا۔ گھوڑی نے اجنبیوں کو اپنے قریب دیکھ کر دائیں بائیں سر ہلانا شروع کر دیا۔

ماکھا گھوڑی کے پیر میں بندھے فولادی تالے پر ریتی آزمانے لگا۔

گھوڑی اب حرکت میں آگئی تھی اور وہ ''کلّے'' کے گرد دائرے میں یوں مسلسل چکر لگا رہی تھی گویا طواف کر رہی ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنگلوں کی ہلکی کھڑکھڑاہٹ نے سلطان خان کی نیند میں معمولی خلل ڈالا۔ اس نے کسمسا کر کروٹ لی اور اُن کی جانب منہ موڑ لیا۔ چاند کی روشنی اب براہِ راست اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

ماکھے کے ہاتھوں میں بلا کی تیزی تھی۔ گھوڑیوں کے تالے کھولنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور پھر یہ پہلا موقع تھا بھی نہیں۔ اس طرح کی کئی وارداتیں وہ چودھری کی ہمراہی میں اس سے پہلے کر چکا تھا۔ لہٰذا اب بغیر گھبرائے یا ستائے ہاتھوں کو آگے پیچھے مخصوص لَے میں حرکت دے رہا تھا اور جب تالے کا نوکیلا کیل اتنا سا اندر رہ گیا کہ اگر وہ اسے ہاتھ سے بھی پکڑ کے کھینچتا تو بلاتردد وہ اس کے ہاتھ میں آجاتا۔ گھوڑی پوری آواز سے ہنہنائی اور اس نے اپنی اگلی دونوں ٹانگیں اوپر ہوا میں اُٹھالیں۔ چودھری نے کپڑا اُس کے منہ پر پھینکا اور اسے ہاتھوں سے دبانا چاہا۔

گھوڑی منہ زور اور مالک کی سر چڑھی تھی۔ اس نے چودھری کے ہاتھ سر مار کے دور جھٹک دیے اور پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں ہنہنائی۔

سلطان خان ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ہنہناتی گھوڑی اور اسے قابو میں لانے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ۲،۳ اجنبی۔ اس منظر نے سلطان خان کے بدن میں بجلی بھر دی۔ وہ پارے کی طرح تڑپ کر چارپائی سے اترا اور سینہ تان کر بولا:

"کون ہو تم اوئے؟"

ماکھے نے جھٹ تہبند کی ڈب سے ریوالور نکال لیا اور اس کا شست باندھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"گھوڑی چھوڑ دے چودھری! میں تجھے پہچان گیا ہوں۔"

سلطان خان دیہی دشمنوں کے درمیان پلا بڑھا تھا۔ ریوالور کی نالی اُسے خوفزدہ نہ کر سکی۔

اس کی بات نے چودھری کو گڑبڑا دیا۔

مگر گھاگ چور تھا۔

سلطان خان کے چہرے پر نظریں گاڑ کے بولا۔

"پہچان گیا ہے تو اور بھی اچھا ہے۔ اب تجھے پتا چل جانا چاہیے کہ ہم یاروں کے یار اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ چل ماکھے گھوڑی آگے لگا۔"

"گھوڑی یہیں رہے گی چودھری......" سلطان خان نے زیرِلب گالی بکی۔ "سچ تو یہ ہے تجھے چودھری نہیں چور کہنے کو دل کرتا ہے۔ چار بیگھوں سے چل کر چار مربعوں تک پہنچا ہے مگر دماغ اس زمانے پر رُک گیا ہے جب تو لڑکپن میں لوگوں کی مرغیاں اور بکریاں چرایا کرتا تھا۔"

سلطان خان کی بات چودھری کے سر پر لگی اور تلووں پر بجھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔

اللہ بخشے میری بے بے کہا کرتی تھیں۔ چوری شیرو کے منہ کو لگ گئی ہے۔ جہاں کہیں اچھا جانور دیکھتا ہے رال ٹپک پڑتی ہے۔ شریف ماں باپ کے گھر ایسی اولاد چہ چہ...... اِدھر اُدھر سے لپیٹ کر زمین اکٹھی کر کے لوگوں کے بیچ چودھری صاحب بن کے تو بیٹھ گیا۔ مگر چودھری بننا نہ آیا۔ ابے تیری اصلیت تو میں جانتا ہوں۔

چُپ کر جا سلطانے وگرنہ...... غضب کی شدت سے چودھری کا چہرہ گویا لہو سے لبالب بھرا گول کٹورا تھا جو چھلکنے کو تیار پڑا تھا۔

سلطان خان نے اس کی کیفیت کا مزہ لیا اور غالباً کسی پرانی دشمنی کا بدلہ لیتے ہوئے بولا۔

اگر تجھے یہ گھوڑی اتنی پسند تھی تو مجھ سے کہتے میرا ڈیرہ فقیروں مسکینوں کے لیے چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ ایک تم بھی سہی۔"

"گولی چلا دے ماکھے۔" چودھری کی اب بس ہو گئی تھی۔

سلطان خان نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

اس کے منہ پر اسے چور کہا تھا۔

اگرچہ اس بات کا اعتراف وہ یاروں کی منڈلی میں بیٹھ کر خود کرتا تھا۔ جب وہ یہ کہہ کر آپ اپنا ٹھٹھا اُڑاتا۔

"قسم لے لو اللہ پاک کی جو آج تک کوئی جانور پلّے سے خریدا ہو۔ اللہ بخشے میری اماں نے ایک بار بڑی حسرت سے کہا تھا۔ شیرو! ہر خوشی غمی پر دل کھول کے اُڑاتے ہو۔ اچھے سے اچھا جانور چھری تلے رکھتے تمھارا دل تنگ نہیں پڑتا۔ میرا بڑا دل چاہتا ہے کبھی کوئی جانور خانۂ خدا کے نام پر بھی دوں۔ مسجد میں کبھی تو میرے نام کی پکار پڑے۔

"چودھری شیر کی ماں نے مسجد کے نام بھینس بھیجی ہے یا پھر چھوڑ بکری ہی سہی۔"

میں نے کہا "اماں یہ بھی کوئی بڑی بات ہے کیا؟ تو پہلے کہتی پَر یارو! قسم لے لو اللہ پاک کی۔ جانوروں پر نگاہ ڈالی تو کوئی ایک ڈنگر بھی پاک نہ نکلا۔ اب خانۂ خدا کو ناپاک مال کیسے بھجوا دیتا۔ آخر ہوں تو مسلمان ناں؟"

اور یار لوگ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے۔

مگر دوسروں کو اس نے یہ جرأت نہ بخشی تھی۔ کہ منہ در منہ اسے چور کہتے۔ پھر یہاں تو سلطان خان تھا۔ اس کا پرانا رقیب اور زمینداری میں اس کا ہم پلّہ۔ فرق اتنا تھا کہ وہ چور نہ تھا اور اس نے لوگوں کے بیچ اونچا شملہ لگا کے چودھراہٹ بھگارنے کا شوق بھی نہ پالا تھا۔

ماکھے کے ہتھیار نے شعلہ اُگلا اور گولی سلطان خان کے سینے کے آر پار ہو گئی۔

پھڑ کی آواز سے درختوں کی ڈالیوں میں سوئے پرندے یکبارگی اُڑے اور گولی کی آواز سُن کر ڈیرے کے اندر سوئے دو چار لوگ ننگے پاؤں باہر بھاگے۔ کھیل بگڑ چکا تھا۔

سلطان خان سینہ پکڑے نیچے کو دُہرا ہو رہا تھا اور کھڑے کانوں والی گھوڑی پوری آواز سے ہنہنائے جا رہی تھی۔

ماکھے کی سوالیہ نگاہیں چودھری کی طرف اٹھیں جیسے پوچھ رہی ہوں:

"اب کیا حکم ہے مالک؟"

لیکن جواب دینے سننے سے پہلے درختوں کے جھنڈ کی جانب سے اکٹھی دو گولیاں چلیں اور چودھری کی پگڑی سے ٹکراتی دیوار سے جالگیں۔

ہر زندہ مخلوق بذاتِ خود کائنات ہے

ہر انسانی خلیے کے اندر ۴۰۰ بلین کے قریب مالیکیولز ہوتے ہیں۔ اگر ایٹموں کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد کئی ٹریلین تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر خلیوں میں ہونے والی مجموعی سرگرمی کو ذہن میں لایا جائے تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔ آپ اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک سیپٹلین افعال کسی ایک لمحہ میں۔ یاد رہے کہ اگر ہندسہ "ایک" کے ساتھ ۲۴ صفر لگائے جائیں تو ایک سیپٹلین بنتا ہے۔ ایک ملی سیکنڈ کے اندر ہمارے جسم میں کائنات میں موجود تمام ستاروں سے ۱۰ گنا زیادہ افعال ہو رہے ہوتے ہیں۔ گویا ہر زندہ مخلوق اپنے اندر ایک پوری کائنات رکھتی ہے۔

اس نے ماکھے کو نکلنے کا اشارہ کیا۔

دونوں ہوائی فائر کرتے ہوئے باہر کو بھاگے۔

لینا، پکڑنا، جانے نہ پائے کی آوازوں کے شور میں چند ہیولے اُن کے پیچھے لپکے۔ فضا میں تڑ تڑ آتشیں گولے تیرنے لگے اور وہ آگے پیچھے کھیتوں میں دوڑتے فصلوں کو روندنے لگے۔ ماکھے کی رفتار کی ازلی پھرتی اور جسم کی قدرتی لچک اسے ہوا کے جھونکے پر سوار کیے ہوئے تھی۔ وہ چاہتا تو چیتے کی سی زقند لگاتا اب تک منظر سے غائب ہو جاتا۔ مگر اس نے چودھری کا نمک کھا رکھا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کا بٹن چودھری کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب تک اُسے دبائے گا نہیں اسے اس کا سایہ بنے رہنا ہے۔

وہ نہر کے کچے میں اترے تو بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ پیچھے گولیاں متواتر چل رہی تھیں اور قدموں کی دھمک فضا کے سناٹوں کو بار بار چیرے دیتی تھی۔

"میں اب اور نہیں دوڑ سکتا ماکھے۔ ہائے سلطان کی گھوڑی کی رکابیں۔" چودھری نے اپنے گھٹنے پکڑ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکاری لی۔

"مالک!" ماکھا بولا۔ "رفتار کم کی تو پکڑے جائیں گے اور اگر سلطان خان مر چکا ہوا تو کل کا سورج ہمارے لیے کیا لے کر طلوع ہوگا۔ آپ کو تو اچھی طرح پتا ہے جی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" چودھری نے نہر کے شرر شرر گرتے پانی کے پریشر کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ماکھے!" اس کی آنکھیں اندھیرے میں بلی کے دیدوں کی طرح چمکیں۔

"چلو مائی تاجی کے گھر چلتے ہیں۔ وہ دیکھو۔ چند قدم پر تو ہے۔" ماکھے کے اُٹھتے قدم زمین میں گڑ گئے۔

"مالک!" اس کی آواز میں حیرت ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ "مائی تاجی سلطان خان کی سگی پھوپھی ہے۔ وہ آپ کو کیسے بچائے گی؟"

"اوئے مورکھ!" چودھری بولا "مائی کو بھلا واقع کی کہاں خبر ہے۔ اس وقت اس سے اچھی جگہ کوئی نہیں۔ یہاں کھڑے رہے تو لازماً پکڑے جائیں گے۔ مائی کے گھر پر ان لوگوں کو کبھی شک نہیں ہو سکتا۔ بھلا کبھی کسی نے دشمن کے گھر بھی پناہ لی ہے؟ جب تک مائی کو خبر ہو گی ہم کہیں کے کہیں نکل چکے ہوں گے۔ ویسے بھی مائی بڑی اللہ لوک ہے۔ وہ تو اللہ کے نام پر زندگی بھر کی کمائی لٹا بیٹھی ہے۔ گھڑی دو گھڑی کو مہمان بنانا کیا مشکل ہے۔" چودھری اس مشکل وقت میں بھی ٹھٹھا لگانے سے باز نہ رہا۔

اور یہ بات تو ماکھے نے بھی سن رکھی تھی بلکہ اس بات کا تو گاؤں کے بچے بچے کو علم تھا کہ کس طرح مائی تاجی کا سارا زیور، عمر بھر کی کمائی "سروپا سنار" اٹھا کر لے گیا اور مائی بے وقوف نے کس طرح اُسے اللہ کے نام پر معاف کر دیا۔

سننے میں آیا ہے کہ سلطان خان کی یہ پھوپھی جوانی میں بیوہ ہوئی اور بڑھاپے میں جوان بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بیوگی کے زمانے میں میکے، سسرال سے ملا سارا زیور ایک پوٹلی میں باندھ کر "سروپ چند" کے پاس لے گئی تاکہ وہ اسے پگھلا کر خالص سونا علیحدہ کر کے اس کی ٹکڑیاں بنا دے۔ خیر سے میرا بیٹا جوان ہوگا، تو اس کے پاس ماں باپ کی کمائی ہوگی۔ زمینیں خریدے گا اور خوشحال جوانیاں مانے گا۔

اُدھر سروپے نے کام شروع کیا اُدھر ملک تقسیم ہونے لگا۔ اس اکھاڑ پچھاڑ اور لپاڈگی میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر قافلے آنے جانے لگے۔ اب اللہ جانے سروپے نے موقع دیکھ کر "مال" اُدھر منتقل کر دیا۔ یا واقعتاً لُٹیرے لوٹ کے ہاتھ لگ گئے۔ جب ملٹری کے ٹرک بچے کھچے ہندوؤں اور سکھوں کو اُٹھانے آئے تو کسی نے مائی کو "سروپے" کی روانگی کے متعلق بتایا۔

وہ روتی پیٹتی ٹرک کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

لوگوں نے سروپے کو نیچے اُتار لیا۔ مائی نے روتے دھوتے اپنا سونا مانگا۔ سروپے کا سر جھکا ہوا تھا اور نگاہیں زمین میں تیر کی طرح گڑی ہوئی تھیں۔ گھڑی بھر بعد بولا تو اتنا:

"میرے پاس اپنی جان کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ چاہو تو مجھے روک لو چاہو تو مجھے جانے دو۔" مائی نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ دوسری ٹرک پر ڈالی جہاں سروپے کا بال بچہ اُچک اُچک کر باہر کو لپکتا تھا اور ملٹری کے جوان انھیں پکڑ پکڑ کر اندر دھکیلتے تھے۔

مائی کی آواز گلے میں گھٹ گئی اور آنکھیں پانیوں سے لبالب بھر گئیں۔ تو سروپا بولا:

"تمھیں تمھارے اللہ اور رسول کا واسطہ مائی۔ مجھے معاف کر دے۔ آگے تیری مرضی۔"

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا اور سنانے والے سناتے ہیں۔ مائی نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور کڑک کر بولی:

"جا میں نے تجھے اللہ کے نام پر معاف کیا۔"

اس کے بعد اس نے بیٹے کو کس طرح پالا، کس طرح جوان کیا، پھر کس طرح اس کی جوانی لٹتی دیکھی۔ سب کچھ تو سامنے تھا۔ پھر کیسے چودھری اُس پر اعتبار نہ کرتا اور کیسے ماکھا اس کے قدموں کے نشان نہ روندتا۔

مائی نے دروازہ کھولا اور بولی "بسم اللہ کروں اس وقت کون اللہ کے بندے آ گئے۔"

"مسافر ہیں مائی۔" چودھری کا چہرہ بدستور ڈھکا ہوا تھا اور اس کے پیچھے ماکھا کسی مقتدی کی طرح روپ سروپ میں اس جیسا بنا کھڑا تھا۔

"تھوڑی دیر ستانا ہے۔ اجازت دو تو گھڑی دو گھڑی ٹھہر کر چل پڑیں گے۔"

"اجازت کیسی بیٹا۔ تمھارا اپنا گھر ہے۔ چلو چل کر آرام کرو۔" وہ انھیں اپنے پیچھے پیچھے لیے اندر آئی۔

"اس کمرے میں دو چار پائیاں ہیں۔ کوئی روٹی پانی چاہیے ہو تو بتاؤ۔" مائی کے جسم پر چھایا رعشہ اس کی آواز میں بھی لرز رہا تھا۔

"نہیں اماں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔" دونوں کمرے میں آ کر چار پائیوں پر ڈھیر ہو گئے۔

ماکھے نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔ صاف ستھرے کمرے میں معمولی سامان ساتھ کے کمرے سے نکلتی مدقوق روشنی کے سایوں میں اونگھ رہا تھا۔ دو کمروں کے درمیانی دروازے پر لٹکا پردہ ذرا سا لرزا۔ ماکھے نے سرگوشی نما آواز پر کان دھرنے چاہے۔

"اماں! تم بھی کبھی کبھی عجیب ہو جاتی ہو۔ پتا نہیں کون ہیں۔ اتنی تو فائرنگ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ کہیں کوئی ڈاکہ پڑ گیا ہو تو؟ کہیں یہ ڈاکو ہی نہ ہوں؟"

"جھلی نہ ہو تو۔" ماکھے نے تصوراتی آنکھ سے دیکھا۔ مائی نے پوتی کو پیار سے گھر کا ہوگا۔

"اللہ کے بندے ہیں بے چارے۔ اللہ کے نام پر ٹھہرایا ہے میں نے انھیں۔ ڈاکو ہیں تو ہمیں کیا؟ ہمارا تو رب راکھا ہے۔"

جواب میں لڑکی جو کچھ بھی بڑبڑائی۔ آواز کی کمی اور فاصلے کی دوری کے باعث ماکھا سُن نہ سکا۔ چودھری چار پائی پر لیٹ کر سچ مچ اونگھنے لگا۔ جبکہ ماکھا کان، آنکھیں اور ہاتھ بن کر اُس کا پہرہ دینے لگا۔

رات کے آخری پہر جب فائرنگ مکمل رُک گئی اور شب کے نمناک سناٹے نے معمول کی چادر پہن لی تو چودھری نے نکلنے کی کی۔

"اب کدھر مالک؟" ماکھے نے جوتے پہنتے چودھری کو کچھ سوچتے پایا تو بولا۔

"یہ بھی تجھے بتا دوں گا۔ یہاں سے تو نکل۔" اور دونوں چپکے سے سٹک لیے۔ نہر کے ساتھ ساتھ چلتے دونوں پل کے قریب پہنچے۔ تو نہر کا پانی ابھی بھی شرر شرر کر رہا تھا۔ فضا پر مانوس سیاہ چادر تنی ہوئی تھی۔

کہیں کہیں اکا دکا جھینگر بول رہے تھے اور سفیدے کے لمبے لمبے پتے تالیاں بجا رہے تھے۔ پُل کے پار "بڈھے پیر" کا مزار اندھیرے میں ہیبت ناک منظر پیش کر رہا تھا اور اس کے احاطے میں اُگے پرانے برگد کی لٹکتی رسیاں ٹہنیوں پر بیٹھا الو سحر کے قریب آ لگنے پر آنکھیں بند کیے سونے کی تیاریوں میں تھا جب چودھری رُکا اور اچھل کر پُل کی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔

"ماکھے!" وہ پُرسوچ لہجے میں بولا۔ "گھر سے تو نکل ہی آئے ہیں اور گھٹنے گھٹنے پھنس بھی گئے ہیں۔ اب بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ بچا ہے اور وہ یہ کہ اپنے کیے سے مکر جائیں۔ سلطان خان کے سوا کسی نے ہمیں پہچانا نہیں اور اگر تو اُس کا مُک مُکا ہو گیا تو کیا فکر بچتی ہے۔ اگر خدانخواستہ زندہ رہا تو کہہ دیں گے اُسے غلطی لگ گئی ہے۔ بندہ بشر ہے۔ اندھیرے میں دھوکا کھا بیٹھا ہے۔ کیوں ماکھے؟"

"ٹھیک کہتے ہو سرکار۔" ماکھے نے بھلا کب اُس کی بات موڑی تھی۔

"تو پھر چلیں؟" وہ بولا۔ "پَو پھٹنے سے پہلے گھر پہنچ جائیں گے۔"

"نہیں میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔" چودھری بولا۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا ماکھے۔ گھر سے تو ہم نکل ہی آئے ہیں۔ اب خالی ہاتھ واپس جاتے کیا اچھے لگیں گے؟"

ماکھے کو اندازہ ہو گیا۔ چودھری کا ذہن یقیناً کسی نئے منصوبے پر کام کر رہا ہے۔ مگر وہ کیا چاہتا ہے یہ وہ نہ جانتا تھا۔

urdudigest.pk
Courtesy www.pdfbooksfree.pk
urdudigest.pk

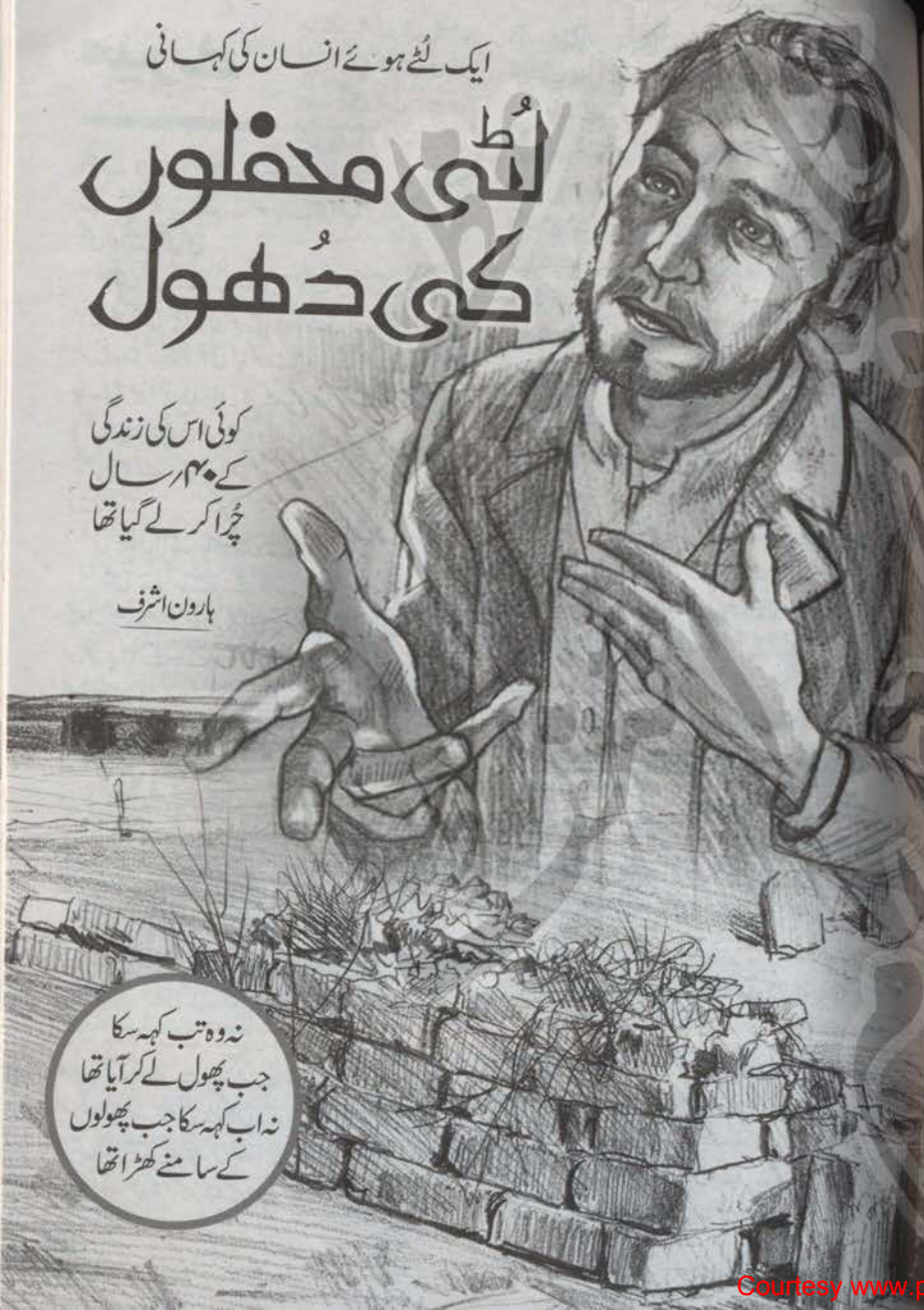

"دیکھ ماکھے! چودھری نے ٹوٹی تمہید کا نیا نویکلا سرا اُٹھایا۔
"میں نے سُن رکھا ہے مائی اپنی پوتی کے بیاہ کی تیاریوں میں ہے۔ زیور کپڑا تو اس نے کچھ نہ کچھ ضرور بنا رکھا ہوگا۔ میں نے پردے کے پیچھے اُس کی پوتی کی جھلک دیکھی تھی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ جو بُندے اس نے اُس وقت پہنے ہوئے تھے کوئی ڈیڑھ تولے کے تو ضرور ہوں گے۔"

ماکھا سمجھ گیا۔ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ چودھری کے ساتھ ۱۵؍سال سے تھا۔ ۱۵؍سال سے وہ دن رات اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔ وہ اس کے اَبرو کے اشارے پر حرکت کرتا تھا اور شکار لا کر اُس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا تھا۔ اس نے کبھی اس کے آگے چوں نہیں کی تھی اور لوگ کہتے تھے وہ روبورٹ ہے۔ جس کا بٹن چودھری کے ہاتھ میں ہے۔

اس نے نگاہ چودھری پر گاڑ دی۔ جو اپنے انوکھے خیال پر مسرور دکھائی دیتا تھا اور ایک مکارانہ مسکراہٹ اس کے سرخ و سپید چہرے پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

پھر ماکھے نے خود پر نظر کی۔ اُس کا آبنوسی وجود اندھیرے کا حصہ معلوم ہوتا تھا اور گٹھا ہوا بدن کسی وحشی درندے کی طرح ویرانے میں ایستادہ تھا۔ یک بارگی اُس کے دماغ میں ایک خیال سرسرایا اور لمحے میں تصویر بدل گئی۔

اُسے لگا چودھری ایک آدم خور بھیڑیا ہے۔ جس کے بدن پر انسان کا چہرہ لگا ہوا ہے اور وہ اُس کا گُرگا ہے۔ محض شکاری کتا۔ اپنے مالک کی فقط ایک شِشکار کا منتظر۔ خون ایک دم سے اُس کی رگوں میں اُبلنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو میکانکی انداز میں اُٹھتے پایا۔

"ماکھے!" چودھری پانی پر نگاہ جمائے بولا۔ اپنے خیال کا مزہ لیتے ہوئے اُس نے ماکھے کے چہرے کی جانب نہیں دیکھا۔ چودھری نے اُس کی نگاہوں کے بدلتے رنگوں کو نہیں دیکھا۔

شرر کی آواز کے ساتھ پانی کا ریلا نیچے گرا اور ماکھے نے دونوں ہاتھوں سے چودھری کی گردن دبوچ لی۔

وہ اس ناگہانی آفت پر لڑکھڑا کر مینڈھ سے نیچے لٹک گیا اور اس کے حیران دیدے باہر کو اُبلنے لگے۔ آواز گلے میں گھٹ گئی اور وہ اپنے دفاع کے لیے ہوا میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔

"ماکھے...... ما...... کھے۔ یہ کیا؟"

کوئی اس وقت ماکھے کو دیکھ لیتا، تو اُسے معلوم ہوتا کہ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والے سورج کی ساری لالی سمٹ آئی ہے اور اس کے بھدے نقوش والے چہرے پر ایستادہ سر پر خون سوار ہو گیا ہے۔ قریب تھا کہ وہ پوری قوت سے اُسے اٹھا کر پانی کے پرہول پریشر میں دھکیل دیتا۔

نہر کی مینڈھ پر چودھری کی گھگھیائی ہوئی کٹی پھٹی آواز رونے لگی۔

"تجھے کیا ہو گیا ہے ماکھے...... تجھے کیا ہو گیا ہے...... مجھے مت مارو...... تجھے اللہ رسول کا واسطہ مجھے مت مارو۔"

اور ماکھے کے سخت ہوتے ہاتھ آپوں آپ ڈھیلے ہونے لگے۔

اس نے نگاہیں چودھری پر گاڑ دیں۔ چودھری سکتے کے عالم میں اُس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ اس خوفزدہ کبوتر کی طرح تھا جسے بلی کو سر پر دیکھ کر آنکھیں بند کرنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔

ماکھے کا چہرہ ساکت تھا۔ معمول کی طرح سپاٹ اور جامد۔ گویا وہ کوئی بے حس پتھر ہو۔ ہاتھوں کو آہستہ آہستہ ڈھیلا چھوڑتے ہوئے اُس نے چودھری کے سر کو پکڑا اور اُٹھا کر زور سے پیچھے دھکیل دیا۔ اس کی پگڑی کھل کر گلے کا ہار بن گئی اور وہ خوفزدہ ہو کر بالکل مینڈھ سے لگ گیا۔

"ہم جیسے شیطان انسانوں کے منہ سے اللہ کے واسطے اچھے نہیں لگتے مالک۔ پر آج مائی کے گھر سے نکلنے کے بعد مجھے لگا میرے اندر سے کوئی بول پڑے گا اور تیرے ناپاک ارادوں نے مجھے بُلوا چھوڑا ہے۔ جا میں نے تجھے اس نام کی برکت پر چھوڑ دیا چودھری جو میرے اندر بھی آج ہی بولا ہے۔"

ماکھے نے اتنا کہا اور با آواز بلند روتا ہوا سفیدے کے قطار اندر قطار درختوں کے جھنڈ میں گم ہوتا جانے کدھر نکل گیا۔

■

ایک لٹے ہوئے انسان کی کہانی

لُٹی محفلوں کی دُھول

کوئی اس کی زندگی کے ۴۰؍سال چُرا کر لے گیا تھا

ہارون اشرف

نہ وہ تب کہہ سکا
جب پھول لے کر آیا تھا
نہ اب کہہ سکا جب پھولوں
کے سامنے کھڑا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے

سامنے پھول ہی پھول ہیں۔ سچے گلابوں کی تیز مہک پھیلی ہوئی ہے اور میں بار بار آنکھوں میں اُترنے والے آنسوؤں کو چھپا رہا ہوں۔ عجیب کیفیت ہے۔ کسی محبوب شے کے کھو جانے کا احساس جو میری تھی بھی اور نہیں بھی تھی.....

میں کس کے آگے روؤں؟ لوگ کہیں گے اچھا خاصا ادھیڑ عمر آدمی بچوں کی طرح رو رہا ہے۔ اب اگر بچوں کی طرح رونا آئے تو کوئی کیا کرے؟ دنیا کے ڈر سے آنسو پی جائے؟ میرا تو جی چاہ رہا ہے پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ بالکل ایسے بچے کی طرح جو دنیا کی بھیڑ میں اپنی ماں سے بچھڑ جاتا ہے۔ عجیب احساس ہے میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتا۔

''بھائی! ایک چادر بنا دو تازہ گلابوں کی۔''

میں نے سامنے لگے گلاب کی پتیوں کے ڈھیر کو چھوا۔ نرم ملائم خوشبودار پتیاں۔ سہرے میں سجائے جانے اور قبر پر ڈالے جانے والے پھول ایک جیسے ہوتے ہیں۔ پھول نہیں بدلتے..... انسان بدل جاتا ہے زندگی کے ہر موڑ پر ایک نئے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ ساری دنیا اور اس میں رہنے والے لوگ بدلتے رہتے ہیں۔ مجھے تبدیلی بالکل اچھی نہیں لگتی مگر میں خود کو بھی بدلنے سے نہیں بچا سکتا۔ سب کچھ ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ مگر گلاب کی خوشبو وہی ہے، اس کا رنگ وہی ہے۔

۴۰ بہاریں گزریں ایک دن میں اسی طرح پھول خریدنے آیا تھا۔ اس وقت بھی بہت کچھ بدل رہا تھا۔ اس رات آپا کی شادی تھی۔ شام کا دھندلکا چھا رہا تھا اور ہر طرف سے اذان کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں پھولوں کے بہت سے ہار، گجرے اور پتیاں خرید کر واپس گھر جا رہا تھا۔ بقول بزرگوں کے اس وقت تیرہ برس کی عمر میں بھی میں ایک بچہ ہی تھا، اس لیے شادی والے گھر کا صرف ایک ہی کام میرے سپرد کیا گیا تھا۔ گھر پر سب کچھ ہمارے چچازاد بدر بھائی سنبھال رہے تھے اور وہ تو بہت ہی اچھے بھائی تھے۔

ایک عجیب سی اُداسی نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ میں بالکل خوش نہیں تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے پھول اندر کسی کو دے دیے۔ باہر جاتے ہوئے لڑکیوں کی چہ میگوئیوں کی ہلکی سی بھنک میرے کان میں پڑی ''شکل دیکھی ہے بے چارے کی؟ بہت ہی اُداس ہے۔ دیکھنا رخصتی کے وقت کتنا روئے گا۔''

میں باہر جا کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

کھڑکی سے امّاں نے آواز دی۔ ''یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اندر آ کر کپڑے بدلو۔ وقت ہوا جا رہا ہے۔''

ارے! آج میں امّاں کو کیسے نظر آ گیا؟

میرے بستر پر ایک سفید شیروانی پڑی تھی۔ خوبصورت تھی اور نیچے فرش پر سنہرا کھسّا۔ میں پانچ منٹ میں تیار ہو کر باہر آ گیا اور گھر کے کمروں سے گزر کر باہر جاتے ہوئے نجانے کتنی پھوپھیوں اور خالاؤں نے میری پیشانی چومی اور بلائیں لیں اور کہا کہ آج تو شہزادہ لگ رہا ہے۔

میں نے پردہ ہٹا کر کمرے میں جھانکا۔ ربیعہ آپا آئینے کے سامنے بیٹھی تھی اور بہت سی دوسری لڑکیاں اسے تیار کر رہی تھیں۔ اکثر تو بس اسے تیار ہوتا دیکھنے کے لیے وہاں کھڑی تھیں اور وہ اپنے زرتار لباس اور زیورات کی چمک میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ اس نے مجھے نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ آج میرے لیے کیسے وقت نکل سکتا تھا؟

وہ مجھ سے عمر میں ۱۰ سال بڑی تھی۔ ۱۰ برس کی عمر میں جب میں اس کی گود میں آ گیا تو اس نے مجھے بہت پیار کیا۔ میں اس کی زندگی کی واحد دلچسپی بن گیا۔ اس نے جی بھر کے میرے ناز نخرے اُٹھائے۔ جب میں ذرا ہوش کی عمر کو پہنچا، اس وقت بھی مجھے یاد ہے آپا ہر وقت مجھے اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ وہ سکول سے آتے ہی مجھے گود میں اُٹھا لیتی تھی اور ہم سارا دن ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

مجھے بھی امّاں سے زیادہ آپا سے لگاؤ تھا۔ وہ وقت تو جیسے پر لگا کر اُڑ گیا۔ اب یادداشت میں ایک خواب کی طرح محفوظ ہے۔

میری عمر ۸ سال کی تھی جب آپا کو لاہور کے فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ڈاکٹر بننے چچا کے یہاں لاہور چلی گئی۔ پتا نہیں مجھ سے جدا ہوتے وقت اس پر کیا بیتی ہوگی۔ روئی تو ضرور ہوگی۔ میں بھی رویا تھا اور کئی دنوں تک اُداس رہا تھا۔ میں اس کے لمس کو ترستا تھا۔ جیسے وہ مجھے بازوؤں میں بھر کا ماتھا چوم لیتی تھی۔ اس کی خوبصورت آواز، شوخ طبیعت، شخصیت میں ایک آنچ تھی، ایک دلکشی تھی۔ اس دن جو اسے کھویا تو پھر کبھی نہ پایا۔ آنے والے وقتوں میں ہم دونوں بہت قریب اور بہت دور بھی رہے۔ مگر وہ بات نہیں تھی۔ وہ سب کچھ کھو گیا تھا۔

آپا بس خط خطابت تک رہ گئی۔ کبھی کبھی ابا لاہور جا کر اس سے مل آتے۔ اس کی پڑھائی اتنی مشکل تھی کہ سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ گرمیوں میں ایک مہینہ کے لیے گھر آ جاتی تھی۔ پڑھائی کے بوجھ نے اس کی شخصیت سے اپنا خراج وصول کیا تھا۔ گھر میں بھی اسے ہر وقت پڑھائی کی فکر کھائے جاتی تھی۔ میں نے شروع شروع میں اس پرانی آپا کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ بدل چکی تھی۔ وقت بدل گیا تھا۔ میرے لیے بھی دل لگانے کو بے شمار چیزیں تھیں۔ اس عمر میں کتنا کچھ ہوتا ہے انسان کے پاس۔ آپا کا خیال میرے دل کی گہرائیوں میں دفن ہو گیا۔ وہ ہر سال مہمانوں کی طرح آتی اور واپس چلی جاتی۔

شادی والے دن گھر اور سڑک کے درمیان جو گھاس کا میدان تھا اس میں شامیانہ لگایا گیا تھا۔ بدر بھائی اور ان کے دوست سارا انتظام سنبھال رہے تھے۔ میں بس شیروانی پہنے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ سڑک پر ایک تانگہ آ کر رُکا۔ گھر شہر سے باہر نئی آبادی میں تھا۔ اس لیے پتا ڈھونڈنے میں مشکل ہوتی تھی۔ تانگے سے دو عجیب حلیے کے آدمی نکلے۔ سروں پر سفید پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اور انگرکھے پہنے ہوئے تھے۔ بدر بھائی نے انھیں باغ میں پڑے تخت پوش پر بٹھا دیا۔ ان کے لیے حقے پانی کا انتظام ہوا اور وہ چمڑے کے غلافوں سے اپنی شہنائیاں نکال کر بجانے لگے۔ پہلے کچھ فلمی دھنیں بجیں جنھیں میں پہچانتا تھا۔ ''اکھیاں ملا کے چلے نہیں جانا'' ''گائے جا گیت ملن کے'' ''چاندنی راتیں'' وغیرہ۔ یہ سب فلمیں میں نے اماں اور خالاؤں کے ساتھ سینما کے میٹنی شوز میں دیکھی تھیں۔ فلمیں تو سب بکواس تھیں، خوشی تو بس باہر نکلنے کی اور انٹرول کے دوران بڑوں کی فراخ دلی سے لطف اندوز ہونے کی ہوتی تھی۔

☆☆

ان دنوں ہمارا تبادلہ لاہور میں تھا۔ ربیعہ آپا کے گھر چھوڑنے سے پہلے کی بات ہے۔ بدر بھائی ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے اور ایک دوست کے ساتھ فلم دیکھنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ تو میں ضد کرنے لگا کہ میں بھی جاؤں گا۔ اماں نے میری ضد دیکھی تو تیار کر کے بدر بھائی کے ساتھ کر دیا۔ شہر کی طرف ایک پرانا سینما تھا۔ مشہور امریکن فلم ''Gone with the wind'' لگی ہوئی تھی۔ فلم مجھے اچھی لگی تھی حالانکہ کہانی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ فلم کے دوران پانچ چھ مرتبہ بھائی جان نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ اور ان کے دوست دبی دبی ہنسی ہنس رہے تھے۔ تقریباً ۱۵ برس بعد جب میں لندن میں انجینئرنگ کر رہا تھا تو ناسٹیلجیا سے مجبور ہو کر میں نے وہ فلم دوبارہ دیکھی۔ وہ بوسہ بازی کے مناظر تھے جن میں بدر بھائی میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتے تھے۔ فلم کے بعد دوست سے رخصت ہوئے اور مجھے لے کر ایک کیفے میں آ گئے۔ بیرے کو کہہ دیا کہ ابھی انتظار کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی سہیلی آ گئی اور کیبن میں راز و نیاز شروع ہوئے۔ بعد میں مجھے راز کھلنے کی معمولی سی رشوت بھی ملی۔ لوگ سمجھتے ہیں ابھی بچہ ہے اسے کیا یاد رہے گا۔ مگر کچھ ایسی باتیں ذہن میں رہ جاتی ہیں کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برابری

خلیفہ مامون الرشید پر ایک شخص نے ۳۰ ہزار دینار کا دعویٰ کیا۔ جس کی جواب دہی کے لیے اس کو قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ خادم نے قالین لا کر بچھایا کہ خلیفہ اس پر تشریف فرما ہوں۔ قاضی نے حکم دیا کہ قالین اٹھا دو۔ عدالت کے روبرو خلیفہ اور مدعی دونوں برابر درجہ رکھتے ہیں۔ مامون نے کچھ برا نہ مانا اور بغیر چون و چرا قاضی کے فیصلے کو تسلیم کر کے مدعی کو اس کا حق دے دیا۔

(راشد سیال، ملتان)

یادداشت کی رو میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ تو شہنائی والا فلمی طرز بجا رہا تھا اور اچھی بجا رہا تھا۔ پھر شاید اس نے کوئی راگ چھیڑ دیا۔ خدا جانے میرے دل پر اس آواز کا کیا اثر ہوا کہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں ضبط نہیں کر پایا اور اُٹھ کر موتیے کی جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔ جی بھر کر رویا اور دل کا غبار نکال دیا۔ شہنائی نواز قیامت ڈھا رہا تھا۔ ایسی تیکھی اور دل میں پیوست ہو جانے والی آواز......

مجھے کسی نے روتے نہیں دیکھا...... رخصتی کے وقت میری آنکھیں خشک تھیں۔ ابھی آپا کی پڑھائی ختم نہیں ہوئی تھی اور مستقبل کے فیصلے پہلے ہی ہو چکے تھے۔ ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد وہ گھر آ گئی اور دونوں ماں بیٹیاں شادی کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ آپا اپنی ساری پڑھائی بھلا کر بس ایک لڑکی بن گئی جس کی شادی ہونے والی ہو۔ اس نے ۵ سال کی محنت ضائع کر دی۔ ہاؤس جاب کے علاوہ ایک دن بھی کہیں کام نہیں کیا۔ اب اس کی ڈاکٹری صرف اس کام کی رہ گئی تھی کہ گھر میں کوئی بیمار ہو تو وہ دوا تجویز کر سکتی تھی یا تھرمامیٹر کی ریڈنگ پڑھ سکتی تھی۔ اس کے ہونے والے شوہر نے پہلی شرط یہی بتائی تھی کہ لڑکی باہر کام نہیں کرے گی، گھر سنبھالے گی۔ خیر آپا گھر بیٹھ گئی اور ہر گھریلو عورت کی طرح اس کی زندگی گھر، شوہر اور بچوں کے گرد گھومنے لگی۔ ایک نوکرانی کی مدد سے وہ ساری کوٹھی کا کام سنبھالتی تھی۔ اسے ایک روایتی گھر والی بننے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

کئی سال گزر گئے۔ ہم دونوں زندگی کی مسافتیں طے کرتے گئے۔ کبھی پاس کبھی دور۔ چند روز ہوئے یونہی باتوں باتوں میں بچپن کا ذکر چھڑ گیا اور ہم دونوں نے بہت سی یادیں تازہ کیں۔ میری باتوں اور لہجے کی اداسی سے وہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی کہ میں نے کیا کھویا تھا بچپن میں۔ اس ملاقات کے بعد اس نے گہری خاموشی اختیار کر لی تھی جو ہر آنے والے دن گہری ہوتی چلی گئی۔ اس کی آواز بھی آتی تو یوں جیسے کسی کنوئیں سے بول رہی ہو تب مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کا نقصان تو مجھ سے کہیں زیادہ ہو چکا تھا۔ پہلے اگر احساس تھا تو اقرار اور اظہار نہ تھا۔ اس ملاقات نے اسے ایسا خاموش کیا کہ

کل رات وہ نیند میں ہی چل بسی...... بنا کچھ کہے۔ بنا کچھ مانے اور بنا کچھ مانگے، وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔

میں نے سب سے نظریں بچا کر اس کے بے جان چہرے کو ایک نظر دیکھا۔ پھر مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ اس کا بڑا بیٹا سب انتظامات کر چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:

''بیٹا......! کوئی کام ہے تو مجھے بتاؤ۔''

''نہیں ماموں جان! سب انتظام ہو گیا ہے......'' پھر اسے اچانک کچھ یاد آ گیا۔ ''اوہو! پھول لانا یاد ہی نہیں رہا۔ ماموں جان پلیز آپ پھول لے آئیں۔''

۴۰ سال بعد...... میں پھر وہیں کھڑا ہوں......

میرے سامنے پھول ہی پھول ہیں...... اور آنسو روکے نہیں رُکتے۔ ■

خزانہ

ایک بچے کو بے چین کر دینے والے دانت درد کا ماجرا جو کسی اور کے درد کا مداوا بن گیا تھا

خواجہ مظہر نواز صدیقی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دانیال

کے دانت میں اچانک شدید قسم کا درد اُٹھنے لگا تھا۔ پہلے یہ درد ہلکا سا تھا مگر اس وقت دانیال کو اپنی جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ سکول میں تمام وقت وہ بالکل ٹھیک رہا۔ اس نے آج دسویں کے سالانہ امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں سکول ٹیسٹ میں بیالوجی کا ٹیسٹ دیا تھا۔ اس نے چھٹی کے بعد ابو سے ملنے والے جیب خرچ سے پہلے گول گپے کھائے اور بعد میں قلفی بھی کھائی تھی، تب سے ایک ہلکا ہلکا دانت درد جنم لے چکا تھا۔ یہ ہلکی تکلیف اب زیادہ شدید درد میں تبدیل ہو کر پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ دانت کے اس مسلسل درد نے اسے دن میں تارے دکھا دیے تھے۔ امی نے دانیال کو اس قدر پریشان دیکھا تو ان سے رہا نہ گیا اور وہ پوچھ بیٹھیں ''دانیال! تمھارے ساتھ کوئی مسئلہ تو نہیں، پریشان دکھائی دے رہے ہو؟''

وہ چہرے پر درد کے اثرات سجاتے ہوئے بولا ''امی دانت میں بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔'' ''تم نے ضرور بازار سے کوئی گندی، کھٹی یا میٹھی چیز کھائی ہوگی!'' امی تشویش زدہ لہجے میں پوچھنے لگیں۔

''جی ہاں امی! آپ سے کیا چھپانا، دراصل میں نے سکول سے گھر آتے ہوئے بالو کی ریڑھی سے گول گپے اور چچا عبدالشکور سے قلفی لے کر کھائی تھی۔'' دانیال نے اپنی کارگزاری امی کو پیش کر دی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ درد سے اُچھلنا شروع کر دے، ''اوہو! تم نے بالکل غلط کیا..... تمھیں پچھلی بار جب دانتوں میں درد ہوا تھا تو ڈاکٹر صاحب نے بتایا تھا کہ تمھارے دانتوں میں سے دو دانتوں کو کیڑا لگ گیا ہے اس لیے انھوں نے تمھیں کھٹی میٹھی اور بازاری چیزیں کھانے سے منع بھی کیا تھا۔'' امی غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

''بس امی جان، مجھ سے غلطی ہوگئی چونکہ سب دوست کھا رہے تھے ان کی دیکھا دیکھی میں بھی کھا بیٹھا۔''

دانیال نے درد کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اچھا بتاؤ کہ تمھیں بھوک لگ رہی ہے؟'' امی نے اس کی توجہ ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں امی! دانت کا درد مجھے چین نہیں لینے دے رہا، مجھے آپ درد کی کوئی گولی دیں تاکہ درد میں کمی آجائے۔'' دانیال پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''ہرگز نہیں! ہمیں اپنے معالج کے مشورے کے بغیر کوئی دوا نہیں لینی چاہیے۔ تم ایسا کرو کہ فوری طور پر سکول یونیفارم تبدیل کر لو، میں ٹیلی فون ملا کر ابھی دندان ساز سے وقت لے لیتی ہوں ان سے مشورے اور تشخیص کے بعد ہی کوئی دوا لیں گے۔'' امی نے تمہیدی حکم جاری کرتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں دانیال کی بڑی بہن کشمالہ بھی کالج سے گھر پہنچ گئی، اسے جب معلوم ہوا کہ دانیال کے دانت میں درد ہے تو وہ چھیڑ چھاڑ کے لیے دانیال کو ڈھونڈنے لگی۔ دانیال جب یونیفارم تبدیل کر کے اپنے کمرے سے باہر نکلا تو کشمالہ کو اپنا منتظر پایا۔ کشمالہ کے ذہن میں شرارت جنم لے چکی تھی۔

''دانیال بھائی! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اردو میں دانتوں پر بے شمار محاورے ہیں، جیسے دانت بجنا، دانت پیسنا، دانت سے دانت بجنا، دانت کرکرے ہونا، دانت کھٹے ہونا، دانتوں تلے انگلی دابنا وغیرہ وغیرہ، مگر دانت کا درد ہم آج ملاحظہ کریں گے۔ وہ بولے جا رہی تھی مگر دانیال اپنے دائیں گال پر ہاتھ رکھے کندھے کی جانب سر جھکائے بے چین کھڑا تھا۔ امی واش روم میں تھیں۔ کشمالہ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد پھر بولنے لگی 'مجھے علم ہے کہ کل تمھارا میتھ کا ٹیسٹ ہے اور شاید ٹیسٹ سے فرار کی کوئی ترکیب دانت کا درد تو نہیں..... کشمالہ نے ہنستے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''باجی قسم سے مجھے دانت کا شدید درد ستا رہا ہے، ایک گھنٹہ سے یہ درد مجھے چین نہیں لینے دے رہا اور آپ کو

مذاق کی سوجھ رہی ہے۔'' دانیال کے چہرے پر بے زاری عیاں تھی۔ کشمالہ کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی، وہ مذاق بھی خوب کرتی تھی مگر وہ بولتے ہوئے احتیاط اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتی تھی۔ دانیال کا خیال تھا کہ اس کی باجی اس کا دل بہلانے کو شاید ایسا کہہ رہی ہے۔ اس دوران امی بھی واش روم سے آگئیں۔ انھوں نے گھر سے روانہ ہونے سے پہلے کلینک پر ٹیلی فون ملایا تھا مگر کلینک سے کسی نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ امی کا خیال تھا کہ شاید ڈاکٹر صاحب کلینک پر مصروف ہوں گے، مگر وہاں تو صورتحال مختلف تھی۔ ڈاکٹر صاحب دو دن کے لیے کسی ضروری کام سے دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ کلینک پر تھوڑے میلے کپڑوں میں ملبوس ایک عام سی شکل وصورت کا معصوم سا ۱۳/۱۴ برس کا لڑکا موجود تھا۔ وہ لڑکا پہلی نظر میں پہچان گیا کہ دانیال کے دانت میں درد ہے۔ امی کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔

وہ اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ لڑکا پوچھنے لگا ''کیا بھائی جان کے دانت میں درد ہے؟'' دانیال کی امی نے اثبات میں سر ہلایا۔ دانیال کے دانتوں میں درد بڑھتا جا رہا تھا۔ امی نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس لڑکے سے پوچھا کہ ''کیا تم یہاں پر کام کرتے ہو؟''

وہ جھٹ سے بولا ''ڈاکٹر صاحب کی غیر موجودگی میں ہنگامی حالت میں کبھی کبھار مریضوں کا معاینہ کر لیتا ہوں۔'' وہ کچھ دیر رک کر پھر بولا ''آپ فکر نہ کریں، میں ۱۰ سال کا تھا کہ میری ماں مجھے ڈاکٹر صاحب کے ہاں چھوڑ گئی تھی، مجھے یہاں ۴ سال ہو گئے ہیں۔ مجھے دانتوں کے تمام امراض کا علاج کرنا آتا ہے، آپ بھائی جان کو صوفے پر بٹھائیں میں ابھی ان کا معاینہ کرتا ہوں، اگر ایکسرے کرنا پڑے تو میں وہ بھی کر لوں گا.....'' اس لڑکے کا اعتماد بھرا لہجہ دانیال اور اس کی امی جان کو متاثر کر رہا تھا، اس لڑکے نے اپنی بات مکمل کر لی تھی۔

''امی! میری جان نکلتی.....'' ''میرا دانت.....'' ادھورے جملے کے ساتھ ہی دانیال کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

اگلے ایک لمحے میں امی نے فیصلہ کر لیا تھا اور مجبوری میں موجود نعمت پر شکر ادا کرتے ہوئے دانیال کو کلینک میں لگے معاینہ والے مخصوص بڑے سے صوفے پر بیٹھنے کا کہہ دیا۔ اُس لڑکے نے صوفے پر لگے قمقمے روشن کیے اور اوزار سنبھال کر دانیال کے دانتوں کا معاینہ کرنے لگا۔ معاینے کے بعد اس نے دانیال کی امی کو بتایا کہ دانیال کے دانتوں میں کیڑا لگ گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں، میں دوا بھی لگا دیتا ہوں اور فوری طور پر بھائی جان کو دو ٹکیاں بھی نگلنے کے لیے دیتا ہوں۔ کچھ ہی دیر میں یہ درد بالکل ختم ہو جائے گا۔ امی دانیال اور لڑکے کا موازنہ کر رہی تھیں۔ وہ معاینہ کرنے والا لڑکا دانیال سے کچھ زیادہ چھوٹا نہ تھا مگر وہ بہت معصومانہ لہجے میں دانیال کو بھائی جان کہہ رہا تھا۔ اس خیال سے امی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ دانیال بھی درد میں کمی کے لیے ٹکیاں لینے کے بعد صوفے پر لیٹا کچھ سکون محسوس کر رہا تھا۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' دانیال کی امی نے معاینہ کرنے والے لڑکے سے سوال کیا۔

''کاشف'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

کاشف نے بتایا کہ وہ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ اس کے والد ایک حادثہ میں جان گنوا بیٹھے۔ کاشف سے چھوٹے اس کے دو بہن بھائی بھی تھے۔ والد کی وفات کے بعد اس کی والدہ اسے یہاں ڈاکٹر صاحب کے ہاں چھوڑ گئی تھیں۔ وہ دن کو یہاں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کرتا اور پھر رات کو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے گھر رہتا ہے۔ کاشف کی اماں غربت و پسماندگی کی زندگی گزار رہی ہے۔ وہ دوسروں کے گھروں میں کام کاج کرتی اور بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ کاشف نے انتہائی مختصر انداز میں اپنی کہانی بیان کر دی۔ اس نے بتایا تھا کہ میں ڈاکٹر صاحب کے ہر کام کو بڑی توجہ اور غور سے دیکھتا اور سیکھتا ہوں۔ میں کسی بھی مریض کا معاینہ کرنے سے نہیں ہچکچاتا، یہ ڈاکٹر صاحب کے علم میں نہیں کہ میں یہاں ان کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غیر موجودگی میں مریضوں کو دوا بھی دے دیتا ہوں۔ وہ مجھے بس خیال رکھنے کے لیے کہتے ہیں مگر مجھے درد اور اذیت میں مبتلا مریضوں کا علاج کر کے خوشی ملتی ہے۔

کاشف نے دوا کا نسخہ بھی لکھ دیا، دانیال کی امی نے جب اسے فیس دینے کی کوشش کی تو اس نے فیس لینے سے صاف انکار کر دیا، بہت اصرار کے باوجود اس نے اُن سے فیس نہ لی۔

شام تک دانیال بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر کاشف یاد آ رہا تھا، دانیال اپنے سکول کا ذہین طالب علم تھا۔ اس نے گھر پہنچ کر اپنی بہن کشمالہ باجی کو بھی کاشف کے بارے میں بتایا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد دونوں نے ایک منصوبہ بنا لیا تھا۔ چند دن بعد وہ دونوں منصوبے کے مطابق شام کے بعد اسی دندان ساز کے کلینک پر گئے جہاں سے دانیال نے علاج کرایا تھا۔

''کہیے! آپ کیسے تشریف لائے ہیں؟'' ڈاکٹر صاحب نے کشمالہ باجی سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! ہم کاشف کے سلسلے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو ہم چاہتے ہیں کہ اس بچے کو آپ تعلیم کے حصول کے لیے سکول بھیجیں۔'' کشمالہ نے التجائیہ انداز میں کہا۔

ڈاکٹر صاحب اس غیر متوقع صورتحال کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ انھیں کشمالہ کی جرات و بے باکی پر ایک شدید جھٹکا سا محسوس ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے ''کاشف یتیم اور نادار بچہ ہے، اسے تعلیم کی نہیں روٹی کی ضرورت ہے، اس کی ماں بیوہ ہے اور اس کے دو چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ یہ اگر تعلیم حاصل کرنے لگ جائے تو ان کے گھر کا چولہا کیسے جلے گا.....؟''

ڈاکٹر صاحب کا لہجہ کشمالہ کو سخت محسوس ہوا تھا۔

کشمالہ دوسروں سے اپنی بات دلیل کے ساتھ منوانے کا ہُنر جانتی تھی۔ وہ اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر وہ کہنے لگی ''ڈاکٹر صاحب! آپ کی بات درست ہے کہ اس کی والدہ کے پاس تعلیم کے اخراجات نہیں، مگر یہ لڑکا دن رات آپ کی کفالت میں رہتا ہے، کم از کم آپ تو اسے تعلیم دلوا سکتے ہیں؟''

اس کا انداز وکیل جیسا تھا، کشمالہ کے جواب میں ڈاکٹر صاحب پھر بولے ''بیٹا جی! آپ کو غریب لوگوں کے مسائل کا علم نہیں، اگر یہ پڑھنے لگ گیا تو یہاں کلینک پر کام کون کرے گا.....؟'' ڈاکٹر صاحب سوالیہ انداز اختیار کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ پر حیرت ہو رہی ہے اگرچہ آپ جانتے ہیں کہ تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہے، اب اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک بچے کی کفالت کی ذمہ داری دے دی ہے تو آپ اس کو تعلیم سے محروم نہ رکھیں، کیوں کہ علم انسان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ آپ کاشف کو ہُنر تو سکھا رہے ہیں، خدا کے لیے تعلیم بھی دلوائیں۔'' کشمالہ بہت شائستگی اور تحمل سے اپنا مؤقف پیش کر چکی تھی، وہ جانتی تھی کہ سچی اور کھری بات جتنی عمدگی اور دلیل کے ساتھ کی جائے اتنا ہی اس کا اثر ہوتا ہے اور مطلوبہ نتائج بھی حاصل ہوتے ہیں۔

دانیال سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ایک تعلیم یافتہ آدمی ہیں، آخر ان کے ذہن میں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ وہ کاشف کو تعلیم کے لیے سکول بھیجتے۔ وہ اپنی سوچوں میں غرق تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے میز پر پڑی گھنٹی بجائی اور کاشف کو اپنے پاس بلا لیا۔ ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر بدلتے رنگوں کو کشمالہ بھانپ چکی تھی۔ ''کاشف! تم یہ بتاؤ کہ کیا تم تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر صاحب کے اچانک سوال پر کاشف گھبرا سا گیا۔

''ک..... ک..... ک..... کیوں..... ڈاکٹر صاحب؟'' وہ رک رک کر ہکلاتے ہوئے بولا۔

''دیکھو بھائی! کیا تمھیں پڑھنے کا شوق ہے اور اگر تمھیں ڈاکٹر صاحب سکول بھیجیں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا.....'' اب کشمالہ نے کاشف سے پوچھا تھا۔

کاشف نے کچھ دیر دانیال کی طرف دیکھا جو آنکھوں آنکھوں میں اسے ہاں کی گزارش کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے

حکمران اور رعایا

حجاج کے زمانہ میں جب لوگ صبح بیدار ہوتے اور ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی تو باہم پوچھتے کہ گزشتہ رات کون قتل کیا گیا، کس کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور کس کی پیٹھ کوڑوں سے چھلنی ہوئی؟

ولید بن عبدالمالک کثیر مال و جائیداد اور عمارتیں بنانے کا شوقین تھا۔ چنانچہ اُس کے زمانے میں لوگ ایک دوسرے سے مکانات کی تعمیرات نہروں کی کھدائی اور درختوں کی افزائش سے متعلق پوچھا کرتے۔

جب سلیمان بن عبدالمالک نے حکومت کی کرسی سنبھالی تو وہ کھانے پینے اور گانے بجانے کا شوقین تھا۔ چنانچہ کھانے وغیرہ گانے والیوں اور لونڈیوں کے متعلق ایک دوسرے سے پوچھتے اور یہی اُن کا موضوعِ سخن ہوتا۔

اور جب عمر بن عبدالعزیز منصب خلافت کی زینت بنے تو لوگوں کی آپس کی گفتگو اِس قسم کی ہوتی:

''قرآن کتنا یاد کیا؟ ہر رات کتنا وِرد کرتے ہو؟ رات کو کتنے نفل پڑھتے ہو؟ فلاں آدمی نے کتنا قرآن یاد کیا؟ فلاں شخص مہینا میں کتنے روزے رکھتا ہے؟''

کسی نے سچ کہا ہے کہ لوگ اپنے حکمرانوں کے طور طریقے اختیار کرتے ہیں۔

(ناجیہ ملک، چناری آزاد کشمیر)

لیے کاشف کی نظریں کشمالہ باجی کی طرف بھی گئیں، وہ بھی اسے پورے دل سے آمادگی اختیار کرنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کرسی سے اٹھے اور کاشف کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر بولے ''کاشف بیٹا! میرے ذہن میں یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ جہاں میرے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع میسر ہوں وہاں دوسری طرف میرے گھر اور کلینک پر کام کرنے والا ایک بچہ زیورِ تعلیم سے محروم رہے، یہ احساس میرے اندر ان دونوں بہن بھائیوں نے جگایا ہے۔ میں اب تم سے یہی کہوں گا کہ تم اپنے شوق کا اظہار کرو تا کہ ہم کل سے تمھیں سکول بھیجنا شروع کر دیں، اگر تمھارا جواب ہاں میں ہوا تو مجھے یقین ہے کہ آنے والا کل تمھارا ہوگا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کلینک سے باہر ایک نہ ایک دن ڈاکٹر کاشف کے نام کا بورڈ آویزاں ہوگا۔'' کشمالہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ جیسے ڈاکٹر صاحب کے اس مثبت اور تعمیری طرزِ عمل سے اسے بہت بڑا انعام مل گیا ہو، اس نے زور کی ایک چٹکی دانیال کی کمر پر ڈالی، جس کے ذہن میں یہ خوبصورت تعمیری خیال جاگا تھا۔

حقیقت میں دانیال خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس لمحے سب کی نظریں کاشف پر جمی ہوئی تھیں، جسے آج اور ابھی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی نمایاں تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دانیال کو گلے لگا لیا، وہ سمجھ گیا تھا کہ دانیال کے دانت کا درد ہی اس کے لیے تعلیم کے دروازوں کے کھلنے کا سبب بنا تھا دانیال نے کاشف کا ہاتھ پکڑا اور اسے ڈاکٹر صاحب کے قریب لے آیا۔

''ڈاکٹر صاحب! بسم اللہ کریں..... کاشف بھائی کو کل سے سکول بھیجیں۔'' کاشف کی آنکھوں کی نمی اب اس کی ننھی آنکھوں کو بھگو رہی تھی، سکول جانے کے اعلان سے اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے دنیا کے بہت بڑے خزانے کی چابیاں اُسے مل گئی ہوں..... ■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امید اور یقین کی مٹی سے بنی
ایک ماں کی بے بسی کا ماجرا

واپسی

وہ ۱۰ سال بعد بھی
اپنے ۶ ماہ کے بیٹے کی
واپسی کا یقین پالے ہوئے تھی

ام ایمان

سیب، آرڑو اور زیتون کے بوڑھے درختوں
سے گھرے گھر میں بظاہر سب کچھ بدل چکا تھا

توہم پرستی

اہلِ روم نے روبیگس خدا کو کیسے تخلیق کیا؟

محبوب حسن کانجو

یہ ۴۰۰ قبل مسیح کی بات ہے جب یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ بیماریاں خدا کی طرف سے لوگوں کے گناہوں اور بدعملیوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ یہ آفات ناگہانی پودوں اور فصلوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں اور یوں لوگوں کو اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ کھڑی فصلوں پر بیماریوں کا اگر حملہ ہوجاتا تو وہ لوگ یہ سمجھتے کہ خدا ان سے ناراض ہوگیا ہے اور اب انھیں خدا کو خوش کرنا ہوگا تاکہ ان پر نازل شدہ آفت ٹل سکے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سائنس نے ترقی نہیں کی تھی۔ لوگ بنیادی علوم سیکھ رہے تھے۔ یہی سبب ہے کہ سب توہم پرست تھے۔ چوتھی صدی میں روم میں شدید قحط پھوٹ پڑا تھا۔ اناج کی فصلیں بیماریوں کے شدید حملوں کے باعث تباہ و برباد ہوگئیں۔ اہلِ روم بھوک سے مرنے لگے۔ انھیں یقین تھا کہ یہ ان پر خدا کا عذاب ہے اور یہ اُسی صورت ٹلے گا جب وہ خدا کو خوش کریں گے اور گناہوں کی معافی مانگیں گے۔ وہ سخت خوفزدہ اور حراساں تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک الگ بت بنایا اور اپنے اس نئے خدا کا نام روبیگس (Robigus) رکھا۔ وہ روبیگس کو خوش کرنے کے لیے منتیں، مرادیں مانتے اور قربانیاں دے کر سمجھتے کہ ان کی دعائیں پوری ہوں گی اور وہ ان آفات سے بچ جائیں گے۔ ان کا خدا خوش ہوکر انھیں ان بیماریوں سے بچالے گا اور وہ خوشحال ہوجائیں گے۔ وہ اپنے خدا روبیگس کے لیے خاص چھٹی کا اعلان کرتے اور اسے خوش کرنے کے لیے سرخ کتوں، لومڑیوں اور گائے کی قربانی دیتے اور خوش ہوتے کہ اب ان کی فصلیں کنگی اور دیگر مہلک بیماریوں کے حملہ کی زد میں آکر تباہ نہیں ہوں گی۔ تھیوفراسٹس نے مشاہدہ کیا کہ بیماریوں کا حملہ پہاڑی علاقوں کی نسبت میدانی علاقوں میں زیادہ ہے پھر کاشت کاروں اور کسانوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ میدانی علاقوں میں بسنے والے لوگ زیادہ بدعمل، بدکار اور گناہگار ہیں۔ جبکہ پہاڑی علاقوں میں مقیم لوگ کم گناہگار ہیں۔ تھیوفراسٹس نے وضاحت پیش کی کہ خدا مختلف مقامات پر موسم میں تغیر و تبدل کرکے بیماریوں کے حملوں کا سبب بناتا ہے۔ اس دور کے ایک اور یونانی سائنس دان ڈیموکریٹس نے بلائٹس کی بیماری پر تحقیقات کیں اور اس کو کنٹرول کرنے کا طریقہ بھی بتایا۔ تاہم بعدازاں تھیوفراسٹس نے بھی بیماریوں کے حوالے سے تحقیقات کیں۔ تھیوفراسٹس ارسطو کا شاگرد تھا اور اس نے پودوں پر ۲ کتب لکھیں۔

اس کی ایک کتاب کا نام "The Nature of Plants" جس میں اس نے پودوں کی مارفالوجی اور اناٹومی کو تفصیلاً بیان کیا اور مختلف مقاصد کے لیے پودوں کے خصائص مفصل لکھے۔ اس کی دوسری کتاب "Reasons of Vegetable Growth" میں اس نے پودوں کی افزائش بیج اور گرافٹنگ کے ذریعے، ماحولیاتی تبدیلیوں کے پودوں پر اثرات، ثقافتی عوامل کی اثر اندازی، پودوں پر غیرفطری اثرات اور بیماریوں کے حملوں سے پودوں کی اموات تک پر تحریر کیا۔ تھیوفراسٹس کے انہی کارناموں اور خدمات کے صلے میں اسے خراج تحسین پیش کیا گیا اور اسے بابائے نباتات (Father of Botany) کا خطاب دیا گیا تھا۔ تاہم توہم پرست لوگوں سے وہ بھی نہ بچ سکا۔ یہ تو ان دنوں کی بات ہے جب لوگ سائنس کے بنیادی علم سے بے بہرہ تھے لیکن دورِ حاضر میں تو سائنس نے کافی ترقی کرلی ہے لیکن پھر بھی توہم پرست لوگ موجود ہیں۔

Reference: Agrios, G.N. 2005. Plant diseases as the wrath of gods-theophrastus. In, "Plant Pathology" (Fifth Ed.) pp 9-13. Academic Press, New York.

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری

بیوی میرے ہزار کہنے پر بھی اہتصام اور قاسم کو ساتھ لانے پر تیار نہیں ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ لیکن وہ وقت آئے گا ضرور اُسے امید تھی۔

''ان شاء اللہ امید ہے اور ہمیشہ رہے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھیں عجیب انداز میں جگمگانے لگتی تھیں۔ مجھے اس کی امید سے جگمگاتی آنکھیں ایک طرح شرمندہ کردیتی تھیں کیونکہ جب بھی میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا امید کو اتنا روشن کبھی نہیں پایا۔

''تم اپنے بیگ میں کیا کیا رکھ رہی ہو؟''

میں اُسے بیگ میں ایک ہفتے سے کچھ نہ کچھ رکھتے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی تیاری عروج پر تھی لیکن وہ اپنے اس جوش اور جذبہ کو ہر ایک سے چھپا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی..... ایک نوٹ بک اُس کے بیگ کے ساتھ رکھی تھی۔ اُس دن مقررہ تاریخ میں ابھی دو دن باقی تھے..... میں نے کام پر جانے سے پہلے اس کی نوٹ بک کو اُٹھایا..... خدیجہ باورچی خانے میں میرے لیے کافی بنا رہی تھی۔

میں نے اس کی یادداشت کے نکات پر نظر ڈالی جو کچھ یوں تھی:

''چاکلیٹ، دودھ کا ڈبا، خوشبو کی شیشی، تصاویر، ایک بالوں کا برش۔''

ہونہہ..... تیاری تو دیکھو جیسے وہ وہاں اُسے ملنے دیں گے۔ مجھے تو ذرا بھی امید نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ وہاں ہے بھی یا نہیں..... اللہ کرے جو بھی ہو وہ ایسا ہو کہ اس کے اعصاب اُسے سہار سکیں۔

''لیجیے جناب! آپ کی گرما گرم کافی حاضر ہے۔''

خدیجہ کا جوش و جذبہ اور خوشی چھپائے نہ چھپتی تھی۔

میں نے کن انکھیوں سے اس کو دیکھا اور کافی کا پیالہ تھام کر کمرے کے واحد دریچہ کی طرف رخ کیا۔ اس دریچے کے سامنے کوئی منظر دور تک کھلا نہ تھا۔ ننھا سا صحن اور پھر اس کی دیوار..... ہمارا ایک کمرے کا یہ منا سا گھر جس میں ہم کئی مہینوں سے رہ رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے مقدس شہر القدس کا محلّہ ''المغربیہ'' جہاں ہمارا خاندانی گھر تھا، جس کے سامنے کا باغ تو بڑا تھا ہی لیکن پایاں باغ بھی ہمارے اس موجودہ گھر کا چار گنا تو ہوگا۔

مجھے دریچے کے سامنے بیرونی دیوار پر اپنے گھر کے مناظر نظر آنے لگے۔ زیتون کے درختوں اور سیب کی خوشبو سے مہکتا ہوا ہمارا گھر، دادا عماد الدین کی سفید براق ڈاڑھی جو مسلسل ہلتی رہتی جب وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر ہمارے کھیل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ چچا ہشام جن کی پیشانی اور کھڑی ناک ان کے مراکشی نسل سے ہونے کی گواہی دیتی تھی۔ دادا تو ہم کو بار بار یہ بھی بتاتے تھے۔ ورنہ ہمیں چچا ہشام کی وسیع پیشانی اور کھڑی ناک سے زیادہ ان کی توپ کی جیبوں اور ان کے طرح طرح کے کھیلوں کی ایجاد سے دلچسپی تھی۔

دادا، بابا، ہشام چاچا اور مجھے شام کو قہوہ کی چسکیوں میں اکثر اس بات کی چھوٹی چھوٹی تفصیل سنایا کرتے تھے جب اُن کا خاندان مراکش سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے جھنڈے تلے مسلمانوں کو صلیبیوں کے ظلم سے نجات دلانے کے لیے آکر شامل ہوا۔

یہ جولائی ۱۱۸۷ء کی بات ہے جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں سے ''حطین'' کی فیصلہ کن جنگ لڑی اور انھیں شکستِ فاش سے دوچار کیا اور اکتوبر ۱۱۸۷ء میں فاتح اسلامی افواج اپنے امیر کے ساتھ فلسطین میں داخل ہوئیں۔

''داداجان! تو کیا اس سے پہلے فلسطین میں مسلمان حاکم نہیں تھے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''کیوں نہیں تھے میرے بیٹے! مسلمانوں نے تو حضرت عمرؓ کے دور میں ۱۵ھ ہجری (۶۳۶ء) میں ہی فلسطین فتح کرلیا تھا اور امیر المومنینؓ نے خود یروشلم آکر وہاں کے صلیبی بطریق سے شہر کی چابیاں لی تھیں جو اس

نے ایک معاہدہ کے بعد خود حضرت عمرؓ کے حوالے کی تھیں اور خاص بات یہ کہ اس وقت مسلمانوں نے بغیر کوئی خون بہائے یہ کامیابی حاصل کی تھی۔''

''حضرت عمرؓ کو وہاں کے لوگوں نے یوں اپنے شہر کی چابیاں دے دی تھیں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں میری جان! عیسائی بطریق نے ہتھیار ڈالنے کی یہ ہی شرط رکھی تھی کہ امیر المومنین خود آکر اس کے ہاتھ سے شہر کی چابیاں لیں۔ اس وقت مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان وہ مشہور معاہدہ ہوا جسے تاریخ میں ''عہد العمریہ'' کہا جاتا ہے۔''

''یہ کس بات کا عہد تھا؟'' اس سوال کے پوچھنے والے چچا ہشام تھے۔

دادا ہلکی سی مسکراہٹ سے اُن کو دیکھتے اور سوال کی تہہ میں بیٹھا ہوا مقصد پا جاتے۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کا جواب دیتے۔

''اس معاہدے کی رو سے مقامی آبادی کو پہلی بار مذہبی آزادی حاصل ہوئی اور ان کے کلیساؤں کو بھی تحفظ دیا گیا۔ مسلمانوں کے حسن سلوک سے یہاں کی پوری آبادی جو کنعانیوں اور فلسطینیوں پر مشتمل تھی مسلمان ہوگئی۔ اُسی دور میں مقام معراج پر گنبدِ خضریٰ جیسی خوبصورت عمارت تعمیر کی گئی۔ مقامی آبادی عرب سے آنے والوں کے ساتھ اُن کے انصاف اور رواداری کے باعث خوب گھل مل گئی۔ خوش حالی کا دور شروع ہوا۔ اب مقامی اور غیر مقامی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ عربی زبان سب کی زبان بن گئی۔''

''پھر صلاح الدین ایوبی کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہوئی؟''

بابا بھی چچا ہشام کے انداز میں سوال پوچھتے۔ اور دادا اُسی طرح میری طرف رُخ کرکے جواب دیتے جیسے سوال کرنے والا میں ہوں۔

بیٹا مسلمانوں کی حکومت جاری تھی لیکن ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے القدس پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہوگئے۔ خوب لوٹ مار مچائی۔ یہاں تک کہ انسانی خون سے گھوڑوں کی ٹانگیں ڈوبنے لگیں۔''

''یا اللہ اتنا خون بہایا؟'' میرے دل میں گھبراہٹ سی ہوئی۔

''ہاں ۸۸ سال تک صلیبی یہاں مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں لگے رہے۔ آخرکار ایوبی تلوار میدان میں آئی، جس نے مسلمانوں کو اُن کے ظلم سے نجات دلائی۔ حطین کی فیصلہ کن جنگ میں مسلمانوں نے صلیبیوں کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے ''محلّہ المغربیہ'' کا یہ قطعۂ زمین اُن مراکشی مجاہدوں کے لیے وقف کردیا جنھوں نے صلیبیوں کے مقابلے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔''

''تو ہم اُن مراکشی مجاہدوں کے وارث ہیں؟'' چچا ہشام کی پُرجوش آواز آئی۔

''ہاں میرے بچو! ہم اُن کے وارث ہیں اور یہ محلّہ المغربیہ مسلمانوں کی وقف جائیدادیں ہیں۔ یہودی چال بازی کے ساتھ اُن پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ دیکھتے ہو نہ کہ 'ابوغنیم کی پہاڑی' یہودی کالونی بن گئی ہے۔''

''ہاں بابا یہودیوں کی نیت ٹھیک نظر نہیں آتی..... مجھے اُن کے ہاتھوں سے خون ٹپکتا محسوس ہوتا ہے۔''

''ہاں لیکن یہ جگہ ہم خالی نہیں کریں گے۔ ہرگز خالی نہیں کریں گے۔ بدذات یہودیوں کے لیے۔'' دادا کی آواز مستحکم اور پُرعزم تھی۔

بابا نے دادا کے قول کو نبھایا۔ اگرچہ یہاں رہنا انتہائی خطرناک ہوگیا تھا۔ ہر لمحہ حملے اور بلوہ کا ڈر۔ خبر آتی کہ فلاں فلاں محلے میں یہودیوں نے دھاوا بولا اور شقاوت اور درندگی کی ساری حدیں پھلانگ ڈالیں۔ سب سے پہلے بلاۃ الشیخ پھر جبرون، ابوقیصر، دیر یاسین، خان یونس، قلقیلیہ آئے دن ایک ہولناک خبر آتی۔

آخر ان ہی حالات میں میری شادی ہوئی۔ خدیجہ میری زندگی میں آئی۔ دادا اور بابا کے قول کے معاملے میں میں ڈگمگاتا تو خدیجہ آگے بڑھ کر مجھے سہارا دیتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں یحییٰ حسینی ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ ان شقی یہودیوں کے لیے اپنے محلے کو چھوڑ کر ہم کہیں نہیں جائیں گے۔''

حالات خراب تھے۔ المغربیہ کے مسلمان ہمت کے ساتھ ڈٹے تھے۔ یہودی ابھی اس محلّہ کو خالی کرانے میں دلچسپی لیتے نظر نہیں آتے تھے۔ وہ ابھی اپنی سرحدوں میں اضافہ کے لیے کوشاں تھے۔ شاید اُن کے ذہن میں تھا کہ اُس پر تو ہم جب چاہیں قابض ہو جائیں گے۔

وہ ایک سخت گرم دن تھا۔ میں کام سے گھر سے نکلا تو دوبارہ اُس گھر میں جانا نصیب نہیں ہوا۔ الجواہریہ کے پاس انھوں نے مجھے گھیر لیا۔ بغیر کسی بات کے انھوں نے مکوں اور گھونسوں کی بوچھاڑ شروع کی۔ ابتدا میں میں نے مدافعت کی لیکن میں تنہا اور وہ پورا جتھا...... بے ہوش ہو کر گرا تو ہوش آنے کے بعد اپنے آپ کو جیل کی تنگ کوٹھڑی میں پایا۔

۱۰ر سال کی اس قید کے دوران مجھے اپنے بچوں کی شکلیں بھی بھول گئی تھیں۔ خدیجہ ایک دفعہ ابتدا میں مجھ سے ملنے آئی تو میں نے آئندہ آنے سے سختی سے منع کر دیا اور بچوں کو لے کر فوراً فلسطینی کیمپ کا رخ کرنے کو کہا۔

دادا اور بابا تو پہلے ہی اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ بعد میں چچا ہشام کے بارے میں خدیجہ نے خط میں بتایا کہ اسرائیلی فوج انھیں بھی گرفتار کر کے لے جا چکی ہے۔

خدیجہ میری ہدایت پر بچوں کو لے کر کیمپ چلی گئی تھی۔ میں مطمئن تھا۔ کال کاٹھڑی میں بھی پُر امید تھا۔ اسرائیلیوں کے غیر انسانی سلوک کا اندازہ کسی دوسری جیل کا قیدی نہیں لگا سکتا۔ بس ایک پتھریلی زمین تھی جس میں ہم کو پھینک دیا گیا تھا۔ انتہائی ناکافی خوراک اور اذیت دینے کے نت نئے گُر......

ایک صبح میں کوٹھڑی میں بیٹھا سورج کی اُس کرن کا انتظار کر رہا تھا جو ایک دیوار پر کبھی کبھی نظر آتی تھی۔ نہ جانے کیسے اور کس رخ سے وہ کوٹھڑی میں داخل ہوتی تھی میرے ہزار سراغ لگانے کے باوجود مجھے کبھی پتا نہ چل پایا۔ شاید یہ اُس امید کا استعارہ تھی جو میرے دل میں جاگتی تھی۔ ہزار اندھیروں کے باوجود......

چابیوں کو کھنکھناتا ہوا فوجی کوٹھڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ میں نے چونک کر اس کو دیکھا...... اُس کی آنکھوں کی سفاکی میں کسی چیز کی ملاوٹ تھی...... یہ وہ آنکھیں نہیں تھیں جو مجھے اذیت خانے لے جاتے ہوئے نظر آتی تھیں جوش اور خوشی کے ساتھ ملی جلی سفاکیت سے لبریز...... آج کچھ بجھی ہوئی تھیں۔

''کیا بات ہے؟ کہاں جانا ہے؟''

اُس کے باہر نکلنے کے اشارے پر میں نے پوچھا۔

''چُپ چاپ باہر آجاؤ۔'' وہ غرایا۔

طویل راہ داریاں طے کرتے ہوئے وہ مجھے کسی انجان جگہ لے جا رہا تھا۔ شاید آخری نیند سلانے یا موت کی وادیوں میں اُتارنے کے لیے...... اس سوچ کے ساتھ ہی میری زبان پر کلمہ اشہد ان لا الٰہ جاری ہو گیا۔ میں نے دل ہی دل میں خدیجہ اور بچوں کو خدا حافظ بھی کہہ دیا۔

لیکن وہ مجھے جیل سے باہر لے آیا جہاں بہت سے دوسرے فلسطینی قیدی بھی موجود تھے۔ پتا چلا کہ ہمیں ایک اسرائیلی فوجی کے بدلے میں رہا کیا جا رہا ہے۔ میں نے سجدہ شکر ادا کیا۔ میری ننھی امید کی کرن روشنی پھیلا چکی تھی۔

مجھے آزادی مل گئی۔ کیمپ میں خدیجہ اور بچوں سے ملاقات بھی ہو گئی۔ قاسم اور ابتصام میرے قد سے اونچے ہو چکے تھے۔ ''مراکشی نقوش کے جوان رعنا عنقریب القسام بریگیڈ میں شامل ہونے والے ہیں۔'' یہ خدیجہ نے مجھے فخریہ بتایا۔ اونچے قد اور چوڑے سینے والے بیٹوں کے سامنے تو اب میں بالکل مرنجان مرنج قسم کا ایک عمر رسیدہ شخص لگتا تھا۔

''میرا ہشام، میرا ننھا......؟؟

کہاں ہے؟ میرا ہشام یوسف؟''

یک دم میں نے چونک کر یاد کیا۔ شکلیں بھولی تھیں تعداد تو نہیں......

میں نے پلٹ کر خدیجہ سے پوچھا۔

قاسم اور ابتصام کو جھنجھوڑا......

سب خاموش تھے۔ دم سادھے......

''کیا ہوا؟ کیوں خاموش ہو؟''

میں نے تلخی سے پوچھا۔

خدیجہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لائی۔ بستر پر بٹھایا۔ قاسم کو اشارہ کیا۔ قاسم کوئی ٹھنڈا مشروب لے آیا۔

میرے ہاتھوں نے اُس کی ٹھنڈک محسوس کی۔ شدت کی گرمی میں ٹھنڈا نہیں، میں تو برسوں پانی کو بھی ترسا رہا تھا۔ لیکن اس مشروب کا گلاس میرے لبوں تک نہیں جا سکا۔

میں نے گلاس کو سختی سے تھاما۔ یہ ٹھنڈا شربت میرے ہاتھ میں برسوں بعد آیا ہے۔ ''لیکن میں اسے نہیں پیوں گا۔ جب تک تم لوگ ہشام کے بارے میں مجھے آگاہ نہیں کرو گے۔'' شاید وہ شہید ہو گیا ہے۔ میں نے ایک لمحہ کو سوچا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو یہ یوں گم صم نہ ہوتے...... مطمئن ہوتے......

''کیا بات ہے؟ کچھ تو بتاؤ......''

میں نے اب کہ ذرا دھیمے سے پوچھا۔

''یحییٰ حسینی!'' خدیجہ نے میرا نام رک رک کے لیا...... ذرا صبر...... ذرا صبر...... ذرا ٹھہرو تو...... دم تو لو...... اچھا بس یہ شربت پی لو میں پھر تمھیں ساری بات بتاتی ہوں۔''

''ہرگز نہیں۔'' میں پھر چلا اُٹھا۔

''اچھا اچھا بتاتی ہوں یحییٰ غصہ نہ کرو۔''

خدیجہ کی آنکھیں نم ہو چلی تھیں۔

''ہشام ہمارے پاس نہیں ہے......''

''ہشام کہاں ہے یہی تو پوچھ رہا ہوں......'' میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو ہو رہا تھا۔

''المغربیہ کے محلے سے نکلتے ہوئے وہ وہیں تھا اُسی گھر میں......'' میں نے حیرت سے خدیجہ کو دیکھا۔

''ہاں میں قاسم اور ابتصام کے ساتھ گھر واپس آ رہی تھی۔ گھر میں ہشام اور چچا تھے۔ اسرائیلی فوجیوں نے مجھے واپس گھر نہیں جانے دیا۔ انھوں نے محلے کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ لوگوں کو گھر سے نکال نکال کر مار رہے تھے۔ ایک بھگدڑ تھی۔ افراتفری کے عالم میں میں نے قاسم اور ابتصام کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ انھیں اپنے ساتھ رہنے کا کہا۔ ورنہ اس بھگدڑ میں یہ بھی گم ہو جاتے۔

بھلا بتاؤ حسینی میں اس گھر میں دوبارہ جا سکتی تھی؟ اسرائیلیوں کا محاصرہ اور خون کے پیاسے درندے......''

''پھر...... پھر چچا ہشام نے میرے بیٹے کی حفاظت کی؟''

''ہاں انھوں نے حفاظت کی...... حسینی جہاں تک وہ کر سکتے تھے۔''

''پھر...... پھر کیا ہوا؟''

''بس اس سے آگے مجھے کچھ خبر نہیں...... میرا لال میرا شہزادہ ہشام یوسف کہاں ہے؟ ہے بھی یا نہیں؟ چچا ہشام کے ساتھ یہودیوں نے ہشام کو بھی پکڑ لیا تھا۔ معصوم پالنے کا قیدی...... اس وقت چھ ماہ کا ہی تو تھا۔

آنسوؤں کی نہ ختم ہونے والی برسات تھی۔ جو ہم سب کی آنکھوں سے جاری تھی۔ کتنے ماہ گزر گئے لیکن یہ سب ابھی کل کی ہی بات لگتی ہے۔ زخم ایسا تھا کہ بھرتا ہی نہ تھا۔

کل خدیجہ ایک انوکھی خبر لائی۔

یہودیوں کا عید کا دن۔ انھوں نے القدس شہر کے باسیوں کو وہاں کی زیارت اور داخلے کی اجازت دی ہے۔ لیکن کوئی ثبوت لازم ہے اس بات کا کہ وہ قدیم شہر کے باسی ہیں۔

خدیجہ کے پاس قاسم اور ابتصام کا پیدائشی کاغذ تھا۔ کیونکہ اس دن وہ انھیں سکول کے داخلے کے لیے ہی لے کر نکلی تھی۔ خدیجہ کو یقین تھا کہ یہ ثبوت کافی ہوگا۔

بات صحیح نکلی...... اسرائیلیوں نے ہم دونوں کو کاغذ دیکھ کر داخلے کی اجازت دے دی۔ راستے بڑے انجان تھے۔ نئے محلے بن گئے تھے۔ وہ جدید ترین سڑکوں اور ٹریفک کے اشاروں کے ساتھ ایک نیا انجان شہر تھا جس سے ہم واقف نہیں تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ٹیکسی ڈرائیور جو شکل سے کچھ کچھ فلسطینی عرب لگ رہا تھا۔ ہم نے اُسے روکا اور محلّہ المغربیہ جانے کے لیے کہا۔ وہ فلسطینی ہی نکلا جو کسی اسرائیلی کی ٹیکسی کرایہ پر چلاتا تھا۔

اس کا نام عبداللہ باسم تھا۔

المغربیہ کی بیرونی سڑک پر اتار کر وہ خوش دلی سے بولا ”واپسی کے لیے مجھے اس نمبر پر کال کر لینا۔“

میں نے سر ہلایا۔

محلّہ ابھی اتنا تبدیل نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ کافی جدید گھر بن چکے تھے۔ ہماری گلی کا آخری گھر جو ہمارا تھا ابھی تک ویسا کا ویسا ہی تھا۔

موٹی دیواروں اور وسیع باغوں کے ساتھ لیکن صدر دروازہ بدل دیا گیا تھا۔ موٹی لکڑی کا تراشا ہوا ایک بڑا گلاب کا پھول صدر دروازے کے اوپر لگا تھا۔

خدیجہ نے جلد بازی سے اطلاعی گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔

”کون ہے؟“

ایک سیاہ حبشی چپٹی ناک والا دروازہ کھول کر باہر آیا۔

”کیا بات ہے؟ کون ہو؟“

”ہمیں تمھاری مالکہ سے ملنا ہے۔“

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

”کون ہو تم؟“

”اپنی مالکہ سے کہنا ہم حکومت سے اجازت لے کر آئے ہیں اور اس گھر کے اصل مالک ہیں۔“

حبشی نے غور سے ہم دونوں کو دیکھا اور گھونگر بھرے سر کو کھجاتا ہوا چلا گیا۔

”انگلیاں اُس کے سر کی جلد تک پہنچ پاتی ہوں گی؟“ میں نے خدیجہ سے مسکرا کر کہا۔ خدیجہ بھی دھیرے سے مسکرائی اور یہی میرا مقصد تھا۔ ذہنی دباؤ سے آزادی......

دروازہ کھٹ سے کھلا۔ وہی حبشی تھا۔ سیاہ ہونٹوں سے سفید دانت جھانک رہے تھے۔ شاید مسکرا رہا ہے۔ میں نے سوچا۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

دروازے کے سامنے والی دیوار خالی تھی۔ القدس کی سنہری جالیوں اور گنبد والی پینٹنگ وہاں سے ہٹا لی گئی تھی۔

راہ داری سے گزرتے ہوئے دریچے سے باغ کا منظر سامنے تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا۔ زیتون، سیب اور آڑو کے درخت البتہ اب بوڑھے بوڑھے سے لگ رہے تھے۔ درمیان کا کنول نما فوارہ موجود تھا لیکن اس کی کئی پتیاں موجود نہیں تھیں۔

دریچے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم دونوں ہی کے قدم جم سے گئے۔ نظروں کے سامنے عماد دادا، ہشام چاچا اور بابا کی شکلیں گزر رہی تھیں۔ آرام کرسی پر بیٹھے دادا کی سفید براق ڈاڑھی ہلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ہاں وہ آرام کرسی کہاں ہے۔

ہم عموماً اسے راہ داری میں ہی رکھتے تھے اور پھر جہاں دادا چاہتے تھے اُسے پہنچا دیا جاتا...... نئے مالکوں نے زیادہ تبدیلیاں نہیں کی ہیں۔

”آیئے جناب...... ڈرائنگ روم اُدھر ہے۔“

حبشی کی آواز سے ہم دونوں پھر اپنے خیالوں سے واپس آ گئے۔

ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہم نے غور سے ہر شے کو دیکھا۔ حبشی اب جا چکا تھا۔

فرنیچر کچھ تبدیل کیا گیا تھا لیکن ترتیب تقریباً ویسی ہی تھی۔ آتش دان کے سامنے چھوٹا ایرانی قالین بچھا تھا۔ پرانا تو وہ پہلے ہی بہت تھا لیکن اب تو اس کے دھاگے نکل رہے تھے۔

خدیجہ عین اس ایرانی قالین کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ ”ارے کیا کر رہی ہو نیچے نہیں اوپر بیٹھو۔“ میں یہ بات کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ میرے کہنے سے پہلے پیچھے سے آواز آئی۔

مڑ کر دیکھا۔

ادھیڑ عمر انگریز جو ظاہر ہے یہودی ہوگا...... لیکن خدوخال کچھ مختلف تھے۔ چہرے پر وہ درشتگی نہیں تھی۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے بڑھ کر تھام لیا۔ اس نے اپنا نام بتایا۔

”تھامس ایڈورڈ...... آئرلینڈ سے آیا ہوں۔“

یحییٰ حسینی...... اس گھر کا قدیم مالک۔“

”ہوں......“ اس نے دلچسپی سے سنا اور سامنے پڑے دیوان پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

خدیجہ ابھی بھی وہیں بیٹھی تھی۔ بوسیدہ قالین کے نکلے ہوئے دھاگوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

یحییٰ! ہشام کو آخری دفعہ میں نے یہاں لِٹایا تھا۔ اسی قالین پر...... اب وہ مجھے کہاں ملے گا؟“

”یہ کس کی بات کر رہی ہے؟“

تھامس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہمارا بچہ جسے تم لوگوں نے چھین لیا...... خدا کے لیے بس یہ بتا دو کہ وہ کہاں ہے؟ زندہ ہے یا مار دیا؟“ مجھ سے پہلے وہ بول اٹھی۔

خدیجہ کی دلگیر آواز نے ماحول کو بے حد سوگوار کر دیا تھا۔ اگرچہ حبشی گرم قہوہ کی سینی مٹھائی اور زیتون رکھ کر گیا تھا۔ یہ یہودی مہمان نواز ہے۔ شاید اس نے میرے بیٹے کو اچھی طرح رکھا ہو۔ میں نے سوچا۔

تھامس ابھی تک سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”دیکھیے جناب میری بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ باہر تھی جب اسرائیلی فوج نے اس گھر کا محاصرہ کیا۔ یہاں ہمارا چھوٹا بچہ اور میرا چچا موجود تھا۔ ہمیں پھر یہاں آنے نہیں دیا گیا۔ چچا کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا جبکہ مجھے تو اس سے بہت پہلے جیل میں پھینکا ہوا تھا۔ اب ہم آپ سے ہرگز اس گھر اور یہاں کی کسی چیز کے بارے میں سوال کرنے نہیں آئے۔ اپنے بیٹے کے بارے میں معلوم کرنے آئے ہیں۔ خدا کے لیے ہماری امیدوں کو خاک میں نہ ملائیے گا۔“

”اچھا تم مائیکل کے ماں باپ ہو۔“

یہ آواز ایک عورت کی تھی جو ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑی تھی اور اندر کے معاملے کا جائزہ لے رہی تھی۔

”لیکن اب مائیکل ہمارا بیٹا ہے اور ایک یہودی ہے......“

”نہیں ہرگز نہیں...... وہ ہرگز ایک یہودی نہیں ہو سکتا۔“

خدیجہ یک دم قالین سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سرخ انگارہ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں گر رہی تھیں۔

”ہونہہ کوئی ماں باپ ۶/ ماہ کے بچے کو چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟“

”لیکن ان کا چچا اس کے ساتھ تھا۔“

”سب ڈھکوسلہ ہے۔ دراصل سارا قصور تمھارا ہے۔“

گوری عورت نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کر کہا۔

”مائیکل گھر پر ہے؟“

تھامس نے بیوی سے پوچھا۔

اس کے جواب سے پہلے ایک اونچا لمبا لیکن دبلا لڑکا دروازے پر کھڑا تھا۔ سرخ آدھی آستین کی شرٹ اور سیاہ برمودا پہنے ہاتھوں میں اسنیکر ز تھے جن کی ڈوریاں زمین کو چھو رہی تھیں۔

”مام مجھے زیتون کے اچار والے سینڈوچ پسند ہیں۔ آپ ہمیشہ اس کے بغیر بنا دیتی ہیں۔“

”مائیکل اِدھر آؤ...... اِن سے ملو۔“

”او کے...... مجھے جانے کی ذرا جلدی ہے اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

”نہیں ٹھہرو یہ ذرا اہم بات ہے۔“

خدیجہ اور میری سانسیں الجھ رہی تھیں...... ہشام کے نقش اپنے بھائیوں سے مختلف تھے۔ لیکن کھڑی مراکشی ناک ہو بہو چچا ہشام کی طرح تھی۔

”مائیکل یہ تمھارا دعویٰ لے کر آئے ہیں؟“

”ہاں انھیں تمھارے ماں باپ ہونے کا دعویٰ ہے۔ ہم نے مائیکل سے کچھ نہیں چھپایا۔“ تھامس کی بھی آواز آئی جس نے ایک لمحے کو میری طرف بھی دیکھا، جتا دینے کے انداز میں......

مائیکل ساکت ہو گیا۔ چند لمحے بعد سنجیدگی سے بولا۔

”مجھے پتا ہے کہ مام ڈیڈ میرے اصل ماں باپ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

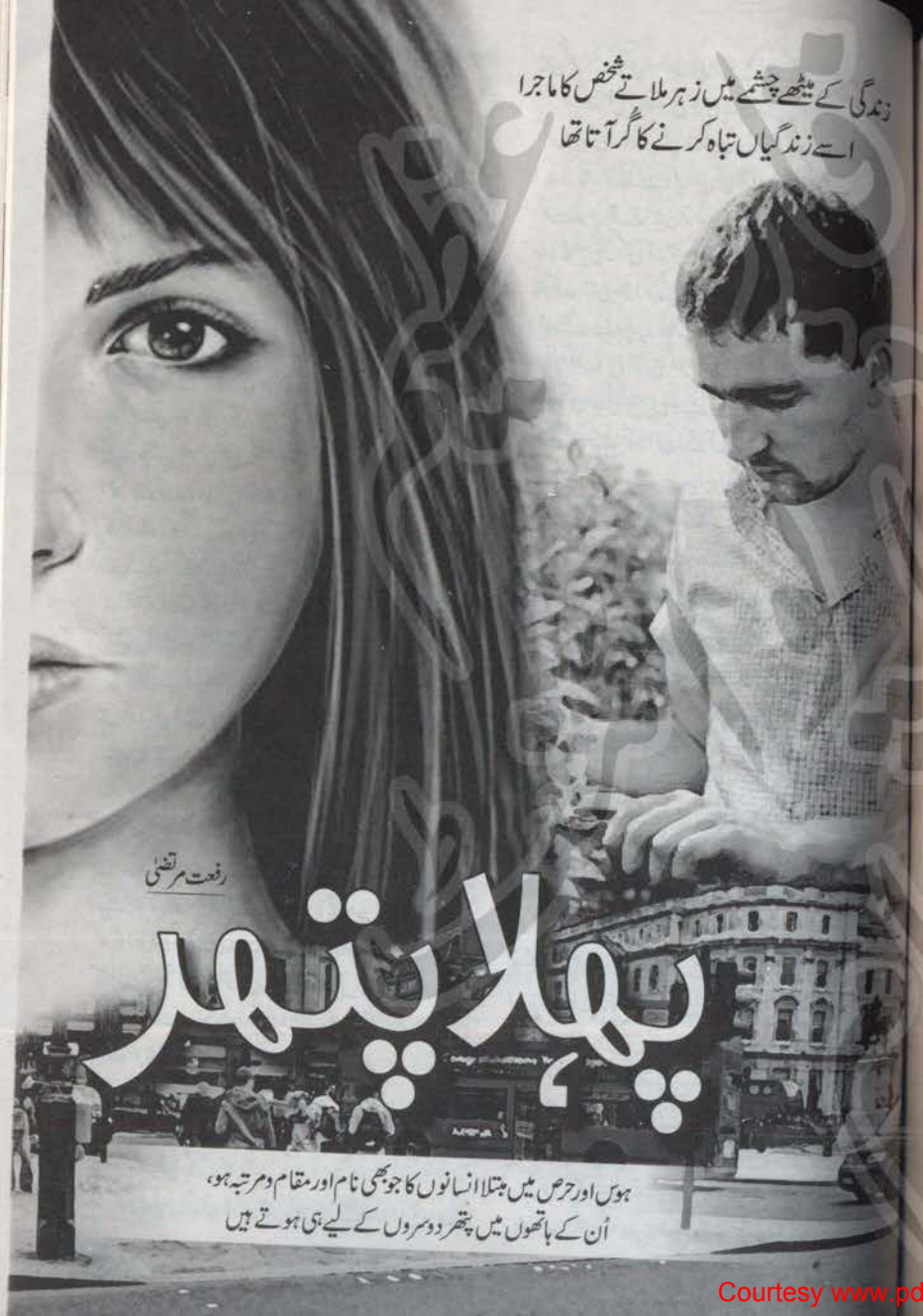

ہیں۔ لیکن مجھے اپنے اصل ماں باپ کی ذرا پروا نہیں ہے۔ کیونکہ انھوں نے بھی میری ذرا پروا نہیں کی۔ ۶/ ماہ کے بچے کو کوئی ماں چھوڑ کے جاتی ہے؟''

اس نے خدیجہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ سرخ غم کی آگ سے دہکتی آنکھیں۔ مائیکل نے سر گھما لیا۔

ہم خود چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ یہ اسرائیلی فوج تھی جس نے ہم کو واپس نہیں آنے دیا۔

''سب ڈھکوسلہ ہے۔'' وہ ہی رٹا رٹایا جواب تھا۔

ٹھیک ہے تم ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو اپنے مام ڈیڈ کے ساتھ رہو۔ بس ایک بات کا تم سے وعدہ لینا ہے۔ اسرائیلی فوج میں شمولیت اختیار نہ کرنا۔ ورنہ وہاں تمھیں اپنے دونوں بھائیوں کے مقابل آنا پڑے گا۔

خدیجہ کی سرخ آنکھوں میں ایک سرد مہری سی در آئی تھی۔ یہ ہشام نہیں مائیکل ہے۔ اس نے یقین کر لیا تھا۔

''میں نہیں چاہتی کہ وہ تمھیں آگ کا ایندھن بنائیں۔ چلو یحییٰ ہماری تلاش ختم ہوئی۔'' خدیجہ نے میرا ہاتھ پکڑا۔

''میری بھی برداشت ختم تھی۔...... ہمیں واپس جانا چاہیے۔'' ہم دونوں تیزی سے صدر دروازے سے باہر نکل گئے۔

فاصلے قدموں میں لپٹ رہے تھے۔ میں نے عبداللہ باسم کو کال ملائی۔ گلی کے اختتام پر ہمیں تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ خاموشی کا دبیز پردہ مزید دبیز ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے آنسو چھپانا چاہتے تھے۔ ٹیکسی میں ہم دونوں کھڑکی سے باہر نظر جمائے رہے۔ اچانک موبائل کی گھنٹی نے خاموشی کا دبیز پردہ چاک کر ڈالا۔ یہ عبداللہ باسم کا موبائل تھا۔ چند لمحے عبداللہ نے موبائل کانوں سے لگا کر مجھے دے دیا۔ ''آپ کا فون ہے۔''

''کون؟'' میں حیران تھا۔

''میں ہوں آپ کا ہشام...... بابا...... مام ڈیڈ کے سامنے ڈراما کرنا لازم تھا...... بھلا وہ اور اسرائیلی حکومت صحیح سالم آپ کے ساتھ جانے دیتی؟'' میں ششدر سا رہ گیا۔ پھر میرے منہ سے بے یقینی کے عالم میں نکلا ''تمھارے پاس عبداللہ کا نمبر کیسے آیا؟''

اس کو میں جانتا ہوں۔ اس کو یہ ٹیکسی مام ڈیڈ نے ہی کرایہ پر لے کر دی ہے۔ بس آپ جایئے اور اپنا اور مما کا خیال رکھیے۔ ان شاء اللہ میں بھی جلد آپ سے ملنے آؤں گا اور پھر ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گا......''

اب میں سوچ رہا تھا کہ یہ اتنی بڑی خوشی کی خبر خدیجہ کو کس انداز میں سناؤں کہ اس کے اعصاب سلامت رہیں۔ ایک بات تو بہرحال طے ہے کہ بے شک امید اس کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے اور دوڑے ہی چلی جاتی ہے۔ ■

مستقبل پر نظر، حال نظر انداز

ایک شاگرد نے درویش سے پوچھا ''انسان کے بارے میں سب سے مضحکہ خیز بات کیا ہے؟''

درویش نے کہا ''اس کی سوچ میں کجی ہوتی ہے۔ وہ جلد بڑا ہونے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ بعد میں وہ اپنے بچپن کے گزرے دنوں پر افسوس کرتا رہتا ہے پھر جلد اس رقم سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو صحت برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔''

انسان مستقبل کے بارے میں اس قدر فکر مند ہوتے ہیں کہ اپنے حال کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ نہ زمانۂ حال میں رہتے ہیں اور نہ مستقبل میں۔ وہ اس طرح زندہ رہتے ہیں جیسے وہ کبھی نہیں مریں گے اور اس طرح مر جاتے ہیں جیسے وہ کبھی زندہ رہے ہی نہ ہوں۔

(پائلو کوہلو کی کہانیوں سے انتخاب)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگی کے میٹھے چشمے میں زہر ملاتے شخص کا ماجرا
اسے زندگیاں تباہ کرنے کا گر آتا تھا

پہلا پتھر

رفعت مرتضیٰ

ہوس اور حرص میں مبتلا انسانوں کا جو بھی نام اور مقام و مرتبہ ہو،
اُن کے ہاتھوں میں پتھر دوسروں کے لیے ہی ہوتے ہیں

اُس

دن فاطمہ کے گھر پہلا پتھر پڑا۔

مگر اس سے پہلے امام صاحب نے مُڑ کر فاطمہ کی طرف دیکھا اور احمد سے کہا ''گھر آپ کو مل جائے گا۔ اس کی آپ فکر نہ کریں۔'' اور اپنی طرف سے بات ختم کر کے پھر سے گاڑی کی ڈِکی سے ایک کے بعد ایک کر کے چیزیں نکالنے اور زمین پر بچھے تولیے پر رکھنے لگے۔

احمد کچھ دیر چُپ کھڑا ان کے مصروف ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے بھی مُڑ کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔ برستی بارش میں وہ نیلے رنگ کا رین کوٹ پہنے درخت کے نیچے چُپ چاپ کھڑی تھی۔ ٹیکسی والا انھیں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ احمد نے اُسے کہا بھی تھا کہ وہ انتظار کرنے کے پیسے دے گا مگر وہ رُکا نہیں۔ اُس کے ساتھ جہاں تک کا طے ہوا تھا اُس سے آگے وہ جا نہیں سکتا تھا۔

احمد نے پھر امام صاحب سے کہا ''تو صاحب پھر کب پتا چلے گا؟''

''آپ ایسا کریں۔ اپنا فون نمبر مجھے دے دیں۔ میں خود ہی آپ کو بتا دوں گا۔'' انھوں نے احمد کی طرف دیکھے بنا کہا۔

احمد فاطمہ کے پاس آیا اور اُس سے کاغذ پر ہوٹل کا فون نمبر لکھوا کر امام صاحب کے پاس واپس آیا اور پُرزہ اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ انھوں نے کاغذ کی طرف دیکھے بنا اُسے اپنی جیب میں رکھا۔ پھر سیدھے کھڑے ہو کر گاڑی کا بونٹ بند کیا اور احمد کی طرف رُخ کر کے ''السّلام علیکم'' کہا اور تولیے پر رکھی چیزیں سمیٹ کر گھر کے اندر چلے گئے۔ احمد کچھ دیر کھڑا لال رنگ کے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر پلٹ کر فاطمہ کے پاس آ گیا۔

''چلو.....''

''کیا ہوا؟'' فاطمہ نے آہستہ سے پوچھا۔

''گھر مل جائے گا۔''

اور دونوں برستی بارش میں تیز تیز چلتے..... اپنی سوچ میں گُم..... ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف چلے گئے۔

گھر مل جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ بن بھی جاتے ہیں مگر ان کی مضبوطی کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔ کتنا ہی اینٹ پتھر کوٹ کوٹ کر اُن کی بنیادوں میں بھر دیں، جب گرنے پر آتے ہیں تو ریت کی دیواروں کی طرح گر جاتے ہیں۔ کبھی آندھی طوفان کاغذی محلوں کی طرح ایک پھونک میں اُڑا دیتے ہیں اور کبھی بنا کسی طوفان، کسی اشارے کے، چُپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں۔ فاطمہ کا مرمر کا بنا ہوا گھر اُسی طرح کھڑا تھا۔ اُس کے اندر شیشے کی طرح چمکتی سجی سجائی چیزیں ویسے ہی چُپ چاپ اپنی اپنی جگہ پر تھیں جو پہلے خود اس کے اپنے اندر کی خوشی اور حرارت سے زندہ تھیں، اب بے جان اور ازلی، ابدی سکوت میں گم ہو چکی تھیں۔ اس ممی خانے سے گھبرا کر اُس نے احمد سے کہا تھا ''مجھے یہاں سے لے چلو.....'' اور وہ اُسے واقعی وہاں چھوڑ کر آگے چلا گیا تھا۔ اب فاطمہ کو تنہا، اپنے ہی ساتھ، اپنی ناخوشی اور رنج کے ساتھ رہنا تھا۔ زندگی میں انسان کو کب کب اور کیسے کیسے دُکھ ملتے ہیں اور ہر بار یہی لگتا ہے کہ بس اب اس کے بعد کچھ باقی نہیں رہا۔ زندگی ختم ہو گئی لگتی ہے۔ لیکن پھر ہر بار کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ کچھ دیر آنسو بہا کر ہم پھر سے اس جینے کی دوڑ میں شریک ہو جاتے ہیں مگر جب کوئی افسردگی ڈیرہ ڈال کے بیٹھ ہی جائے..... جیتے جی جینے بھی نہ دے..... جینے کی دوڑ دوڑیں تو ساتھ ساتھ سائے کی طرح دوڑے..... کبھی پل بھر کو پیچھے رہ کر سوچنے پر مجبور کرے کہ زندگی سے منہا ہوا تو کیا ہوا؟ اور پھر پل بھر کے بعد ہی پھر سے برابر آئے اور زندگی اپنے ہاتھ میں لے کر بے اختیار کر دے..... کچھ ایسی ہی افسردگی تھی جس نے فاطمہ کو ولایت کے اس دور افتادہ کونے میں درختوں پر چھائی جنگلی بیلوں سے ڈھکی ایک بستی میں چُھپ جانے پر مجبور کیا تھا۔ احمد نے دو ایک بار اُسے کہا بھی کہ آخر وہ کیوں اُس کے ساتھ جانے پر تنہا رہنے کو ترجیح دے رہی ہے اور اگر تنہا ہی رہنا ہے تو پھر گھر پر ہی کیوں نہیں؟ اور فاطمہ نے ہر بار اُس کی بات پر دل

ہی دل میں کہا تھا..... کیسا گھر؟ اور چُپ رہی تھی۔ مگر جب وہ جواب کے انتظار میں اُس کے سامنے کھڑا ہی رہا تو بالآخر اُس نے کہا..... ''پتا نہیں۔ مگر مجھے یوں لگتا ہے میں نے اپنا آپ کہیں کھو دیا ہے۔ میں اسے پانا چاہتی ہوں.....''

وہاں یہاں سے پھر وہی بحث شروع ہو گئی تھی۔ جو کب سے جاری تھی اور جس کا کوئی نتیجہ اس کے سوا نہیں نکلتا تھا کہ دونوں ہی بول بول کر تھک جاتے، پھر بھی ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے سے قاصر رہتے ان دنوں ایک عجیب سے بدمزگی دونوں کے درمیان فاصلہ بن کر کھڑی ہو جاتی اور دونوں ہی ایسے دنوں میں موقعے موقعے سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور اندر ہی اندر اپنی سوچوں کے پیچھے بھاگتے رہتے۔

فاطمہ سوچتی..... احمد آخر میری بات سن کر بھی کیوں سمجھتا نہیں اب؟

اور احمد سوچتا۔ شاید میں نے اس کو کھو دیا ہے..... کیا اس کو کوئی جیت لے گیا ہے؟ اس قدر چُپ کیوں ہے یہ؟ اور خاموشی اور بھی گہری ہوتی چلی جاتی۔

..... اس دور افتادہ جنگل میں وہ کیا لینے آئی تھی! اُس کو خود بھی معلوم نہیں تھا مگر ایک اُمید سی پھر بھی تھی کہ شاید چند دن تنہا رہ کر وہ اس گنجلک کا کوئی ایک سرا تو ڈھونڈ ہی لے گی۔ شاید عورتیں جسم کے لوبھ سے جلد ہی نکل آتی ہیں اور پھر ذہنی رفاقتوں کے باغ ڈھونڈتی ہیں۔ کیا چیز تھی جو اُس کی زندگی سے منہا ہو گئی تھی۔ وہ عورتوں کو بچوں کے ہاتھ تھامے، قریب سے گزرتے دیکھتی تو ٹھٹھک کر کھڑی ہو جاتی۔ آتی جاتی عورتوں کو بہت غور سے دیکھتی۔ خریداری کرتی عورتیں، بھاؤ تاؤ کرتی عورتیں، بازاروں میں گھومتی پھرتی عورتیں، خریداری کے تھیلے اٹھائے، دھکے کھاتی عورتیں، شوہروں کے پیچھے چلتی عورتیں، بولتی عورتیں، چُپ چاپ عورتیں..... اور وہ اُن کو غور سے دیکھتی، قریب ہو کے دیکھتی اور سوچتی ان کا فاؤنٹین ہیڈ کیا ہے؟ ان کی زندگیاں کس سرچشمے سے حیات کا رس لیتی ہیں؟ کیا مطمئن ہیں؟ خوش ہیں؟ ان کے اندر جو ان کا اپنا آپ بیٹھا ہے وہ کیا ان کے باہر کے جیسا ہی ہے؟ یا ان کے بھی کچھ جن ایسے ہیں جن سے یہ اندر ہی اندر تھتھم گھتا رہتی ہیں؟ یہ اپنی زندگی اپنے لیے جی رہی ہیں یا کسی اور کی خاطر؟ یہاں ولایت میں بھی اُس نے ایک نظارہ بہت غور سے دیکھا تھا۔ گہرے رنگوں کے کفتان یا فراک یا پھٹی پتلونیں، چھوٹی چھوٹی نِکریں پہنے عورتیں، بالوں پر اسکارف باندھے اپنے گھروں کے چھوٹے چھوٹے باغوں میں چھوٹی چھوٹی کھرپیوں سے پھولوں، پودوں کی نگہداشت کرتی نظر آئیں اور وہ ان کے اس اطمینان اور شانتی کا راز جاننے کو بے چین ہو جاتی۔ شاید ان کی جذباتی اور عملی زندگیاں الگ الگ خانوں میں بڑے منظم طریقے سے رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ شاید اپنی خواہشوں کو ادھورا رکھنے میں وہ یقین نہیں رکھتیں۔ شاید جذبات کو اپنی زندگی پر مسلط نہیں ہونے دیتیں۔ جو چاہتی ہیں وہ حاصل بھی کرتی ہیں اور کسی کو چھین لے جانے کا حق نہیں دیتیں اور جو نہیں چاہتیں وہ اُن پر کوئی مسلط نہیں کر سکتا..... شاید اُن کے اس اطمینان اور سکون کا یہی راز ہو! تو پھر میں ایسے کیوں نہیں کر سکتی؟ میری زندگی کیوں بوڑھی عورت کی جھریوں کی طرح لٹک کر رہ گئی ہے؟؟ مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آتا۔

احمد نے ایک بار اُسے کہا تھا..... ''کس چیز کی کمی ہے تمھیں؟ کیا نہیں دیا میں نے تمھیں؟ مجھ میں کچھ کمی تھی کیا؟''

اور وہ چپ اُس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ بس یہی دو سوال؟ کھانا پینا، روپیہ پیسا، اوڑھنا پہننا اور اپنے موڈ اور مزاج اور خواہش کے تحت اپنی جسمانی بھوک مٹا لینا..... بس یہی دو باتیں؟؟ اور اُس نے دل میں کہا تھا..... ہاں احمد، روپیہ پیسا بھی دیا ہے تم نے..... جسم کی لذت بھی دی ہے تم نے، مگر یہ ساری چیزیں مجھے اُس وقت ملیں جب تم نے چاہیں۔ تم بھی یہی سوچتے ہو کہ بس یہی دو باتیں عورت کے لیے کافی ہیں؟ بس یہی اُس کی ضرورت ہے؟ نہیں سوچتے کہ وہ بھی انسان ہے، دل رکھتی ہے..... ذہن رکھتی ہے۔ دوستی، ساتھ اور ذہن کی سنگت بھی چاہیے اُسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احمد..... چاہتی ہے کہ احساس کے جنگل میں وہ تنہا نہ رہ جائے..... چاہتی ہے کہ کوئی پیر سے پیر ملا کر ساتھ چلے..... لوگ بیوی کو صرف بیوی سمجھتے۔ انسان نہیں سمجھتے۔ ایک فرد کی پہچان نہیں دیتے۔ کیا تم بھی؟ احمد کیا تم بھی؟ مگر اُس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ صرف ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔ اگر وہ جانتا تو یہ سوال ہی کیوں کرتا؟؟ اس بے نام سے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے ہال میں لگے آئینہ میں اپنا آپ دیکھا تھا اور ہنس دی تھی..... ایک معمولی عورت کا ایک غیر معمولی فیصلہ!! اور میرے ہاتھ میں ہے کیا؟ کیا میں خود کی دیکھ بھال کرلوں گی! اور کوئی ایسی خوبی بھی تو نہیں مجھ میں! پھر کیا سوچا ہے میں نے؟ اور آئینہ نے کہا تھا ''تنہائی۔''

''تنہائی!!'' وہ کچھ دیر رُک کر سوچتی رہی تھی۔

''مگر میں رہ لوں گی!''

تو پھر جب تم فیصلہ کرلینا تو میرے پاس آجانا..... آئینہ سے جھانکتے عکس نے جیسے سرگوشی کی تھی۔

مگر پھر اس کے بعد وہ آئینہ سے بچ بچ کر نکلتی رہی تھی۔ کیا فیصلے کا دن قریب آرہا تھا؟ کبھی لگتا ایک لیبر کیمپ ہو، زندگی نہ ہو..... جس کی بے سکھ، بے رحم فضا میں وہ اپنے آپ کو ختم کرنے کی ناکام کوششوں میں ہو۔ کبھی سوچتی وہ سائبیریا تو میں پیچھے چھوڑ آئی، پھر نجات کیوں نہیں؟ کہیں میرے فیصلے غلط تو ثابت نہیں ہورہے؟

پھر دنوں کے بعد ایک گرم دن آیا۔ شام بھی گرم ہو رہی تھی کہ بارش آگئی۔ فاطمہ دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑی گرتی بارش دیکھتی رہی۔ بالکل خالی ذہن..... وہ ساری راتیں جا چکی تھیں جب وہ رات رات بھر پڑھتی رہتی تھی۔ کبھی پڑھتے پڑھتے ایک دم چونک جاتی..... جیسے باغ کے رستے پر چلتا کوئی اُس کی طرف آرہا ہو۔ شاید احمد! شاید اپنے کاروباری دنوں کی مصروفیت کو روک کر اُس نے بھی کوئی فیصلہ کیا ہو۔ شاید وہ آخر کار جان گیا ہو۔ شاید وہ درمیان آتے فاصلوں کو پہچان گیا ہو..... شدت کے انتظار کے بعد وہ کتاب اپنے سینے پر اوندھا کر رکھ دیتی۔ کتاب یونہی اُسے کے سینے پر پڑی رہتی۔ رات گزرتی رہتی دور وقفے وقفے سے کوئی ٹرین گزرتی تو رات کی خاموشی تھرتھرا کر رہ جاتی۔ باہر اچانک کوئی کتا بھونکنے لگ جاتا۔ کوئی گاڑی گزر جاتی۔ کوئی رات کا پنچھی اپنی تنہائی پر روتا، ہُوکتا اس سناٹے میں کہیں گم ہوجاتا اور وہ سوچتی کیا سوچتی؟؟

یونہی کھڑکی کے پاس کھڑے، گرتی بارش کا تماشا کرتے اچانک باہر کا منظر دھندلا گیا۔ یہ کھڑکی کا شیشہ اُس کی سانس کی حرارت سے نم ہوگیا تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اُس کے لیے فیصلہ کردیا ہو۔ کچھ دیر وہ یونہی ساکت کھڑی رہی۔ پھر اُس نے اُنگلی سے اُس پر لکھا.....

''چپ''..... اور اُسی لمحے کسی نے اُس کے دروازے پر دستک دی۔ وہ جیسے ایک سکتے کے عالم میں اپنی جگہ پر جامد ہوگئی۔ پھر ایک سیلاب کی طرح ہزاروں خیالات آگے پیچھے دوڑتے اس کے ذہن میں آئے۔ یہ لمحے بھر کی کیفیت گزرتے ہی اُس کا پورا جسم ایک جھٹکا کھا کر یوں آگے بڑھا جیسے وہ ابھی بھاگتی ہوئی جا کر، دروازہ کھول کر آنے والے سے لپٹ جائے گی۔ جیسے اسے یقین ہو کہ آنے والا وہی ہے..... کوئی اور نہیں! جاتے جاتے دیوار کے آئینہ میں اُسے اپنا عکس نظر آیا۔ اُس کا چہرہ سفید ہو کر بھیانک نظر آرہا تھا۔ دیوار کا سہارا لے کر اُس نے زور سے سانس لی۔ پھر سیڑھیاں اُتر گئی۔ سامنے امام صاحب کھڑے تھے۔

''جی فرمائیے'' اُس نے دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''بات یہ ہے کہ میں نے سوچا آپ سے پوچھوں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں.....''

فاطمہ نے کہا ''جی شکریہ۔''

وہ فوراً بولے ''نہیں صاحب تکلف کی ضرورت نہیں۔ آپ کو روپے پیسے کی ضرورت ہو تو مجھے بتایئے..... میں حاضر ہوں خدمت کے لیے.....''

فاطمہ نے دروازے پر ہاتھ کرا ک تھوڑا سا اسے بند

کرنا چاہا۔ پھر کہا..... ''جی نہیں۔ آپ کا بہت شکریہ..... کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے.....''

''پھر بھی صاحب..... اگر کبھی کسی چیز کی ضرورت ہو آپ بلا تکلف مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔ میری گھر والی ذرا پاگل اور بے وقوف ہے وہ ایسی باتوں کو نہیں سمجھ سکتی مگر آپ مجھ سے بلا تکلف کوئی بھی کام لے سکتے ہیں.....''

اب کے انھوں نے بہت نڈر انداز میں فاطمہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور اپنا جملہ ختم کرتے ہوئے اس کے سراپے پر تک دیکھا۔

فاطمہ نے کہا ''جی بہتر.....'' اور پیچھے ہٹ کر خدا حافظ کہتے ہوئے زور سے دروازہ بند کردیا۔

اچانک امام صاحب کی عنایات میں اضافہ ہوگیا اور ایک حصار سا جو اُس نے اپنے آس پاس باندھ کر محفوظ ہوجانے کی کوشش کی تھی اُس میں رخنے پڑنے لگے۔ ایک صبح اُس نے دودھ کی بوتلیں اٹھائیں تو ساتھ میں کاغذ کے ایک تھیلے میں کچھ پھل بھی رکھے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کون رکھ گیا ہوگا۔ پہلے اُس نے یہی سوچا کہ اُٹھا کر اندر لے جائے۔ پھر سوچا کہ اُس نے تو نہ کسی سے کہا تھا لانے کے لیے اور نہ ہی کسی نے کہا تھا کہ بھیجیں گے..... وہ تھیلا یونہی دروازے کے پاس چھوڑ کر جانے لگی تو باڑھ کے پاس سے امام صاحب کی آواز آئی ''میں آپ کے لیے لایا تھا صاحب..... بازار گیا تھا آج۔ آپ سے پوچھنا یاد ہی نہ رہا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ بہرحال یہ ایک چھوٹی سی چیز خود ہی لے آیا۔''

فاطمہ نے کہا ''شکریہ! ویسے مجھے ضرورت تو نہیں تھی۔ فون کردیتی ہوں تو دکان والا خود ہی لا کر چھوڑ جاتا ہے۔ بہرحال آپ بتا دیجیے کتنے کے آئے ہیں۔ پیسے بھیج دوں گی آپ کے پاس۔''

''پیسوں کی کیا ضرورت ہے صاحب۔ اس کو آپ میری طرف سے ایک حقیر تحفہ سمجھیں۔'' انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اُس نے جواب نہیں دیا۔ صرف پھلوں کا تھیلا اُٹھا کر اندر چلی آئی۔ دوپہر کے بعد وہ اُن کے گھر گئی اور اُن کی بیوی کو بتا کر پیسے دے دیے۔

وہ سیدھی سادی عورت پہلے تو سمجھی نہیں پھر پیسے لینے سے انکار کردیا۔ کہنے لگی ''آپ تھوڑے دن کے لیے آئے ہیں۔ مہمان ہیں ہمارے۔ آپ ہیں بھی اکیلے اور تو کوئی خدمت ہم آپ کی کر نہیں سکتے۔ مزدور آدمی جو ہوئے۔ ایک یہ چھوٹی سی چیز ہی آپ قبول کرلیں۔ اگر امام صاحب میرے سے ذکر کرتے تو میں کوئی اور اچھی چیز آپ کے لیے لیتی۔ یہ پھل بھی کوئی دینے کی چیز ہوتی ہے.....''

فاطمہ کچھ دیر اُن کے پاس بیٹھی اُن کی باتوں میں دلچسپی لینے کی کوشش کرتی رہی۔ بہت سیدھی سادی عورت تھی جو اپنی آزاد کشمیر کی ساری روایتوں کو یہاں ولایت میں بھی زندہ رکھے ہوئے تھی۔ بچوں کے سر میں جوئیں بھی

قبولیتِ دعا کا امکان

ایک کسان نے جس کی بیوی بیمار تھی ایک درویش سے دعا کرنے کے لیے کہا۔ درویش نے دعا مانگنا شروع کردی کہ اللہ سب بیماروں کو صحت عطا فرمائے۔

کسان نے درویش کو رُکنے کا اشارہ کیا اور کہا ''جناب میں نے آپ سے اپنی بیوی کے صحت یابی کے لیے دعا کرنے کے لیے کہا تھا، آپ سب بیماروں کے لیے دعا کررہے ہیں۔''

درویش نے کہا ''میں تمھاری بیوی کے لیے بھی دعا کررہا ہوں۔''

کسان بولا ''آپ سب بیماروں کے لیے دعا کر رہے ہیں۔ اس میں میرا ہمسایہ بھی شامل ہے، جو میرا مخالف ہے۔ اس دعا سے وہ بھی صحت یاب ہوجائے گا۔''

درویش نے کہا ''جب سب کے لیے دعا مانگی جاتی ہے تو اس کی قبولیت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔''

(فہر علی حسین، محمد فلح حسین)

urdudigest.pk
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں۔ سال کے بعد روتے دھوتے ایک بچہ بھی پیدا کر دیتی تھی۔ چھڑی لے کے بچوں کو مارنا، پھر بعد میں خود ہی چوٹوں کی سِکائی بھی کرنا۔ بچوں کو مارنے کے قصے ہنس ہنس کر سنانا اور اپنی گمشدہ صحت کا ماتم...... سارے ہی کام بڑے شدومد سے کرتی تھیں۔

فاطمہ چُپ بیٹھی اُن کی باتیں سنتی رہی اور دل ہی دل میں سوچتی رہی...... کیا یہ عورت خوش ہے؟ شاید خوش ہی ہے...... اس لیے کہ ان کی زندگی گنجلکوں سے خالی ہے۔ سیدھی، صاف سپاٹ سڑک کی طرح جس پر ساری گاڑیاں، تانگے اور موٹریں، ایک ہی رُخ پر چلتے ہوں۔

دروازے سے نکلتے نکلتے فاطمہ نے پوچھا......" تو آپ خوش ہیں؟ یہاں ولایت میں خوش ہیں؟"

تو وہ کہنے لگیں...... "خوشی کی آپ بات نہ کریں۔ آپ پھر کسی دن آئیں تو اِس موضوع پر بات ہوگی۔"

فاطمہ اُن کا جملہ سُن کر ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی۔

"کیوں...... تو خوش نہیں ہیں آپ؟"

"جب آٹھ نو بچوں کو پالنا ہو اور گھر کا پورا کام خود ہی کرنا ہو اور میاں کو سوائے اذان دینے اور دوسروں کے بچوں کو کبھی کبھار پڑھانے سے کچھ اور کرنے کا نہ ہو تو خوشی کے بارے میں بھی کوئی سوچتا ہے کیا؟؟ پھر بھی اللّٰہ کا شکر ہے کہ کونسل کا کھاتے ہیں، پیتے ہیں اور چین سے رہتے ہیں۔ بچوں کو سکول میں فری ڈنر ملتے ہیں۔ پڑھائیاں فری ہیں۔ محلے پڑوس کی لڑکیوں کو اردو پڑھا کر کچھ پیسے بنا لیتی ہوں۔ شکر ہے اللّٰہ کا۔ اچھی گزر بسر ہو ہی جاتی ہے...... اور پھر بات تو یہ ہے کہ اگر یہی خوشی ہے تو ہم بھی خوش ہیں......"

فاطمہ نے اُن کے کندھے پر ہاتھ مارا...... "بہت ہمت والی عورت ہیں آپ۔"

""ہمت والی تو آپ بھی ہیں۔ پردیس میں اکیلی رہ رہی ہیں۔ آپ کے شوہر کو آپ سے محبت نہیں یا آپ اُن کے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں؟ خیر کوئی تو مجبوری ہوگی۔ اس طرح کے کام کوئی معمولی حالات والا تو کرتا نہیں......"

فاطمہ نے غور سے اُن کی طرف دیکھا تو وہ اب تک ایسی کم عقل اور سادہ لوح بھی نظر نہیں آئیں۔ اُس نے خدا حافظ کہا اور اپنے گھر کی طرف آ گئی۔

تنہائی اور خاموشی کی دیوار ڈھے گئی تھی۔ صبح دم یا رات گئے باغ کے رستے پر پیروں کے نشان اُبھرتے اور وہ امام صاحب کے سوال جواب، اُن کی متجسس، کچھ کہتی ہوئی، کچھ مانگتی ہوئی آنکھوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتی۔ جس روز وہ پھلوں کے پیسے دے کر آئی تھی اس سے اگلے ہی روز انھوں نے آ کر بڑے رعب سے دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک طرح سے اُسے ڈانٹ دیا۔ "آپ نے یہ کیا کر دیا صاحب؟ میں پھل اس لیے لے کر آیا تھا کہ آپ اکیلے ہیں۔ پتا نہیں کھانے پینے کا کیا سلسلہ ہوگا۔ آپ نے بیوی کو پیسے دے کر اچھا نہیں کیا......"

فاطمہ نے کہا "مگر میں نے پھلوں کے لیے آپ سے کہا ہوتا تو اور بات تھی......"

"وہ جی آپ کو پتا نہیں"...... انھوں نے فاطمہ کی بات مکمل ہونے کا انتظار نہیں کیا......

"ہم لوگوں کی عورتیں جاہل ہوتی ہیں۔ آپ لوگوں کے جیسی پڑھی لکھی سمجھدار تو ہوتی نہیں۔ اُلٹا برین ہوتا ہے ان کا...... سیدھی بات بھی اُلٹی ہو کر جاتی ہے اندر......"

فاطمہ نے کہا "ٹھیک ہے...... آیندہ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو کہہ دوں گی...... خدا حافظ" اور دروازہ بند کرنے کے لیے دروازے پر زور ڈالا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُن کا پیر دہلیز پر رکھا ہے۔

دروازے کا زور پڑتے ہی انھوں نے پیر ہٹا لیا اور گھوم کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی دروازے پر ہاتھ رکھ کر اُسے بند ہونے سے روک دیا "ناراض ہونے کی ضرورت کیا ہے صاحب، ہم تو آپ کے پڑوسی ہیں۔ اس ناتے سے آپ کو پوچھنے آ جاتے ہیں اور کوئی مطلب نہیں ہمارا۔" پھر ہاتھ ہٹا لیا اور ماتھے پر بل ڈال کر چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد کچھ دیر اُس نے دروازہ بند نہیں کیا اور باہر باغ میں دیکھتی رہی جہاں ایک ووڈ پیکر

پنج مار مار کر درخت کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کو وہ سب بہت سہما لک لگا۔ اس وقت صبح سے برستی بارش تھم گئی اور ایک دم جیسے چاروں طرف سناٹا پھیل گیا۔

سامنے گھروں کے دروازے بند، سڑک سنسان! برستی بارش میں تو لوگ برساتیاں پہنے آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ اب بارش تھمی تو جیسے سبھی غائب ہوگئے۔ اچانک اُسے یوں لگا جیسے اس پوری کائنات میں بس وہی ایک تن تنہا باقی رہ گئی ہو۔ تنہائی پہلے بھی تھی۔ جب وہ اندر کی دنیا میں کھوئی باہر کی دنیا سے پھر بھی کندھا بھڑائے جی رہی تھی۔ تنہائی کا وہ احساس دلگداز تھا۔ ایک لذت تھی اس میں۔ مگر اب جو تنہائی اُبھری تھی اُس میں اکیلے رہ جانے کا احساس اس شدت سے اُبھرا تھا کہ وہ لڑکھڑا سی گئی۔ شاید یہ کوئی کمزور لمحہ تھا اور اندر کی تنہائی اُس کے امتحان کے لیے اسی لمحے کی منتظر تھی...... کیا تھا؟...... مگر کچھ تھا۔ ایک بے چینی سی۔ اپنے اندر سے نکل بھاگنے کی تمنا۔ کہیں جا کر چھپ جانے کی خواہش، کوئی ساتھ، قربت، بدن سے بدن تک کا سفر...... منفی، مثبت ساری خواہشیں ایک سیلاب کی طرح اُس کے اندر اتر آئیں۔ ہال میں لگے آئینہ میں اُس نے خود کو دیکھنا چاہا تو آئینہ کی سطح صاف نظر آئی۔ کوئی دوسرا چہرہ، اُس کا سنگی، ساتھی...... اُس پر نہ اُبھرا۔ خوفزدہ ہو کر اُس نے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ دیے اور دروازہ کھول کر بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ آسمان کھل گیا تھا اور تیز دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ نم گھاس پر پیر پڑتے ہی ایک ٹھنڈک پورے بدن میں پھیل گئی اور وہ بخار جس نے اچانک اُس کے دماغ کو اپنے پنجے میں لے لیا تھا اترنے لگا۔ وہ وہیں گیٹ کے پاس منڈیر پر بیٹھ کر تیز دھوپ میں سانس لیتی سڑک کو دیکھنے لگی۔ اُسی وقت ساتھ کے گھر سے ایک آدمی باہر نکلا اور بڑی قینچی سے گلاب کے پودوں کی فالتو ٹہنیاں کاٹنے لگا۔ وہ اُسے دیکھ کر مسکرائی اور اُٹھ کر قریب چلی گئی۔ یہ باہر کی دنیا سے رابطے کی خواہش تھی...... کسی دوسرے سے بات کرنے کی خواہش...... اس سے پہلے بھی وہ اکثر باغ کی دیکھ بھال کرتا نظر آیا کرتا تھا مگر سوائے آتے جاتے سر ہلا کر ایک دوسرے سے آگاہی کا ثبوت دینے کے کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ قریب جا کر پہلے تو اُس نے روایتاً موسم کی بات کی۔ پھر باغ کے پھول پتوں کی تعریف کی۔ پھر اپنے باغ کی دِگرگوں حالت کا ذکر اور اپنے عارضی قیام کا حوالہ اور جب دل کی دھک دھک اپنی عام حالت میں واپس آئی تو اس سے پوچھا کہ کیا وہ اُس کے باغ کی گھاس بھی کاٹ دے گا؟ وہ ہولے سے ہنس دیا اور کہا "نہیں۔"

فاطمہ نے کہا "اچھا کسی اور کو جانتے ہو جو یہ کام کر دے......"

اُس نے پھر مسکرا کر کہا "نہیں۔"

"مگر میں مفت کام نہیں کراؤں گی۔"

اُس نے ہاتھ روک دیا اور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "یہ کونسل کا گھر ہے اور اس میں جو عورت رہتی ہے وہ اندھی ہے۔ میں کونسل کی طرف سے اس گھر کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ سامنے گھروں کی قطار میں یہاں سے دیکھیں تو تمھارے گھر سے دائیں ہاتھ پانچواں مکان میرا ہے...... اس کی دیکھ بھال بھی میں ہی کرتا ہوں......"

فاطمہ نے بھی غور سے اُس کی نیلی آنکھوں میں دیکھا۔ شاید غصے یا ناگواری کی کوئی تحریر!! مگر وہ شرارت سے مسکراتی رہیں "دراصل اجنبیوں کو یہاں کے طور طریقے معلوم نہیں ہیں۔ جو لوگ سرسری قیام کے لیے یہاں آتے ہیں وہ ایسی باتوں کو جانتے نہیں۔"

فاطمہ مسکرا دی اور شکریہ کہہ کر واپس جا کر منڈیر پر بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ یہ چُپ چاپ بیٹھی اُسے کام کرتا دیکھتی رہی۔ اچانک دھوپ پھر غائب ہوگئی۔ اُس نے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف نگاہ کی تو سامنے گھر کی کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور امام صاحب وہاں کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ وہاں سے اُٹھی اور اندر چلی آئی۔

شام میں وہ پھر آن پہنچے "دیکھیے صاحب۔ آپ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان انگریزوں سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ ہم جو ہیں یہاں۔ جو کام ہو، کوئی بات ہو..... ہم سے کریں آپ۔'' انھوں نے آنکھوں سے شربت کے جام لنڈھاتے ہوئے کہا۔

فاطمہ نے رکھائی سے انھیں دیکھا اور اُن کی بات جیسے ان سنی کرتے ہوئے کہا..... ''آپ کو کیا کام ہے؟''

''کام؟'' اب وہ تھوڑا سا ہنس دیے۔ ''صاحب کام تو کوئی آپ ہمیں کرنے ہی نہیں دیتے..... آپ کیا کہہ رہے تھے اُس بدبخت سے؟؟''

''دیکھیے امام صاحب! میرے معاملات میرے اپنے ہیں۔ میں اگر کسی سے بات کروں تو آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ اس کے لیے مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے..... یا ہر کام کی رپورٹ آپ کو دینی چاہیے.....'' فاطمہ نے اچانک تیزی سے کہا۔

وہ پھر ہنس دیے ''غصہ کیوں کھاتے ہیں آپ صاحب..... اب دیکھیے نا میری بیوی شیفلیڈ گئی ہوئی ہے۔ میں بھی اکیلا ہوں۔ آپ بھی اکیلے ہیں۔ میں نے سوچا چلو آپ ہی سے کچھ بات کرلوں۔ ہم دونوں ہی تنہا ہیں اور پڑوس سے آپ بات کر سکتے ہیں تو میرے سے کرنے میں کیا حرج ہے؟ میں تو آپ کا اپنا آدمی ہوں۔'' بات ختم کرکے وہ ہے ہے کرکے ہنسنے لگے۔

فاطمہ کا جی چاہا وہ اُن کو ایک اچھا سا..... خوب کس کے تھپڑ لگائے اور کہے کہ آیندہ اس طرف کا رُخ کیا تو اچھا نہ ہوگا۔ اُس نے دروازے پر سے ہاتھ ہٹا کر دونوں ہاتھ پہلو میں گراتے ہوئے بہت سختی سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ امام صاحب پورا دروازہ کھول کر اندر آگئے اور آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ فاطمہ نے کھلے دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھ کر بہت غصے اور سختی سے انھیں نکل جانے کو کہا۔ امام صاحب بیٹھتے بیٹھتے پھر کھڑے ہوگئے اور واپس مُڑ کر اس کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ اُن کی آنکھوں میں اب شربت کی جگہ نفرت اور کینہ تیر رہا تھا۔ ''آجاتی ہیں رنڈیاں شریفوں کے محلوں میں ماحول خراب کرنے کو..... تو کیا سمجھتی ہے یہاں رنڈیاں نہیں ملتیں؟ تیرے سے اچھی صورت شکل اور بدن کی میس گی مجھ کو۔ میں تو انسانی ہمدردی کے جذبے سے آیا تھا تیرے پاس۔ تجھے بدیسی گوشت کی بھوک ہے تو جا کر کسی بدیسی محلے میں مر..... یہاں شریفوں کے محلے کا ماحول خراب کرنے کیوں آئی ہے؟''

اور باہر نکل کر انھوں نے پوری طاقت سے گلا کھرچ کر صاف کیا اور زمین پر یہ بڑا لوتھڑا بلغم کا پھینک کر تیز تیز چلتے چلے گئے.....

یہی دن تھا جب فاطمہ کے گھر پر پہلا پتھر گرا..... مگر پتھر مارنے والا نظر نہیں آیا تھا۔ یونہی ایک اتفاقی حادثہ سمجھ کر وہ اسے بھول بھی گئی تھی مگر جب دوسرے روز وقفے وقفے سے اُسے کی کھڑکیوں پر، دروازے پر، دیواروں پر پتھر گرنے لگے تو اُسے تشویش ہوئی اور پریشانی میں گھر سے باہر نکل کر گیٹ کے پاس کھڑی ہوگئی۔ برابر میں وہی آدمی آج گھاس کاٹ رہا تھا۔ وہ قریب جا کر کچھ کہنے کو ہوئی تو وہ گھاس کاٹنے کی مشین گھسیٹتا دوسری طرف چلا گیا۔ اُسی وقت گیٹ کے پاس سے دو انگریز بڈھیاں گزریں اور اُس کی طرف سے یوں لاتعلق گزریں جیسے اُس کا وجود ہی نہ ہو۔

''دماغ خراب ہے ان لوگوں کا۔ ہمارے ملک میں ہم سے نوکروں کا کام کراتے ہیں، کہتے ہیں اُجرت بھی دیں گے.....'' دونوں میں سے ایک نے جیسے اُسے سنانے کو کہا۔ فاطمہ حیران انھیں جاتا دیکھتی رہی۔ یہ کیا بات تھی؟ یہاں فاطمہ نے کالوں کی دکانوں میں گورے ملازم دیکھے تھے۔ اچانک کیا ہوگیا تھا؟ اُسی وقت پھر کہیں سے ایک پتھر آکر اُس کے پیروں کے پاس گرا۔ وہ جلدی سے گھر کے اندر چلی گئی اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر سامنے کے گھروں کی طرف دیکھا اور سوچا کہ شاید امام صاحب کی بیوی اس گتھی کو کچھ سلجھا سکیں..... پھر یاد آیا کہ وہ تو شیفیلڈ گئی ہوئی تھیں۔ اُن کے گھر کے ساتھ والا گھر خالی اور اگلے گھر میں ایک اور ایشیائی خاندان آباد تھا۔ وہ پھر

باہر نکلی اور اس گھر کی طرف چلی گئی۔ بہت دیر کھٹکھٹانے کے بعد کسی نے اوپر کی کھڑکی کھولی اور زور سے کہا..... ''جاؤ یہاں سے.....'' فاطمہ تیزی سے پلٹی اور قریباً بھاگتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ فضا میں ایک عجیب سا تناؤ تھا۔ درخت ساکت، ہوا خاموش، گھروں کے دروازے بند..... اور زور زور سے سانس لیتی زمین! اس نے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ کسی نے زور زور سے کھٹکھٹا دیا۔ اُس نے جلدی سے دروازہ کھولا تو سامنے ہی امام صاحب کی بیوی کھڑی خشونت آمیز نظروں سے اُسے گھور رہی تھیں۔

''آئیے آئیے!'' فاطمہ نے انھیں دیکھتے ہی بہت شکر گزاری سے کہا۔ وہ اندر آگئیں اور آتے ہی دھپ سے صوفے پر بیٹھ کر دوپٹا منہ پر ڈال کر رونے لگیں۔ فاطمہ اُن کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے ہمدردی سے پوچھا..... ''کیا ہوا؟'' اور دل ہی دل میں خوش ہوئی کہ شاید امام صاحب گزر گئے۔

''ہوا کیا؟ آپ پوچھتی ہیں کیا ہوا؟ بہن ہم نے تو آپ کا بڑا خیال رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے تو سوچا تھا آپ پردیس میں ہیں۔ اکیلے ہیں۔ کچھ مدد کریں گے آپ کی۔ آپ نے اچھا بدلہ دیا..... مجھ پر، میرے بچوں پر تو رحم کیا ہوتا.....''

''کیا؟'' فاطمہ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا ''میں نے کیا کیا ہے؟'' کچھ کیا ہے میں نے؟''

''بہت بھولی ہیں آپ تو..... کیسے معصوم بن رہی ہیں جیسے کچھ پتا ہی نہ ہو.....''

''کیا پتا نہیں، کون معصوم بن رہا ہے..... آپ سیدھی بات کیوں نہیں کرتیں.....'' فاطمہ نے تیزی سے کہا۔

''میں تو پہلے ہی کہتی تھی کوئی بات ہے ضرور..... شریف گھروں کی عورتیں یوں پردیس میں جا کر تنِ تنہا نہیں رہتیں جب تک کہ دال میں کالا نہ ہو کچھ.....'' امام صاحب کی بیوی نے پھر دوپٹا منہ پر ڈال کر پھسک پھسک کر رونا شروع کردیا۔

''آپ ٹھیک سے بات کریں گی یا نہیں!.....'' فاطمہ نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں ہلایا۔ وہ ایک دم ہی اُٹھ کھڑی ہوئیں ''پہلے میرے میاں کو دانہ ڈال کر پنجے میں پھنسانے کی کوشش کی۔ اب میری جان کی دشمن بنی ہو؟ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میرا گھر والا ہی سیدھا ہے۔ پندرہ سال سے ہم یہاں ولایت میں ہیں۔ آج تک کبھی امام صاحب خواب میں بھی سیدھے رستے سے ہٹے نہیں۔ مگر آپ تو بی بی ولایتی عورتوں سے بھی خراب نکلیں وہ تو

اول انعام کا راز

ایک کسان کو ہر برس مکئی کی اچھی فصل اُگانے کے مقابلہ میں پہلا انعام ملتا تھا۔ ایک صحافی نے اس معاملہ کی کھوج لگانے کا فیصلہ کیا کہ ہر برس ایک ہی کسان کیسے مقابلہ جیت جاتا ہے؟ صحافی نے تحقیق کی تو اسے پتا چلا کہ کسان اپنا بیج اپنے ساتھی کسانوں کو بھی مہیا کرتا ہے۔ صحافی نے اس سے پوچھا ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ سال کے اختتام پر تمھارا مقابلہ ان ساتھی کسانوں سے ہوگا، تم اپنا اچھا بیج ان کو کیوں دیتے ہو؟''

کسان کہنے لگا ''ہوا جو فصل تیار ہو رہی ہو اس سے پولن لیتی ہے اور اسے ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں بکھیرتی چلی جاتی ہے۔ اگر میرا ہمسایہ نکمی فصل اُگائے گا تو اس سے میری فصل کا معیار بھی تیزی سے گرنے لگے گا۔ اگر مجھے اچھی فصل اُگانی ہے تو مجھے اپنے ہمسایہ کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ وہ بھی اچھی فصل اُگائے۔''

اس کسان کی طرح ہمیں بھی اگر اچھی فصل اُگانی ہے تو ہمیں اپنے ہمسایہ کو بھی اچھی فصل اُگانے میں مدد دینی ہوگی۔ زندگی کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ جو لوگ خوشی اور اطمینان سے رہنا چاہتے ہیں انھیں اپنے اردگرد رہنے والوں کی مدد بھی کرنا ہوگی کہ وہ بھی خوشی اور اطمینان تلاش کرسکیں۔

(ثمینہ فیروز، ملتان)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بس یونہی بدنام ہیں۔ جو کرتی ہیں کھلے عام کرتی ہیں، آپ کی طرح شریف بن کر بدمعاشی نہیں کرتیں......"

فاطمہ نے اُن کا کندھا چھوڑ دیا اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ امام صاحب کی بیوی پریشان ہو کر ایک دم چپ ہو کر رونا دھونا بھول گئیں۔

"امام صاحب......؟ وہ آپ کے سیدھے شریف شوہر...... جا کر ذرا پوچھیے ایک بار پھر اُن سے کہ کون کس کو دانہ ڈال رہا تھا۔ یہ تو انھیں سے پوچھیے...... ۱۵ر برس میں بھی آپ اپنے شوہر کو نہ جان پائیں تو پھر کب جانیں گی؟"

"میں کیا پوچھوں؟ خاک؟ سارے محلے نے دیکھا۔ پہلے تو اُس گورے کو ہاتھوں پر ڈالنا چاہا۔ جب وہ قابو میں نہ آیا تو امام صاحب کو گھر پر بُلا لیا...... بی بی! تیرا اپنا آپ اتنا ہی بے قابو ہو رہا ہے تو اپنے آدمی کو بُلا۔ دوسروں کے گھروں کے پیچھے کیوں پڑی ہے؟"

فاطمہ کچھ دیر چُپ چاپ کھڑی انھیں دیکھتی رہی۔ پھر جا کر انھیں گلے سے لگانے کی کوشش کی۔ "آپ بہت بھولی ہیں......"

امام صاحب کی بیوی دم بھر کے لیے سکتے میں آگئیں۔ پھر زور سے فاطمہ کو دھکا دیا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئیں۔

ساری بات اب فاطمہ کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ فاطمہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ باہر رات اُترنے لگی تھی اور بہت دیر سے کوئی پتھر آ کر اُس کے گھر پر گرا نہیں تھا۔ ایک خاموشی تھی چاروں طرف اور آہستہ آہستہ اترتا سناٹا!! بہت دیر یونہی خالی الذہن بیٹھے رہنے کے بعد وہ اٹھی اور جا کر ساری کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کیے اور اوپر چلی گئی۔ اپنا پرس کھول کو چھوٹا پرس نکالا اور بہت دیر تک وہ پیسے ہاتھ میں لے کر بیٹھی رہی جو نہ جانے فیصلے کی کون سی منزل پر اُس نے اُٹھا کر الگ رکھ دیے تھے...... جب دم بالکل ہی گھٹنے لگے گا تو وہ چلی جائے گی۔ کہیں بھی چلی جائے گی...... فاطمہ بہت دیر تک وہ پیسے مٹھی میں لیے بیٹھی رہی۔ پھر واپس پرس میں رکھے اور جا کر آئینہ کی سطح پر لکھا...... "احمد میں تمھاری زندگی سے نکل گئی......"

یہ لکھنے کے بعد اُسے یوں لگا جیسے سارا جسم ہلکا ہلکا سا ہو کر بادلوں میں کہیں اُڑنے لگا ہو۔ بھاری پن کا وہ احساس جو ایک زمانے سے اُسے دبائے ہوئے تھا، اب نہیں تھا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے وہ مسکرائی اور لمحے بھر کے اندر ہی سو بھی گئی۔

آدھی رات جانے کے بعد دم گھٹنے سے اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ جب پوری طرح بیدار ہوئی تو دیکھا کہ پورا کمرا دھوئیں سے بھر رہا تھا۔ بھاگ کر جا کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ زینہ بھی بھل بھل جل رہا ہے اور آگ کی لپیٹیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اُس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور بھاگ کر کھڑکی کے پاس گئی۔ ہتھی پر ہاتھ رکھتے ہی ہاتھ چپک کر رہ گیا۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو آگ کی نوکیلی، لمبی لمبی زبانیں اوپر تک لپکتی چلی آ رہی تھیں۔ دھواں آنکھوں میں، ناک میں، حلق میں بھرتا جا رہا تھا اور سانس لینا دشوار تر!

آس پاس کے گھروں کے لوگ اپنے گھروں کی فکر میں اس آگ کو بجھانے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے...... وحشت میں اُس نے زور زور سے کھڑکی کے شیشے پر دونوں ہاتھ مارے اور چلا چلا کر مدد کے لیے پُکارنے لگی۔ شعلوں کی روشنی میں اُس کا وحشت زدہ چہرہ اور کُھلے منہ سے نکلتی بے آواز چیخ، سامنے گھر کی کھڑکی میں کھڑے امام صاحب نے سنی اور جب فاطمہ کا چہرہ اور شیشے پر رکھے ہاتھ آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے نیچے گر گئے اور دور کہیں آگ بجھانے کے انجنوں کا شور اُبھرا تو امام صاحب نے بھی کھڑکی کا پردہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اندر جا کر پلنگ پر لیٹے اور ہاتھ بڑھا کر دوسری کروٹ سوئی ہوئی بیوی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ستیاناس!" بیوی نے منہ ہی منہ میں کہا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر خود کو امام صاحب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

(بشکریہ فنون ۹۳ء)

لاہور کینٹ کے ایک سکول میں پیش آنے والے

ایک خوفناک حادثے کا ماجرا

موت یقینی تھی

سکول کے دروازے سے ٹنگا ۱۳ ر سالہ وسیم ہل سکتا تھا نہ رو سکتا تھا اور نہ بول سکتا تھا

اظہر بن مظہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk urdudigest.pk

سی

سی یو کے آپریشن تھیٹر میں جب ڈاکٹر نے وسیم کو بے ہوش کرنے کے بعد نوید سے کہا کہ آئرن بار گلے سے نکال دیں، تو یہ سُن کر وہ حیران رہ گیا تھا۔'' یہ جملے ادا کرتے ہوئے ۱۱۲۲ر کے ایمرجنسی میڈیکل ٹیکنیشن نوید انجم کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ ۱۰ر اکتوبر ۲۰۰۶ء کو ایف جی بوائز ہائی سکول لاہور کینٹ نمبر ار میں پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بتا رہا تھا۔

محمد وسیم ولد فضل کریم ۱۳ر سال کا لڑکا تھا جو آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ سکول میں بریک کے دوران اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا کہ اچانک گیند سکول کی حدود سے باہر سڑک پر جا گری۔ وسیم گیند لینے کے لیے اُچک کر سکول کے مین گیٹ پر چڑھ گیا۔ ابھی اس نے قریب سے گزرنے والے افراد کو کہا ہی تھا کہ گیند پکڑا دیں کہ عین اس لمحے لوہے کے گیٹ کے کنڈے پر رکھا ہوا اُس کا پاؤں پھسل گیا اور آنِ واحد میں گیٹ پر لگے آئرن بارز میں سے ایک سلاخ اس کے گلے کو چیرتی ہوئی بائیں گال سے باہر نکل آئی۔ خوف سے اس کا سانس رُک گیا۔

وہ بے یار و مددگار لٹکا ہوا بے جان ہوتی آنکھوں سے آس پاس دیکھ رہا تھا۔ اُسی لمحے کسی نے ۱۱۲۲ر کو کال کیا۔ کنٹرول روم میں جس وقت کال موصول ہو رہی تھی، ایمرجنسی میڈیکل ٹیکنیشن نوید انجم وہیں موجود تھا۔ کال سننے کے بعد وہ اپنے ساتھی وسیم مختار اور اشفاق احمد کے ساتھ فوراً جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ریسکیو وہیکل جس میں ریسکیو ٹیکنیشن زین اور دیگر ساتھی موجود تھے، ساتھ ہی روانہ ہوئی۔

ایمبولینس سائرن بجاتی تیز رفتاری سے جائے حادثہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیور اپنی مہارت اور تجربہ استعمال کرتے ہوئے سڑک پر بے ہنگم ٹریفک کو دائیں بائیں سے کراس کر رہا تھا۔ سائرن کی آواز کے ساتھ ساتھ ایمرجنسی میڈیکل ٹیکنیشن مائیک پر لوگوں کو ایمبولینس کو راستہ دینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا کہ آگے سے ہٹ جاؤ، راستہ دو، مگر سب بے کار تھا۔ لوگ اپنی دھن میں جا رہے تھے۔ اس دوران کال موصول ہو رہی تھی۔ میڈیکل ٹیکنیشن کال کرنے والے سے جائے حادثہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور بچے کی حالت کے بارے میں بھی آگاہی حاصل کر رہا تھا۔ کال کرنے والے نے جب بتایا کہ لڑکا اِس وقت گیٹ کے ساتھ لٹک رہا ہے جبکہ اس کے دوستوں اور اساتذہ نے اُسے پاؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر سہارا دے رکھا ہے تو نوید نے پوچھا لڑکے کی حالت کیسی ہے؟ جس پر کالر نے کہا کہ لڑکا نیم بے ہوش ہے۔ سلاخ گلے سے ہوتی ہوئی گال سے باہر نکل چکی ہے۔ لڑکا بے حد خوف زدہ ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو چکا ہے۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے ہیں ہر چہرے پر خوف اور پریشانی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ لڑکا نہیں بچے گا اور کوئی کہتا ہے اس کو فوراً اوپر اٹھا کر سلاخ باہر نکال دیں۔ میڈیکل ٹیکنیشن نے فوراً کالر سے کہا کہ ایسا کچھ نہیں کرنا۔ ہمارے پہنچنے تک لڑکے کو سہارا دے کر رکھیں اور اس کو حرکت بھی نہ کرنے دیں، ورنہ کوئی بڑا حادثہ ہو سکتا ہے۔ بچے کی جان بھی جا سکتی ہے۔ احتیاط بہت ضروری ہے۔ ہجوم کو بھی کم کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے ہاں لوگوں میں ایمرجنسی کے بارے میں شعور ہونے کے باوجود پتا نہیں کیوں ایک طرح کی بے نیازی پائی جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ایمبولینس کے سائرن کا کیا مطلب ہے اس کے باوجود کئی لوگ راستہ نہیں دیتے۔ مائیک پر چیخ چیخ کر کہا جاتا ہے کہ آگے سے ہٹ جائیں ایمبولینس کو راستہ دیں، ایمرجنسی ہے۔ کئی بار دیکھا ہے کہ لوگ خاص طور پر موٹر سائیکل والے ایمبولینس کے ساتھ ریس لگانے لگتے ہیں۔ بعض کار والے بھی بے وقوفی دکھاتے ہوئے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہوتا ہے کہ ایمبولینس کے ساتھ وہ بھی جلدی سے آگے بڑھ جائیں گے کیونکہ سڑکوں پر ٹریفک بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ٹریفک مسائل بڑے شہروں کا سب سے گمبھیر مسئلہ ہوتا ہے۔

نوید ایمبولینس میں بیٹھا لڑکے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ذہن میں اُسے ریسکیو کے مختلف طریقوں پر غور

نوید نے بتایا ''میں جنوری ۲۰۰۵ء میں اپنے والد سے ملنے دُبئی گیا۔ میں نے وہاں ریسکیو والوں کو کام کرتے دیکھا تو میرے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی کوئی ایسا ہی کام کروں۔ ۳ر یا ۴ر ماہ بعد واپس پاکستان آ گیا۔ یہاں ریسکیو ۱۱۲۲ر کی سروس کو دیکھا جو ابھی شروع ہو رہی تھی۔ میں بھی انسانی خدمت کے جذبے کے تحت اس کا حصہ بن گیا۔'' میرا دوسرا انچ تھا۔

نوید انجم نے کہا کہ جب میں ریسکیو ۱۱۲۲ر کا حصہ بنا تو اُس وقت میں نے بی ایس سی کیا تھا۔ بعد میں مَیں نے آئی ٹی میں ماسٹرز کیا اور اب میں ریسکیو کے حوالے سے سکولوں، کالجوں اور اداروں میں ریسکیو کی مفت تربیت دیتا ہوں۔ میں نے پچھلے دنوں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں ڈاکٹروں کو جسم میں لگنے والے سریوں، سلاخوں یا کسی اور چیز کے حوالے سے تربیت دی ہے۔ ریسکیو ۱۱۲۲ر نے عوام کو مفت طبی امداد کے حوالے سے تربیت دینے کا آغاز کیا ہے۔ جو کوئی بھی ہمیں تربیت کے لیے کہتا ہے، ہم اُسے مفت تربیت دیتے ہیں۔ ہمارے ڈی جی ڈاکٹر رضوان نصیر عوام میں ریسکیو ۱۱۲۲ کے بارے میں آگاہی مہم کے حوالے سے بہت سرگرم اور کوشاں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عوام میں ابتدائی طبی امداد کے حوالے سے مکمل آگاہی ہو، تاکہ حادثات اور ہنگامی حالات میں ابتدائی طبی امداد کے بارے میں سب کو معلومات حاصل ہوں۔ اُن کی اس سوچ اور فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم مصروفِ عمل ہیں۔

کر رہا تھا۔ اُن کے پاس تربیت تو ہے مگر عملی طور پر کسی حادثہ میں ریسکیو کرنا ایک بالکل الگ تجربہ ہوتا ہے اور حالات یکسر مختلف ہوتے ہیں۔

نوید ہر پہلو پر غور کرتا ہوا جب جائے وقوعہ پر پہنچا تو وہاں ایک ہجوم جمع تھا۔ لڑکے کو گیٹ سے لٹکا دیکھ کر ایک دفعہ تو وہ بھی گھبرا گیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ اُس نے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ریسکیو پلان کو حتمی شکل دی اور فوراً ہی لڑکے کو طبی امداد کے طور پر ڈرپ لگا دی۔ کانوں میں لوگوں کے مختلف مشوروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا سلاخ کاٹ لیں، کوئی کہہ رہا تھا گیٹ کو قبضے سے نکال کر لڑکے کو زمین پر لٹا دیں اور پھر سلاخ سے باہر کھینچ لیں۔ یہ باتیں ریسکیو والوں کی یکسوئی میں مخل ہو رہی تھیں چنانچہ اُن کے ایک ساتھی نے بڑی کوشش سے لوگوں کو جائے وقوعہ سے ایک خاص فاصلے تک پیچھے ہٹایا تاکہ ریسکیو کرنے میں کسی قسم کی دشواری یا مشکل پیش نہ آئے۔

اس دوران ریسکیو ٹیکنیشن، زین نے اپنے ساتھی کی مدد سے اپنے تمام ریسکیو ٹولز منظم کیے اور پلان کے مطابق گیٹ کا وہ حصہ کاٹنا شروع کیا جس کے ساتھ محمد وسیم لٹکا ہوا تھا۔ میڈیکل ٹیکنیشن نوید انجم اور وسیم مختار نے اس دوران محمد وسیم کو بڑی احتیاط اور مہارت کے ساتھ پکڑا تاکہ کٹر کی تھرتھراہٹ سے اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور بلیڈنگ نہ شروع ہو جائے۔ یہ انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ گیٹ کو کٹر سے کاٹا جا رہا تھا۔ گیٹ سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ سکول کے ۲ر اساتذہ نے گیٹ مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ ساتھ ہی وہ پوچھ رہے تھے یہ طریقہ ٹھیک تو ہے؟ میڈیکل ٹیکنیشن نے کہا ہمیں اس کام کی تربیت ہے لہٰذا آپ فکر نہ کریں اور اللہ پر بھروسا رکھیں اور دعا کریں۔ لڑکے (وسیم) کو محفوظ رکھنے کے لیے اُس کا چہرہ کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تاکہ گیٹ کاٹتے وقت چنگاریاں اُسے کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ وسیم کو ریسکیو کرنے کا یہ واحد اور محفوظ طریقہ تھا۔

جب گیٹ کو کاٹ کر علیحدہ کر لیا گیا تو بڑی احتیاط سے وسیم کو ایمبولینس میں شفٹ کیا گیا۔ وسیم کو گیٹ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹکڑے سمیت بہت ہی احتیاط سے سہارا دے کر رکھا گیا۔ وسیم کو لے کر میو ہسپتال پہنچے۔ ہسپتال مین ایمرجنسی وارڈ کے اندر موجود سٹاف کے لیے بھی یہ ایک خوف ناک لمحہ تھا۔ اگرچہ ایمرجنسی وارڈ میں ہر لمحہ ہی خوف اور ڈر سے بھرا ہوتا ہے مگر سکول بوائے کو اس حالت میں دیکھ کر سٹاف کا ہر فرد گھبرا سا گیا۔ کوئی بھی اُسے ہاتھ لگانے کو تیار نہیں تھا۔ ایمرجنسی وارڈ والوں نے فوراً سی سی یو وارڈ جانے کا کہا۔ وہاں پر وسیم کو آپریشن تھیٹر میں منتقل کیا گیا۔ وہاں موجود ڈاکٹر نے سلاخ کو گلے سے نکالنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر کہنے لگا میرے پاس اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یہ بڑا حساس اور پیچیدہ معاملہ ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا یہ بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ سلاخ کھینچنے سے لڑکے کی موت بھی واقعہ ہو سکتی ہے۔ ٹیکنیشن نے کہا بہرحال یہ کام تو آپ لوگوں کا ہے۔ مکمل پڑتال کریں اور دیکھیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ اس معصوم بچے کی زندگی کو بچانے کے لیے آپ کو ہی کوشش کرنا ہے۔ بعد میں دیگر ڈاکٹروں نے وسیم کے گلے سے سلاخ نکالنے کے لیے کام شروع کیا۔

کوئی شک نہیں کہ انسان تو بس اللہ تعالیٰ کے بھروسے ہی پر ہے۔ عام لوگوں کے خیال میں تو ڈاکٹر بڑے بے رحم اور بے حس ہوتے ہیں۔ اُن کو چیر پھاڑ کرنے میں کوئی تکلیف یا مشکل پیش نہیں آتی۔ یہ تو اُن کا روزمرّہ کا معمول ہے۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کی سرجری کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ بھی جذبات اور احساسات کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ بھی زندگی کے جانے کے خوف کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بعد نوید آپریشن تھیٹر سے باہر آ گیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگا کہ وہ اس معصوم بچے کو بچا لے اور اُسے نئی زندگی دے۔

وسیم مختار تو حادثاتی طور پر اس شعبہ میں آ گیا۔ بے روزگار تھا۔ پتا چلا ایک سرکاری ادارہ بن رہا ہے۔ اُس نے ریسکیو ۱۱۲۲ر میں نوکری کے لیے اَپلائی کر دیا۔ کسی مقصد یا جذبہ کے تحت نہیں بلکہ سرکاری نوکری ملنے کی خواہش میں اس طرف آیا۔

دورانِ تربیت احساس ہوا کہ یہ تو بڑا نیک اور اچھا کام ہے۔ اس میں انسانی خدمت کا پہلو سب سے نمایاں ہے۔ جب مقصد ملا تو اپنی تمام توانائیاں صرف کر کے آگے بڑھتے رہے۔ ابتدائی دور بڑا مشکل تھا۔ پہلے ۶ر ماہ تو تنخواہ بھی نہیں ملی تھی۔ ان حالات میں بہت سے لڑکے ملازمت چھوڑ کر چلے گئے، مگر اس نے نیک مقصد کو اپنی زندگی کا جزو بنا لیا۔ محنت اور لگن کے ساتھ کام کرتا رہا۔ بعد میں ساری تنخواہیں بھی مل گئیں۔ اُس کو احساس ہوا کہ یہ صرف نوکری ہی نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت کا بہترین ذریعہ ہے۔ بس انھوں نے امید کا دامن نہیں چھوڑا اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے محنت جاری رکھی۔ لوگوں کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی نے بھی جذبۂ خدمت کو بہت تقویت بخشی۔ وسیم مختار ایم اے سیاسیات تھا۔ ریسکیو ۱۱۲۲ کے پہلے بیچ میں شامل تھا۔

وسیم مختار جب محمد وسیم کو ریسکیو کر رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ وسیم بڑا ہمت والا لڑکا تھا۔ بظاہر وہ حوصلے سے تکلیف برداشت کرتا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر خوف یا ڈر کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ زین نے بڑی مہارت اور ٹیکنیک سے گیٹ کو کاٹا۔ زین بڑا محنتی اور ماہر لڑکا ہے۔ بڑے حوصلے اور جرأت سے کام کرتا ہے۔ اپنی محنت اور لگن کی وجہ سے ہی اُس کو نیشنل یوتھ ایوارڈ ملا۔ جب محمد وسیم کے والد فضل کریم کو ایف جی بوائز ہائی سکول کینٹ نمبر ار کے پرنسپل نصر اللہ خان نیازی نے حادثہ کے بارے میں بتایا اور میو ہسپتال پہنچنے کا کہا۔ فضل کریم ایک ٹیلر ماسٹر تھا۔ جب اُس کو اس حادثہ کی خبر ہوئی تو وہ یہ سن کر اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اس کی نظروں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اُس کے بڑے بیٹے نے باپ کو سنبھالا۔ اُس کو حوصلہ اور دلاسہ دیا۔ دونوں باپ بیٹا فوراً ہسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔

صوفی فضل کریم راستے میں اپنے خیالوں میں گم خود سے باتیں کر رہا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ میرا یہ بیٹا سب سے چھوٹا ہے۔ بڑا سعادت مند اور فرماں بردار ہے۔ نہ جانے وہ زندہ بھی ہو گا یا......

صوفی فضل روتے ہوئے اللہ سے دعا کر رہا تھا کہ اے میرے مالک بے شک یہ تیرا مال ہے، تو ہی اس کا خالق و مالک ہے، مگر میں بھی ایک باپ ہوں۔ مجھے میرا بچہ لوٹا دے۔ ابھی تو وہ بہت چھوٹا ہے۔ اُس نے زندگی میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔

صوفی صاحب کے ۲ر بیٹے اور ۲ر بیٹیاں تھیں۔ سب بڑے نیک اور سعادت مند تھے۔ اللہ سب کے نصیب اچھے کرے۔ یہ ایک باپ کی خواہش اور دعا تھی۔ صوفی صاحب کے گھر سے ہسپتال کا فاصلہ ۳۰ر کلومیٹر تھا۔ جب ہسپتال پہنچے تو محمد وسیم کا آپریشن تھیٹر میں آپریشن جاری تھا۔ باپ کے لیے یہ لمحے انتہائی تکلیف اور پریشانی کے تھے۔ وہ تھیٹر کے دروازہ پر نظریں جمائے کھڑا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور وسیم کو باہر لایا گیا۔ باپ نے بے ہوش بیٹے کو دیکھا تو چیخ نکل گئی۔ اُسی وقت ڈاکٹر نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا ”فکر نہ کریں۔ بچہ خیریت سے ہے۔“ بے تاب باپ کو جیسے سکون مل گیا۔ وہ فوراً سجدہ میں گر گیا اور اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔

وسیم دو ماہ تک ہسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ ماں باپ کی دعاؤں نے اُس کو نئی زندگی دے دی۔ آج وہ ایک صحت مند زندگی گزار رہا ہے۔ ۶ر سال گزر جانے کے بعد بھی اُس حادثہ کو نہیں بھولا۔ وہ جب بھی اپنے دوستوں سے ملتا ہے تو اُس دن کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے۔ میں گیٹ پر چڑھ کر راہ چلتے لوگوں سے گیند مانگ رہا تھا کہ پاؤں پھسل گیا اور گیٹ کی سلاخ میرے گلے اور جبڑے سے ہوتی ہوئی گال سے باہر نکل آئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب موت یقینی ہے، زندہ نہیں بچ پاؤں گا۔ کچھ سمجھ دار لوگوں نے ریسکیو والوں کو فون کر دیا۔ پھر ریسکیو والے آئے اور انھوں نے مجھے گیٹ کاٹ کر نیچے اتارا۔ یہ بہت خوفناک منظر تھا۔ سلاخ میرے منہ سے آر پار تھی۔ ذرا سا ہل نہیں سکتا تھا، نہ بول سکتا تھا نہ رو سکتا تھا۔ دل ڈرا ہوا تھا کہ پتا نہیں کیا ہو گا۔ کبھی بول بھی سکوں گا؟ کبھی ٹھیک بھی ہو سکوں گا؟ میرے گال اور جبڑے سے یہ سلاخ کیسے نکلے گی؟ کس قدر خون ضائع ہو جائے گا؟ کیا کوئی ڈاکٹر یہ کر بھی سکے گا؟ میں نے اپنی زندگی میں اس طرح کا کیس اور منظر کبھی دیکھا نہیں تھا اور اب میں خود ایک تماشا بن گیا تھا۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگ اللہ توبہ اللہ توبہ کر رہے تھے۔ ان کی باتیں اور تبصرے سن سن کر میری جان نکلے جا رہی تھی۔

پھر وہ ریسکیو والوں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرح ان ریسکیو والے لوگوں نے میری مدد کی اور میری زندگی بچائی، میری دعا ہے کہ اللہ ان کو ہر مشکل اور مصیبت سے محفوظ رکھے۔ ان لوگوں سے ملنے کو دل تو بہت چاہتا ہے مگر صبح ۹ر بجے سے رات ۸ر بجے تک دکان پر کام کرنے سے وقت ہی نہیں بچتا کہ کچھ اور کر سکوں۔

کبھی کبھی وسیم دُور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہتا ہے کہ زندگی بہت مشکل ہے مگر قیمتی بھی ہے۔ ایک گیند سے تو بہت ہی قیمتی...... جس کے لیے میں نے اتنی بڑی حماقت کی تھی۔ اس وقت تو وہ چالاکی اور تیزی لگ رہی تھی کہ میں بھاگتا ہوا آیا اور گیٹ پر چڑھ گیا۔ اس عمر میں سارے لڑکے یہی کرتے ہیں۔ دوست مسکراتے اور شاباش دیتے ہیں کہ تم بڑے چیتے ہو۔ اس بند گیٹ پر پاؤں رکھ کر چند لمحوں کے لیے میں بھی چیتا بنا تھا مگر آج سوچتا ہوں میرے والدین، میرے دوست، اساتذہ سب کی جان پر بن گئی تھی۔ کاش وہ لمحہ کبھی یاد میں ہی نہ آئے۔

صبح آئینہ دیکھتا ہوں تو اکثر کانپ جاتا ہوں۔ گال کا زخم دھیرے دھیرے بھر گیا۔ چھوٹا ہو گیا مگر گلے پر اب بھی نشان موجود ہے، جو اُن خوفناک لمحوں کی یاد دلاتا ہے۔

کاش میں اپنی عمر کے ان سارے لڑکوں کو وہ دکھ، وہ درد اور تکلیف بتا سکتا جو میں نے اور میرے پیاروں نے ان ۲ر ماہ میں سہی۔ ایک اللہ ہی تھا جو درد بھرے ان لمحوں میں میرے ساتھ ہوتا اور میری آس اور ہمت بندھ جاتی......

■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ایماندار دفتری بابو کی بپتا

سرکاری لفافہ

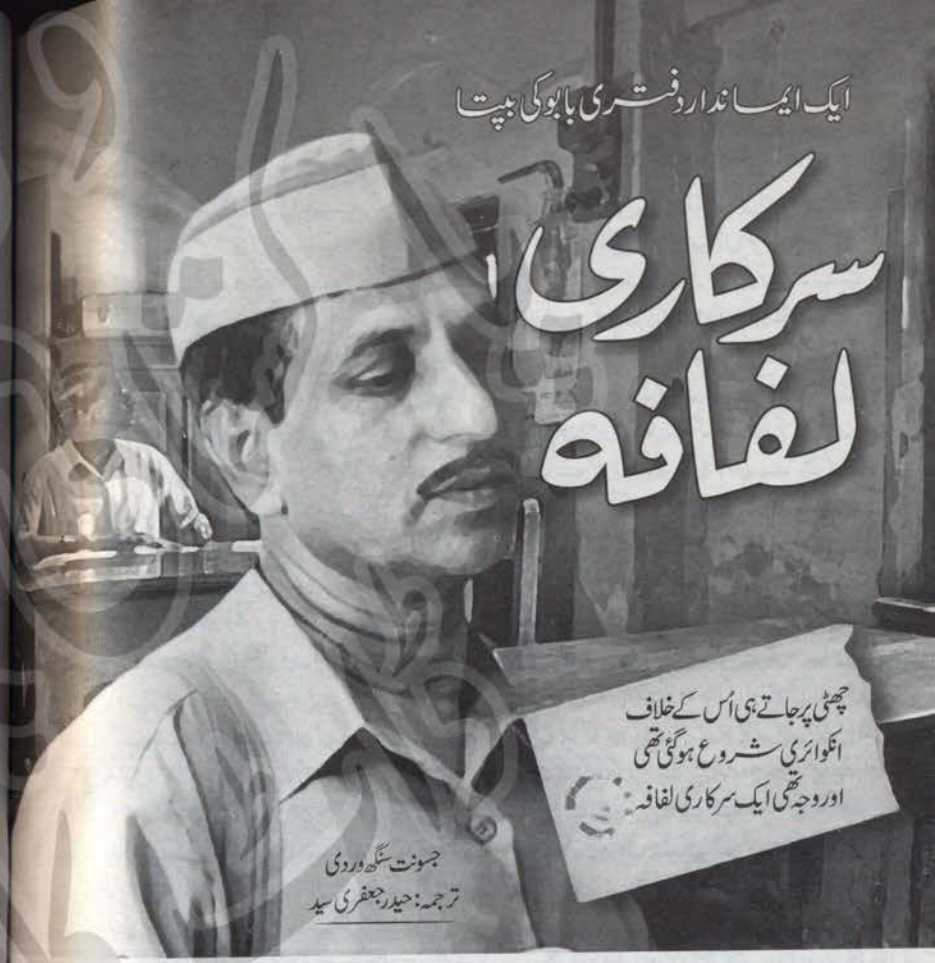

چھٹی پر جاتے ہی اُس کے خلاف انکوائری شروع ہوگئی تھی اور وجہ تھی ایک سرکاری لفافہ

جسونت سنگھ وردی
ترجمہ: حیدر جعفری سید

دفتر میں حالات کچھ اسی طرح کے چل رہے تھے کہ جو بابو بھی دو چار دنوں کی چھٹی پر جاتا اس کی کوئی نہ کوئی شکایت آجاتی۔ کچھ بابو تو اسی اندیشے کی وجہ سے چھٹی ہی نہیں لیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آج شکایت ہوئی ہے تو کل کرسی سے بھی محروم کیے جاسکتے ہیں وقت کا کیا بھروسا!

بابو تلک راج کی لڑکی کی شادی تھی اور وہ دو مہینے کی چھٹی لے کر گئے تھے۔ لیکن جب ڈپٹی چیئرمین نے ہیڈ کلرک کو طلب کر کے تلک راج کی شکایت والا خفیہ خط دکھایا تو ہیڈ کلرک موہن لال سمجھ گئے کہ معاملہ سنگین نوعیت کا ہے۔ ان کی خواہش تو یہ تھی کہ لڑکی کی شادی تک تلک راج کی تیاریوں میں کوئی اڑچن نہ آئے لیکن اس کے باوجود انھیں چپڑاسی بھیج کر تلک راج کو دفتر بلوانا ہی

پڑا۔ وہ برانچ کے بابوؤں سے کہہ رہے تھے ''مرتا کیا نہ کرتا بیٹی کی شادی کا کام اہم ہے لیکن سرکاری کام بھی تو رکا نہیں جاسکتا۔''

ابھی بابو تلک راج گھر سے آئے بھی نہیں تھے کہ دفتر میں سرگوشیوں کا آغاز ہوگیا ''بچارے نے اتنے برس تو بہت سکون سے نکال لیے تھے لیکن اب پھنس گئے......''

''پھنسے بھی اس طرح کہ بچنا بہت مشکل ہے۔''

''یہ بھی جیسے مچھلی کے جال میں پھنسنے والی بات ہے۔''

''ہاں تو پھر اور کیا؟ مچھلی پی جائے تو کل سمندر پی جائے ورنہ ایک ہی گھونٹ بھرتی ہوئی......''

کسی اور نے ہنس کر کہا ''کیا مچھلی سمندر پی سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں پی سکتی؟''

''کیا مگرمچھ پینے دیں گے؟''

''مگرمچھ! ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔''

کئی بابوؤں نے مگرمچھ کی خصوصیت کا تصور کرتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ چائے کا دور چل رہا تھا اور بابو لوگ چائے کی چسکیوں کے ساتھ باتوں کے چٹخارے سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ہردے پال نے کہا ''آپ کہتے ہیں کہ تلک راج پھنس گیا لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' ''اپنے تجربہ کی بنیاد پر!'' ہردے پال نے جواب دیا۔

''لیکن کیسے؟'' اس دفتر میں پھنسا ہی کون ہے؟'' اور اگر پھنس جائے تو......؟'' تو اس کی بدقسمتی تو ہے ہی۔''

ابھی باتوں کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ بابو تلک راج دفتر میں داخل ہوئے۔ وہ پریشان نظر آرہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی بابو لوگ اس طرح خاموش ہوگئے جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو حالانکہ تلک بابو میں سانپ جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کا سانولا چہرہ لمبوترہ سا لگتا تھا لیکن بُرا نہیں تھا۔ اس کی تیکھی ناک اور چھوٹی آنکھیں بھی کسی میں خوف پیدا نہیں کرتی تھیں۔

ان کی آمد پر کسی نے انھیں بلایا بھی تو نہیں تو تلک بابو سمجھ گئے کہ معاملہ سنگین ہی ہوگا۔

ایک لمحہ میں بندہ سچا سچا ہوتا ہے لیکن اگلے لمحہ وہ کٹہرے میں نظر آتا ہے۔ ''ان کے ذہن میں خیال آیا کون کہہ سکتا ہے کہ کون سا شخص کسی وقت مجرم ٹھہرا دیا جائے۔''

وہ براہ راست ہیڈ کلرک کے پاس پہنچ کر کرسی پر گر پڑے ''سنیے میرے خلاف کوئی شکایت آئی ہے؟''

''ہاں...... آں!'' ہیڈ کلرک نے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے کہا ''آئی تو ہے۔''

''لیکن کیوں؟''

''کیوں؟ شکایت تو کسی کی بھی آسکتی ہے۔''

''لیکن ایسے ہی!'' تلک بابو مغموم ہو کر انھیں دیکھنے لگے تو ہیڈ کلرک نے کہا ''ایسے ہی کا مطلب؟ کسی بنیاد کے بغیر تو کوئی کام ہوتا نہیں۔''

''لیکن کم از کم یہ تو معلوم ہو کہ میرے خلاف شکایت کرنے والا کون سا مہربان ہے؟''

''مہربان؟'' ہیڈ کلرک نے ہنس کر پوچھا۔

''ہاں اور کیا؟'' تلک بابو نے کہا۔

ہیڈ کلرک نے دیکھا کہ تلک راج میں تلخی پیدا ہوتی جا رہی ہے تو اس نے مسکرا کر موضوع بدلنے کی کوشش کی ''ہم تو اور ہی باتوں میں الجھ گئے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ شادی کی تیاری اچھی چل رہی ہے؟''

''جی ہاں چل رہی ہے۔'' تلک راج نے بے نیازی سے جواب دیا جسے سُن کر ہیڈ کلرک کو کوئی خوشی نہیں ہوئی لیکن پھر بھی اس نے ازراہ ہمدردی کہا ''یار میں تو آنے کا سوچتا ہی رہا لیکن وقت ہی نہیں ملا......''

''مجھے بھی نہیں ملتا تھا اسی لیے تو چھٹی لینی پڑی!'' تلک راج نے نارمل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو جانتے ہیں کہ بیٹی کی شادی کے سلسلہ میں انسان بُری طرح بوکھلایا ہوا ہوتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"حالانکہ اسے خوش ہونا چاہیے کہ اس کی بیٹی سہاگن بن کر رخصت ہو رہی ہے لیکن کام سے فرصت ہی نہیں ملتی۔"

ہیڈکلرک کی تین بیٹیاں تھیں لیکن وہ ابھی تک صرف ایک ہی کو رخصت کر سکا تھا۔

تلک بابو نے زور دے کر کہا "اس لیے میں نے چھٹی لی تھی۔"

ہیڈکلرک نے مسکرا کر پوچھا "ہاں واقعی تمھاری چھٹیاں بھی تو بہت پڑی ہوں گی۔"

"جی ہاں میں نے تو کبھی چھٹی نہیں لی تھی۔" تلک بابو نے جواب دیا۔

کئی بابو ہنس دیے جس کا مطلب...... اب چھٹی لی......تو؟"

لیکن ہیڈکلرک کہہ رہا تھا "تمھارے جیسا ایماندار ملازم بھلا سرکار کو کہاں مل سکتا ہے؟"

"میں اب بھی چھٹی نہیں لینا چاہتا تھا لیکن بیوی نے مجبور کر دیا۔"

"وہ تم سے زیادہ سمجھ دار ہے۔"

"جی؟"

"میرا مطلب کہ اسے تم سے زیادہ فکر ہے۔"

"ہاں عورت کو ہوتی ہی ہے۔" تلک بابو نے لمبی سانس لے کر کہا "بھگوان نے عورتوں کو کچھ زیادہ ہی فکرمند بنایا ہے۔"

"لیکن تمام عورتوں کو نہیں۔"

ہیڈکلرک نے قہقہہ لگایا جواب میں تلک بابو نے بھی قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔

"ہاں شاید سب ہی کو نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ پھر عورت کا ردعمل ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔"

چند لمحوں کے بعد محسوس ہوا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بچ رہے تھے اور رسمی باتوں کے سہارے سے ایک دوسرے سے پیچھا چھڑانے کے لیے کوشاں تھے دونوں کے چہرے کہہ رہے تھے "گھریلو باتوں میں اور کتنا وقت گزارا جا سکتا ہے۔"

اس احساس کے ساتھ ہی دونوں خاموش ہو گئے۔ اس خاموشی کے وقفہ میں تلک راج پھر اسی شکایت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگلے چند لمحات کے بعد تلک راج نے پھر تلخی سے کہا "ہاں تو میں اس شکایت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

ہیڈکلرک نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "شکایت تو ہے ہی۔"

"لیکن میرا قصور؟"

"بتا دوں؟"

"جی ہاں ارشاد فرمایے۔"

"تم غمگین تو نہیں ہو گے؟"

"پھر بھی بتا دیجیے۔"

تم نے ذاتی خط کتابت کے لیے سرکاری لفافہ استعمال کیا ہے؟" ہیڈکلرک نے کچھ رعب سے پوچھا۔

"کیا ہوگا۔" تلک بابو کے لہجہ میں کچھ بے چینی تھی۔

ہیڈکلرک نے تلک بابو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ گھبرایا سا معلوم ہوتا تھا۔

"یوں نہیں...... کیا ہے تو صاف صاف بتاؤ!"

"کیوں؟"

"ہو سکتا ہے کیا ہی ہو۔"

"نہیں۔ اس طرح نہیں کیا تھا یا نہیں۔ واضح طور پر بتاؤ۔"

"کیوں؟" تلک بابو تڑپے۔

"یہ دفتر ہے یہاں پر بات واضح انداز میں ہوتی ہے۔"

"کیا ہر جگہ......؟"

"تم اپنی کہو!"

"آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟" تلک راج بری طرح گھبرا گیا تھا۔

"انکوائری کرنے کے لیے میری ڈیوٹی لگی ہے۔"

"اس کا مطلب کہ میرے خلاف انکوائری شروع ہو گئی ہے؟"

"ہاں......"

"اگر میں چھٹی نہ لیتا؟"

"تب بھی انکوائری تو ہوتی ہی......"

"لیکن کیوں؟"

"میں نے کہا نا کہ تم نے ذاتی ضرورت کے لیے سرکاری لفافہ استعمال کیا ہے۔"

"بات واضح ہو ہی گئی تو انکوائری کیسی؟"

ہیڈکلرک مسکرایا "انکوائری؟" سرکار نے اس معاملہ میں دفتر سے رپورٹ مانگی ہے اور وہ تمھارے بیان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔" ہیڈکلرک نے فائلوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں کہتا ہوں۔" تلک بابو نے اپنے سفیدی ہی بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا "اگر میں نے ایک سرکاری لفافہ ذاتی کام کے لیے استعمال کر لیا تو کون سی قیامت آ گئی۔"

"آئی کیوں نہیں؟" ہیڈکلرک نے دریافت کیا۔

"لوگ تو پورے انسان کو ہی ہضم کر جاتے ہیں۔" تلک بابو چیخے۔

"وہ بات اور ہے۔" ہیڈکلرک نے مسکراتے ہوئے کہا "دنیا میں نہ جانے کیا کیا ہو رہا ہے لیکن ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگر شکایت نہ آتی تو تم بھی بے قصور تھے۔"

"تو شکایت آتے ہی میں قصوروار ہو گیا۔" پھر اس نے برانچ بابوؤں کی طرف دیکھ کر کہا "ہر روز خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ سرکار کس طرح کروڑوں کے گھپلے کر رہی ہے...... لیکن......"

"اگر یہ بات ثابت ہو جائے؟" ہیڈکلرک نے کہا۔

"کیا؟"

"کہ تم نے سرکاری لفافہ استعمال کیا ہے۔"

تلک بابو نے ناراض ہو کر کہا "جب میں کہہ رہا ہوں تو ثابت ہو ہی گیا۔"

ہیڈکلرک نے تلک راج بابو کو گھور کر دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو "یقیناً سزا بھگتنا چاہتے ہو۔ اپنے بال بچوں کا بھی خیال کرو۔"

ہیڈکلرک کے تیور دیکھ کر تلک راج گھبرایا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ایک شخص دفتر میں بابو بھرتی ہوتا ہے اور بابوؤں سے ہمدردی کا دم بھرتا ہے لیکن جب وہ پچیس برس قلم گھسنے کے بعد ہیڈکلرک بن جاتا ہے تب بقیہ بابوؤں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔

تلک بابو کی استفہامیہ نگاہ دیکھ کر ہیڈکلرک مسکرا دیا "آپ انکار بھی تو کر سکتے ہیں۔"

"جی......" تلک بابو نے متحیر ہو کر کہا۔

"تلک بابو تمھیں انکار کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔" ہیڈکلرک نے رازدارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ کر کہا۔

"انکار نہ کرنے کے معاملہ میں دستور میں تو نہیں لکھا ہوا ہے۔"

"تو یہ بات!" تلک بابو نے گہری سانس لی۔

"ہاں مجھے تو وہی لکھ کر دینا ہے جو تم کہو گے۔"

تلک بابو پھر غصے میں آ گئے۔ "لیکن میں کہتا ہوں وہ کتنی بڑی بات تھی؟"

"بڑی نہ سہی لیکن سرکاری قاعدے اس کی اجازت نہیں دیتے۔"

"قاعدے...... قوانین...... اپنے افسران تو تمام اسٹیشنری ہی اپنے گھر لے جاتے ہیں۔"

"تم یہ بات ثابت کر سکتے ہو؟"

"ان سے پوچھ کر دیکھیے۔"

"اگر وہ انکار کر دیں؟"

"میں خود مال افسروں کے گھر پہنچا تا رہا ہوں۔"

"اس کے باوجود اگر وہ مکر جائیں تو......"

"میں ثابت کر سکتا ہوں۔" تلک بابو نے جذباتی ہو کر کہا۔

ہیڈکلرک بھی جذباتی ہو گیا "کیا یہ سچ ہے؟"

"سچ؟ سچ جھوٹ تو سچ جھوٹ ہی ہے۔"

"نہیں میں یہ بات نہیں مانتا۔ تم اپنے سچ کو افسروں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا سچ نہیں بنا سکتے بابو تلک راج۔"
"کیا وہ جھوٹ بول سکتے ہیں؟"
ہیڈ کلرک ہنس دیا "کیا تم دفتر کے افسروں کو جانتے ہو؟ وہ تو فائلوں پر دستخط کر کے بھی مکر جاتے ہیں کہ دستخط میرے نہیں اور تم ذرا سی اسٹیشنری کی بات کر رہے ہو۔"
"لیکن وہ افسر ہیں۔ وہ بھلا کیوں انکار کریں گے۔"
"ہر انسان اپنے ضمیر کی آواز سن کر کام کرتا ہے۔"
"کیا افسر کے پاس ضمیر نہیں ہوتا؟"
"لیکن ضمیر کوئی پنجرہ تو نہیں جس سے کوئی نجات حاصل نہیں کر سکتا......"
"لیکن پھر بھی اصول......"
"اصول بھی موم کی ناک کی طرح ہیں......"
"ہیڈ کلرک صاحب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"
"یہ سب وہی باتیں ہیں جن سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں تو صرف دہرا رہا ہوں۔"
تلک راج پرسکون ہو گیا لیکن اس ایک لمحہ کے بعد ہی وہ ہیڈ کلرک سے پوچھ رہا تھا "آپ نے میرا بیان تو ابھی نہیں لکھا؟"
"نہیں، کیوں؟"
"میں ڈپٹی چیئرمین سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"
"کیا کرو گے ملاقات کر کے؟"
"کیا کوئی فائدہ نہیں؟"
"فائدہ؟ مجھے انکوائری کے بعد فائل ان کے آگے پیش کر دینی ہے وہی سرکار کے پاس چلی جاتی ہے اور سرکار کے پاس اتنا وقت نہیں کہ مکمل فائل کا مطالعہ کرے۔ سرکار کے پاس اور بھی ضروری کام ہیں۔ مثلاً ...... خیر چھوڑو۔ تم خود ہی سمجھ دار ہو۔ میں تمہیں کیا بتا سکتا ہوں۔"
ہیڈ کلرک کی بات سن کر بابو تلک راج ڈھیلے پڑ گئے۔
"جناب میں ملازمت کے دوران کبھی ایک پنسل بھی گھر نہیں لے گیا۔"
"لے بھی جاتے تو سرکار کے کون سے منصوبے فیل ہو جاتے۔"
"لیکن میں نہیں لے گیا۔"
"تو ملک کی خوشحالی میں کس قدر اضافہ ہو گیا؟"
"تو میں......" تلک راج بابو گڑگڑانے لگے "اب ایک سرکاری لفافہ استعمال کرنے کے ساتھ انکوائری......"
ہیڈ کلرک نے ناراض ہو کر کہا "بابو تلک راج جی! کیا یہ تمھارا بیان ہے؟"
بابو تلک راج فوراً اٹھ کھڑے ہوئے "نہیں!"
"پھر؟"
"مجھے کچھ مہلت دیجیے۔"
"کس لیے؟"
"میں وکیل سے مشورہ کرنے کے بعد بیان دوں گا۔" اور وہ تیزی سے اٹھ کر چلے گئے جیسے کوئی انھیں پکڑ ہی نہ لے۔ "میں کافی قاعدے قانون جانتا ہوں لیکن پھر بھی وکیل ضرور کروں گا۔ میں عزت کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ پیسے کمبخت کا کیا ہے بیٹی کی شادی میں خرچ ہو ہی رہا ہے۔"
ہیڈ کلرک نے فائل بند کر دی اور تلک راج کو روک کر آہستہ سے کہا "وکیل کے پاس تو جاؤ گے ہی...... شام کو مجھ سے بھی مل لینا۔ میں تمھیں سب کچھ...... بتا دوں گا۔"
تلک راج کو تعجب ہوا "جی......"
ہیڈ کلرک نے کہا "سمجھ گئے نا...... بہرحال تم بھی اپنے بابو بھائی ہو......"
اس نے برانچ آفس کے ریکارڈ کیپر سے ایک سرکاری لفافہ لیا اور اس میں ۵۱/ روپے ڈال کر بابو تلک راج کے حوالے کر دیا۔ "یہ شگون کے لیے ہے......"
"مہربانی!" تلک راج نے لفافہ لیا اور بہت پھرتی سے اس لفافہ سے ایک روپے کا پرانا نوٹ نکال کر جیب میں ڈال لیا اور باقی ۵۰/ روپے سمیت لفافہ ہیڈ کلرک کی طرف بڑھا کر کہا "اسے آپ رکھ لیجیے...... میں شام کے وقت آؤں گا...... اور باقی پھر......"
(انتخاب: جاوید احمد صدیقی، بشکریہ مستقبل ۹۷، دوسری سہ ماہی)

میڈیا کا ایک فیصلہ

تبدیلی کا نقشِ اوّل بن سکتا ہے

ظہیر احمد بابر

بہتر ہوگا، ہم اس سوال کا جواب کلاس روم کے بجائے باہر کھلی فضا میں کنٹین میں بیٹھ کر ڈھونڈیں۔ یہ کہہ کر میں باہر کی طرف چل دیا، مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سوال سے پیچھا چھڑانا اب ممکن نہیں رہا۔
سر، تبدیلی کیسے ممکن ہے؟ یہ سوال ہر دوسرے دن کلاس روم میں گونجتا تھا۔ کسی سیاسی بحث سے بچنے کے لیے ہمیشہ یہ سوال گول کر دیتا یا پھر الٹا انہیں ہی اسائنمنٹ دے دیتا کہ مستقبل کے میڈیا مین کے طور پر وہ پانچ پانچ کا گروپ بنا کر پریزنٹیشن دیں کہ ان کے نزدیک کون سا ایسا کام ہے جس پر اگر کام کیا جائے تو تبدیلی کا سفر فوراً شروع ہو جائے؟ ہر پریزنٹیشن کے دوران طلبا کا جوش دیدنی ہوتا، خاص طور پر طالبات بھرپور انداز میں گفتگو میں حصہ لیتیں۔ جب طلبا کی توجہ اس جانب دلاتا، تو جواب ہوتا کہ یہ زمینی حقائق سے واقف نہیں اور خواب دیکھنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں، ورنہ تبدیلی کا یہ سفر اتنا آسان ہوتا تو کیا ۱۹۴۷ء میں جذبہ کم تھا، ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کی تحریک کیا بغیر جذبے کے چلی، ۱۹۷۰ء میں رائٹ اور لیفٹ کے طلبا کم پرجوش تو نہ تھے اور تو اور نظام مصطفیٰ تحریک جیسا جوش نہ کبھی پہلے دیکھا نہ سنا۔ ایسے میں کوئی دل جلا یہاں تک کہہ جاتا کہ ۲۰۰۷ء میں جو عدلیہ بحالی تحریک چلائی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا، "دھرتی ماں جیسی ہوگی" جیسے نغمے فضاؤں میں گونج کر گم ہو گئے اور اسے گنگنانے والے اب خود شکوے کرتے نظر آتے ہیں۔ تبدیلی صرف تب آئے گی جب حکمران تبدیل ہوں گے، یہاں تک بات پہنچتی تو اندازہ ہو جاتا کہ اب سیاست کی ہنڈیا بیچ چوراہے پھوٹے گی۔ کلاس میں بھانت بھانت کی تبدیلی کے نعرے گونجنے لگتے، کوئی کپتان کے راگ الاپتا، کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میاں دے نعرے لگاتا اور کوئی زندہ ہے بھٹو زندہ ہے کی صدا بلند کر دیتا، یوں لیکچر کا وقت تمام ہو جاتا۔

کینٹین میں بھاپ اڑاتی چائے اور گرما گرم سموسوں نے رنگ جمایا لیکن دائرہ بنائے بیٹھے ہر طالب علم کے چہرے پر تبدیلی کا سوال چسپاں تھا۔ ماحول کی کدورت کم کرنے کی کوشش میں صحافتی زندگی کا ایک واقعہ شروع کر دیا کہ ایک طویل عرصے بعد لاہور سے ایک اچھا اور معقول اخبار نکلا، جسے سب نے خوب سراہا مگر اس اخبار کے مالک کا صحافت سے دور دور تک کوئی واسطہ نہ تھا، ہر روز کوئی نہ کوئی چٹکلا ان کے نام سے دفتر میں مشہور ہو جاتا۔ ایک دن وہ رپورٹنگ سیکشن کی میٹنگ میں آئے اور چیف رپورٹر سے کہنے لگے ”آپ روز میرے پاس رپورٹروں کی تنخواہیں بڑھانے کے لیے آجاتے ہیں، لیکن جو رپورٹر اصل میں تنخواہ میں اضافے کا حقدار ہے آپ نے آج تک اس کا نام نہیں لیا۔“ یہ سن کر رپورٹنگ سیکشن میں موجود ہر شخص کے کان کھڑے ہو گئے کہ آخر وہ کون سا رپورٹر ہے جسے یوں نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ چیف رپورٹر نے حیرانی سے پوچھا ”آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“ اخبار کے مالک نے کہا ”وہی جس کی روزانہ ۶۰ رسے زیادہ خبریں شائع ہوتی ہیں۔“

یہ بات رپورٹروں کے لیے بھی انکشاف تھی۔ رپورٹنگ روم میں موجود ہر شخص کا تجسس کے مارے برا حال تھا۔ چیف رپورٹر نے دوبارہ نام جاننے کی جسارت کی تو اخبار کا مالک بولا کہ اس کا نام تو مجھے پتا نہیں، وہی جاننے تو میں یہاں آیا ہوں، البتہ اس کی خبریں (پ ر) کی کریڈٹ لائن سے شائع ہوتی ہیں۔ اخبار کا مالک یہ کہہ کر سب کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھنے لگا۔ دوسری طرف کمرے میں موجود ہر شخص کے لیے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ چیف رپورٹر نے صورتِ حال بھانپتے ہوئے اخبار کے مالک سے درخواست کی کہ آپ اپنے دفتر میں چلیں میں ابھی اس رپورٹر کو لے کر آتا ہوں۔ اخبار کا مالک جیسے ہی باہر نکلا تو رپورٹنگ روم میں قہقہوں کی برسات ہونے لگی۔ دراصل اخبار کا مالک پریس ریلیز (ایسی خبریں جو عام شہری، تنظیمیں، سیاسی جماعتیں اور ادارے اخبار کے دفتر بھجواتے ہیں) کو کسی رپورٹر کا کارنامہ سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ واقعہ سنا کر میں نے دائرے میں بیٹھے طلبا و طالبات کو دیکھا تو ان کے چہروں پر براجمان سنجیدگی ماضی کے برعکس کم ہوتی نظر نہ آئی ورنہ عام طور پر صحافتی لطیفوں پر ان کے قہقہے رکنے میں ہی نہیں آتے تھے۔

میں نے بھی کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے ایک لمبی سانس لی اور پوچھا، یہ بتاؤ...... ایک میڈیا مین کے طور پر سب سے پہلے تبدیلی کہاں ڈھونڈنے کی ضرورت ہے؟ جواب آیا۔ فوری میڈیا میں۔ اور کیا آپ کو لگتا ہے کہ میڈیا میں آئی تبدیلی سے معاشرے میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے؟ میں نے اگلا سوال داغا۔ طلبا و طالبات کی اکثریت کے اوپر نیچے ہلتے سروں نے بتایا کہ ان کا جواب ہاں میں ہے۔ تو کیا آپ نے آج تک سوچا کہ دوسروں کو دھڑا دھڑ نصیحتیں کرنے والا میڈیا خود ایسا کیا کرے کہ تبدیلی کا سفر شروع ہو جائے؟ مستقبل کے صحافیوں کی پیشانیوں پر شکنیں اُبھر آئیں۔ ایک بولا، میڈیا کو سب کا بلاامتیاز احتساب کرنا چاہیے؟ دوسرا بولا، میڈیا کو چاہیے کہ معاشرے کو شعور دے، ہر حقیقت چاہے وہ کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو، عوام کے سامنے لائے۔ کیا میڈیا ایسا کرنے کی کوشش نہیں کر رہا؟ میں نے ٹوکا۔ کر تو رہا ہے لیکن اسے مزید کوشش کرنی چاہیے؟ ایک طالب علم جلدی سے بولا۔ لیکن کیا میڈیا کی اس کوشش سے معاشرے میں امید جاگی، رائے عامہ ہموار ہوئی یا انتشار پھیلا اور مایوسی میں اضافہ ہوا؟ اس سوال پر ملا جلا ردِعمل سامنے آیا کوئی اثبات اور کوئی نفی میں بولنے لگا۔ طلبا پوری سنجیدگی سے اپنا موقف پیش کر رہے تھے۔ میں نے جسم کو ڈھیلا چھوڑا اور ان کی باتوں پر کان دھرنے لگا۔ سقراط کا سوال پر سوال کر کے شاگردوں کو مسئلہ کے حل کی طرف لے جانے کا یہ طریقہ مجھے ہمیشہ سے ہی پسند تھا اور میں ایک بار پھر اسی طریقۂ تدریس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

جیسے ہی طلبا کی بحث پٹڑی سے اترنے لگی تو میں نے سوال دوبارہ سامنے رکھ دیا، میڈیا خود سے ایسا کیا کرے کہ تبدیلی کا سفر فوری طور پر شروع ہو جائے؟ سوال مکمل ہوتے ہی ایک طالبہ نے الٹا مجھ سے پوچھا۔ سر! آپ اتنے عرصے سے میڈیا میں ہیں، اس کا جواب بھی آپ ہی کی طرف سے آنا چاہیے۔ یہ پوچھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے شوخی چھلک رہی تھی۔ میں بھی مسکرا دیا اور بولا، بالکل! سوچا بھی اور غور و خوض بھی کیا اور میری رائے میں میڈیا کا صرف ایک فیصلہ معاشرے میں اوپر سے لے کر نیچے تک ڈرامائی تبدیلی لا سکتا ہے۔ میری بات سنتے ہی طلبا کی گردنیں مزید کچھ آگے ہو گئیں جو ان کی گفتگو میں دلچسپی کو ظاہر کر رہی تھیں۔

چائے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے اپنی بات کی پرتیں کھولنا شروع کیں۔ ہماری قوم کا ایک بڑا مسئلہ ہرفن مولا ہونا ہے۔ ہر بندہ ہر کام میں ٹانگ پھنسائے نظر آتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ درزی کا کام مستری، فوجی کا کام سویلین، بیوروکریٹ کا کام ریڑھی والا نہیں کر رہا، سب لوگ اپنا اپنا کام خود کر رہے ہیں لیکن یہ کام وہ کس معیار کا کر رہے ہیں، اپنے اردگرد پھیلے مسائل کو دیکھ کر اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ ہرفن مولا، محاورے کا اگلا حصہ، ”ہرکم وچ رولا“ بھی ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی طالب علم کوئی نیا سوال اُچھالتا میں نے موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ میری رائے میں تبدیلی کا سفر جہاں انفرادی طور پر سب کو اپنے آپ سے شروع کرنا ہے، وہیں میڈیا چاہے تو یہ کام اجتماعی طور پر جلدی ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے میڈیا کو صرف ایک فیصلہ کرنا ہوگا صرف ایک فیصلہ......؟ میں سانس لینے کو رکا تو بے ساختہ آواز آئی، وہ کیا......؟ حکومت کے ہر وزیر سے صرف اس کے محکمے سے متعلق سوال پوچھا جائے۔ جملہ مکمل ہوتے ہی کئی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔ اس سے کیا ہوگا......؟

میں نے پہلو بدلا اور کہا۔ ذرا تصور کریں ہر وزیر سے الابلا موضوع پر بات کرنے کے بجائے اگر صرف اس کی وزارت سے متعلق سوال کیا جائے گا تو کتنے وزیر ہیں جو میڈیا پر آنے کا شوق برقرار رکھ پائیں گے۔ کیا اُنھیں ہر دم اپنے محکمے کی کارکردگی کے بارے میں جوابدہ نہیں ہونا پڑے گا؟ اور کچھ نہیں تو اس وزیر کو اپنے محکمے کے بارے

طُلوعِ اِسلام

جاَ الحق و زہق الباطل کہتا ہے قرآن
ان الباطل کان زھوقا باطل کی پہچان
میدان میں جب آئے مجاہد بھاگ گئے شیطان

بالآخر جیت گئے اخوان
بالآخر جیت گئے اخوان

نعرۂ حق اور شوقِ شہادت تھے ان کے ہتھیار
فرعونوں کی پسپائی پر ختم ہوئی پیکار
آزادی کا خون سے اپنے لکھا ہے عنوان

بالآخر جیت گئے اخوان

حسن البنا اور قطب کے خوابوں کی تعبیر
فرعونی ایوان میں گونجی پھر بانگ تکبیر
نیل میں التحریر کے ڈوبے فرعون و ہامان

بالآخر جیت گئے اخوان

احیائے اسلام کا مصر سے یوں اُبھرا خورشید
گلشنِ ہستی میں پھیلے گی پھر بوئے توحید
پھر عدل و احسان کی نعمت پائے گا انسان

بالآخر جیت گئے اخوان
بالآخر جیت گئے اخوان

(عنایت علی خان)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں آپ ڈیٹڈ رہنا پڑے گا۔ ذرا سوچیں کہ ایسا ممکن ہو جائے تو منظر نامہ کیسا بنے گا......؟ یہ سنتے ہی طلبا کے چہروں پر مسکراہٹیں پھیل گئیں۔ سر......! یہ تو بڑی دلچسپ صورتِ حال ہوگی۔

اس طرح تو ہر محکمہ عوام کے سامنے کھل کر سامنے آنے لگے گا اور ہوسکتا ہے حکومت ہر محکمے میں اہل افراد کو وزیر بنائے۔ طالب علموں کی سوچ کا دائرہ پھیلنے لگا تھا لیکن مجھے ابھی ایک سوال کا انتظار تھا اور زیادہ دیر نہ گزری وہ سوال ایک طالب علم کی زبان پر آہی گیا۔ سر......! کیا وجہ ہے کہ دوسروں کو ہرلمحہ نصیحتیں کرنے والا میڈیا خود اتنا سا کام کرنے کو تیار نہیں؟

برخوردار......! یہ فیصلہ کرنا جتنا سہل نظر آتا ہے، اس پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ معاشرے کی اونچ نیچ اور ضروریات کو الگ بھی کردیں تو اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے وزراء کی طرح صحافیوں کو بھی اپنے اپنے رپورٹنگ کے شعبے میں مہارت حاصل کرنا ہوگی۔ یعنی جس کا کام اسی کو ساجھے والا معاملہ ہوگا۔ میڈیا مالکان کا کام تھوڑے سٹاف کے ساتھ مکمل نہیں ہو پائے گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی مشکلات ہیں جو میڈیا مالکان کی راہ میں حائل ہوں گی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر پورا معاشرہ بدلنے کا خواہاں میڈیا اپنا صرف ایک رویہ بدل لے تو پورا منظرنامہ بدل سکتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام میڈیا متفقہ طور پر یہ کام کرے۔ اگر ایک بھی بڑا ادارہ یہ تہیہ کرلے تو باقی لوگ خود ہی پیچھے پیچھے چل پڑیں گے۔ سوال کا جواب سامنے تھا اور طلبا و طالبات کی بحث اب نیا رخ اختیار کرچکی تھی۔ میں نے بھی موقع مناسب جانا اور کینٹین کا بل دینے کے لیے اُٹھ گیا۔ ویسے تبدیلی کے اس اقدام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے......؟؟

کالم نگار روزنامہ "الشرق" کے ایڈیٹر، فیملی میگزین، دن اور ایکسپریس سنڈے میگزین میں معاون ایڈیٹر رہے۔ آج کل دُنیا نیوز سے وابستہ ہیں ■

مقبولیت اور کردار سازی ساتھ ساتھ

نئی نسل کے لیے لکھی گئی کہانیوں کی ہماری ۵/ قابلِ فخر کتابیں

بے شک یہ خوشی اور اعزاز ہمارے ادارے کے لیے باعثِ عزت ہے کہ نئی نسل کے لیے لکھی جانے والی جناب اختر عباس کی کہانیوں کی درج ذیل کتب نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں

۲۰/ ہزار کی اشاعت کو عبور کرنے والی کتابیں

۱۔ نامکمل دُعا ۲۔ کمسن مجاہد ۳۔ دو آنسو ۴۔ فاکسی پہلی بات ہی بھول گئی ۵۔ عقل کہاں سے آئی

اپنے پیارے بچوں، عزیزوں، لائبریریوں اور طلبا و طالبات کے لیے منگوا کر آپ بھی اُن صاحب ذوق اور اہلِ دانش میں شامل ہو جائیں، جو نئی نسل کو سنوارنے اور اچھی سوچ کے ساتھ پروان چڑھانے کو اپنی پہلی ترجیح سمجھتے ہیں

یاد رہے کہ فاضل مصنف کی مقبول کتاب

"آدابِ زندگی کے" ۳۵۰۰۰/ سے زائد فروخت ہوچکی ہے

آپ صرف ۲۰۰/ روپے میں یہ مقبول کتب منگوا سکتے ہیں

(اس کا نیا ایڈیشن ۳/ نئے باب کے اضافے کے ساتھ شائع ہو رہا ہے)

ادارہ مطبوعاتِ طلبہ ۱/ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور فون: 042-37553991, 0300-8702100

شیخ زاید مسجد ابوظہبی

یہ مسجد متحدہ عرب امارات کے پہلے صدر شیخ زاید بن سلطان النہیان کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ یہ عرب امارات میں سب بڑی مسجد ہے۔ چاروں کونوں پر کھڑے چار منار ۳۵۱/ فٹ اونچے ہیں اور اس کے ۸۲/ ماربل کے گنبد ہیں۔ اس مسجد کے صحن کا رقبہ ۱۸۰،۰۰۰/ مربع فٹ ہے۔ جس میں ماربل اور پچی کاری کا کام نہایت خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ اس مسجد میں ۴۰/ ہزار نمازی نماز ادا کرسکتے ہیں۔ مرکزی ہال میں ۷/ ہزار نمازیوں کے لیے گنجائش موجود ہے۔ جبکہ اطراف میں دو چھوٹے ہال ہیں اور ہر ہال میں پندرہ سو خواتین بھی نماز ادا کرسکتی ہیں۔ ہال کے اوپر مرکزی گنبد کا قطر ۱۰۶/ فٹ ہے جو کہ صحن سے ۲۷۹/ فٹ بلند ہے۔ ہال کے اندر بچھائے گئے ایرانی قالین کا رقبہ ۶۰۵۷۰/ مربع فٹ ہے جس کا وزن ۴۷/ ٹن ہے۔ اس قالین کی تیاری میں دو سال کا عرصہ لگا اور یہ ہاتھ سے بنا ہوا دنیا کا سب سے بڑا قالین ہے۔ اس مسجد میں آویزاں کیے گئے سات فانوس جرمنی سے درآمد کیے گئے ہیں۔ سب سے بڑا فانوس دنیا کا دوسرا بڑا فانوس ہے اس کا قطر ۳۳/ فٹ اور بلندی ۴۹/ فٹ ہے۔ اس مسجد کی تعمیر میں ۳۰۰۰/ سے زائد کارکنوں اور ۳۸/ مشہور تعمیراتی کمپنیوں نے حصہ لیا۔ اس مسجد کی تعمیر میں جو میٹریل استعمال کیا گیا وہ سب معدنیات ارضی سے حاصل کیا گیا ہے۔ مثلاً ماربل، گرینائٹ، کرسٹل اور سونا۔ اس مسجد کا ڈیزائن لاہور کی بادشاہی مسجد اور مراکش میں کاسابلانکا کی شاہ حسن دوم کی مسجد سے متاثر ہو کر تیار کیا گیا تھا۔ اس مسجد کی تعمیر میں ۲/ بلین درہم خرچ ہوئے جو ۵۴۵/ ملین ڈالر کے برابر ہیں۔ ابوظہبی میں تعمیر کی گئی یہ مسجد یو اے ای کی سب سے بڑی اور دنیا کی آٹھویں بڑی مسجد ہے۔

دُنیا کی خوبصورت مساجد

فقیر اللہ خان

اللہ خوب صورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ اسی لیے اس سے محبت کرنے والے بندوں نے دنیا میں اللہ کے گھر کو خوبصورتی کے لیے اپنا ہدف بنایا ہے۔ ان صفحات میں ہم آپ کے لیے دنیا کی چند ایسی بہترین اور خوبصورت مساجد کی تفصیل لائے ہیں جو آپ کی معلومات میں اضافے کا ہی نہیں، خوشی کا باعث بھی ہوں۔ مسجد بیت اللہ، مسجد نبویؐ اور مسجد بیت المقدس کا مقام و مرتبہ اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہ مساجد تو ہر طرح کے مقابلے سے ہی بالاتر ہیں۔ ان کا کسی بھی مسجد سے مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ باقی رہیں ہماری فیصل مسجد اور بادشاہی مسجد، ان کی خوبصورتی مصدقہ ہے۔ اس لیے ان مساجد کا اس مضمون میں تذکرہ نہیں کیا جا رہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلطان عمر علی سیف الدین مسجد
بروونائی

یہ شاہی مسجد سلطنت آف برونائی کے دارالحکومت بندر سری بیگوان میں واقع ہے۔ یہ مسجد ایشیائی بحرالکاہل کے خطہ کی ایک خوبصورت مسجد ہے۔ یہ مسجد برونائی کے ۲۸ ویں حکمران سلطان عمر علی سیف الدین سوم کے نام سے موسوم ہے۔ دنیائے اسلام کی یہ قابلِ دید مسجد ۱۹۵۸ء میں مکمل ہوئی۔ اس مسجد کی تعمیر میں مغل اور اٹالین فنِ تعمیر کا عکس نمایاں ہے۔ اس مسجد کی خوبصورتی دیکھ کر یہاں کے مسلمانوں اور حکمرانوں کی دینِ اسلام سے دلی عقیدت کے اظہار کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ مسجد ایک مصنوعی جھیل میں تعمیر کی گئی ہے۔ مسجد کے ماربل کے منار، سنہری گنبد، ہرے بھرے درخت، رنگ برنگے پھولوں سے لدے ہوئے لان اور اُن کے درمیان چلتے ہوئے سیکڑوں فوارے کسی جنتِ ارضی کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ پاس ہی دریا کے اوپر مسجد میں داخل ہونے کے لیے ایک خوبصورت طویل پُل بنایا گیا ہے۔ یہ مسجد ۱۴۰۰ سالہ جشنِ نزول قرآن کی خصوصی تقریبات کے سلسلہ میں بنائی گئی تھی۔ مسجد کے ایک طرف جھیل ہی میں ایک خوبصورت پُل بحری جہاز کے مشابہ بنایا گیا ہے۔ جس میں قرآن کی قرأت کے قومی اور بین الاقوامی مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔ مسجد کے منار ۱۷۱ رفٹ بلند ہیں۔ لفٹ کے ذریعہ میناروں کے اوپر چڑھ کر شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ منار شہر کے ہر حصہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ مسجد کا بڑا گنبد خالص سونے سے مزین ہے۔ اس مسجد کی تیاری میں عموماً تمام سامان باہر سے منگوایا گیا۔ اس میں استعمال ہونے والا ماربل اٹلی سے، گرینائٹ شنگھائی سے، فانوس برطانیہ اور ہال کے لیے قالین سعودی عرب سے منگوائے گئے تھے۔

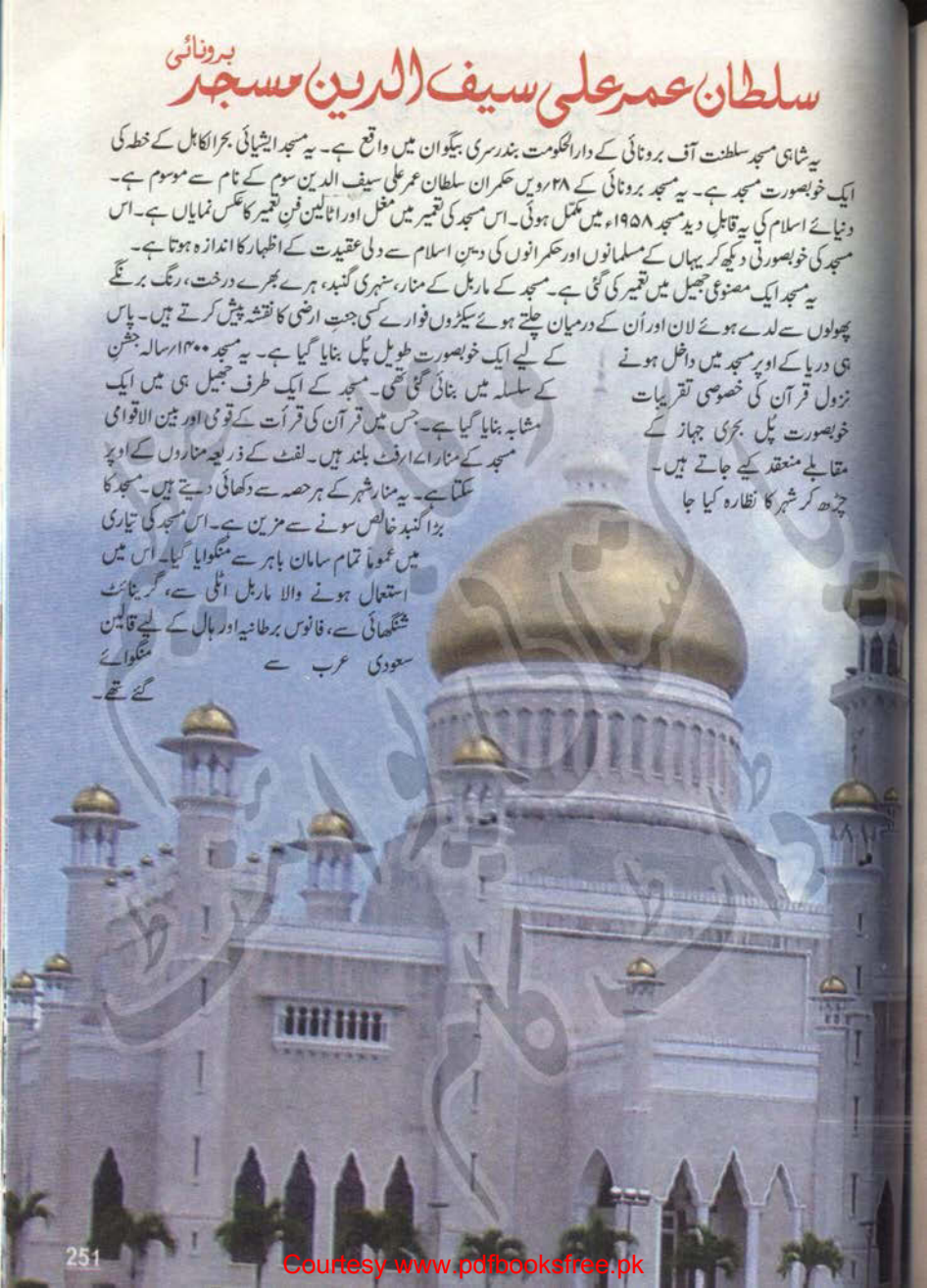

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلطان مسجد استنبول

مسجد استنبول تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ اس مسجد کا شمار ہر دور میں دنیا کی خوبصورت مساجد میں کیا جاتا ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے سلطان احمد، فاتح قسطنطنیہ کی خواہش کے مطابق اس مسجد کا خوبصورت نقشہ تیار کیا گیا۔ اس مسجد کو عرفِ عام میں نیلی (Blue) مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اس کی دیواروں پر ۲۰ ہزار نیلے رنگ کی ٹائلوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ راقم نے اس مسجد کی زیارت بھی کی ہے۔ ۱۶۰۹ء میں سلطان احمد نے شہر کے نامور علمائے کرام اور مشائخ کی موجودگی میں اس مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس وقت سلطان کی عمر صرف ۱۹ سال تھی۔ ۱۶۱۶ء میں سات سال کی تعمیر کے بعد عظیم مسجد مکمل ہوئی۔ اس مسجد کے ۶ مینار اور ۸ گنبد ہیں جن میں ایک مرکزی گنبد بڑا ہے اور اس کا قطر ۷۷ فٹ ہے اور یہ گنبد زمین کی سطح سے ۱۴۰ فٹ بلند ہے۔ جبکہ ۶ میناروں کی بلندی ۱۹۵ فٹ ہے۔ اتنی بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہ مسجد اپنے گنبدوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ یہ مسجد ۲۲۵ فٹ لمبی اور ۲۱۰ فٹ چوڑی ہے اور اس میں ۱۰ ہزار نمازیوں کے نماز ادا کرنے کی گنجائش ہے۔ عیسائیوں کے سب سے بڑے روحانی پیشوا اور موجودہ پوپ آف روم بینی ڈکٹ نے بھی ۳۰ نومبر ۲۰۰۶ء کو اس مسجد کی زیارت کی۔ پوپ اپنے جوتے اُتار کر مسجد کے داخلی دروازے کے پاس احتراماً آنکھیں بند کر کے ۲ منٹ تک خاموشی سے کھڑا رہا جبکہ اُس کے برابر مسلمانوں کے وقت کے مفتی امام مصطفےٰ ساتھ کھڑے تھے۔ امریکا کے موجودہ صدر بارک حسین اوباما بھی اپنے ترکی کے دورہ کے دوران ۷ اپریل ۲۰۰۹ء کو اس مسجد کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے۔ اس مسجد کی تعمیر کو ۴ صدیاں گزرنے کے باوجود یہ مسجد دنیا کی خوبصورت ترین مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ ہر سال اس مسجد کو دیکھنے کے لیے لاکھوں سیاح آتے اور سلطان احمد کے لیے دعا کرتے ہیں، جو مسجد کی دیوار کے زیرِ سایہ مدفون ہے۔

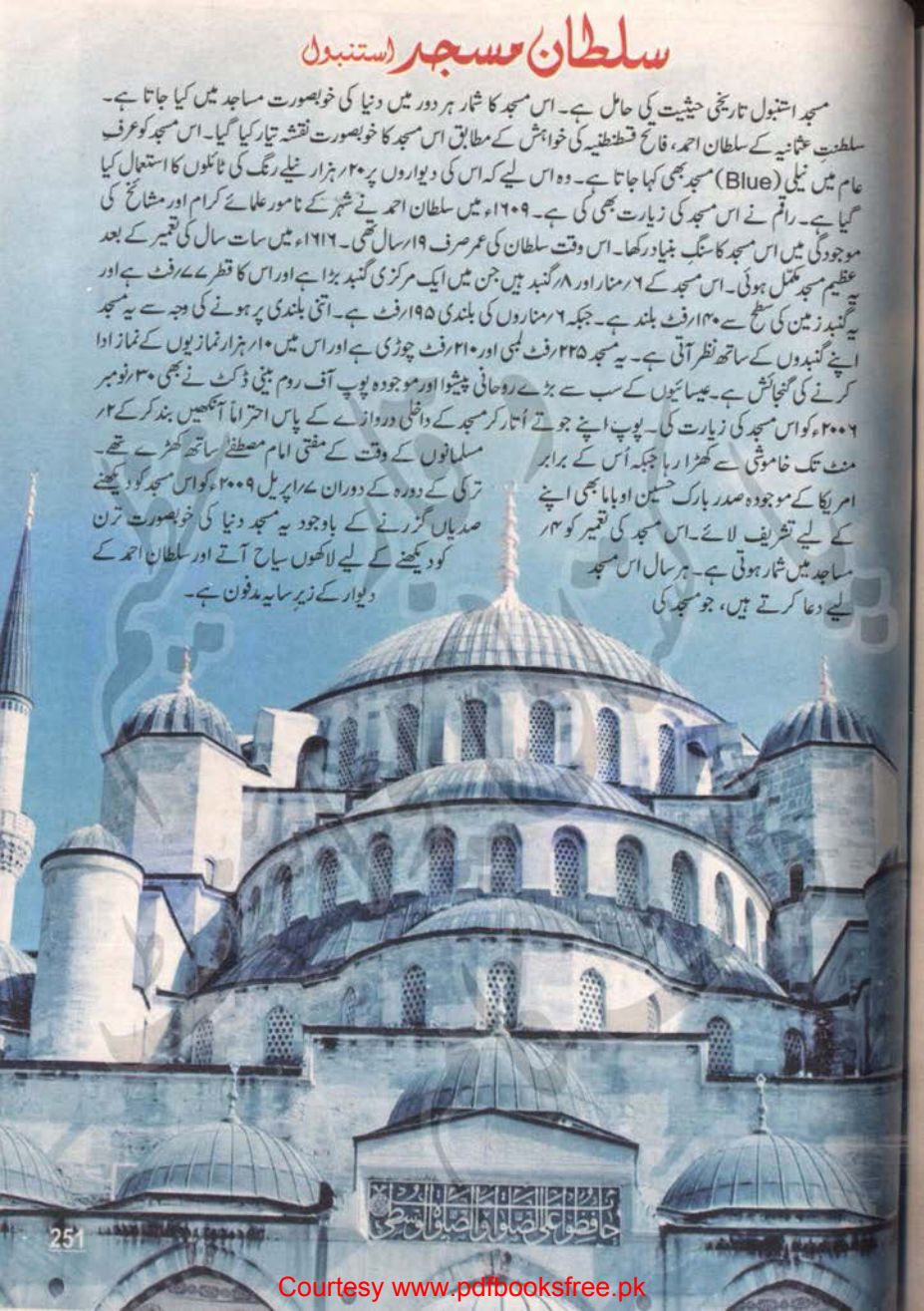

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرسٹل مسجد ملائیشیا

کرسٹل مسجد ملائیشیا کے شمال مشرقی صوبہ ترینگانو (Terengganu) کے ایک جزیرہ وان مان (Wan Man) میں واقع ہے۔ یہ مسجد اسلامک ہیریٹیج پارک میں تعمیر کی گئی ہے جو وہاں کے مقامی مسلمانوں کے ذوق وشوق کی عکاس ہے۔ اس مسجد کی تعمیر ۲۰۰۶ء میں شروع ہوئی اور ۲۰۰۸ء میں مکمل ہوئی اور وہاں کے سلطان زین العابدین نے ۸/فروری ۲۰۰۸ء کو اس مسجد کا افتتاح کیا۔ یہ مسجد اسلامی دنیا کا ایک ایسا شاہکار ہے جو سٹیل، شیشہ اور کرسٹل سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس مسجد میں ۱۵۰۰/نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ کرسٹل مسجد کے ۴/ منار ہیں اور اس کا رقبہ ۲۲۸۰۰/مربع فٹ ہے۔ دن اور رات کے وقت اس مسجد کے اوپر پڑنے والی روشنیوں کے انعکاس سے آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مسجد پانی میں تیر رہی ہے۔ کوالالمپور سے ترینگانو جانب شمال مشرق ۳۰۰/کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پتراجایا مسجد ملائیشیا

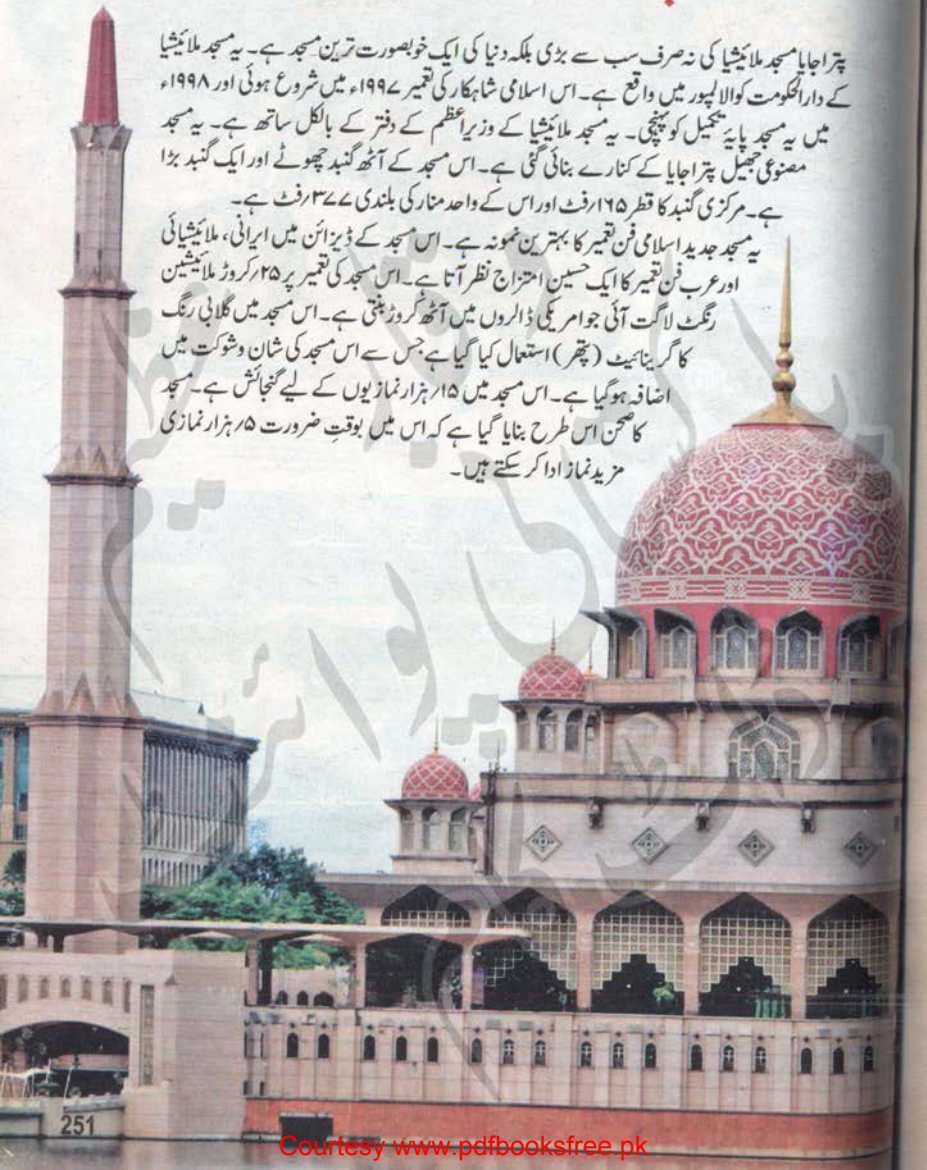

پتراجایا مسجد ملائیشیا کی نہ صرف سب سے بڑی بلکہ دنیا کی ایک خوبصورت ترین مسجد ہے۔ یہ مسجد ملائیشیا کے دارالحکومت کوالالپور میں واقع ہے۔ اس اسلامی شاہکار کی تعمیر ۱۹۹۷ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۹۸ء میں یہ مسجد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ مسجد ملائیشیا کے وزیراعظم کے دفتر کے بالکل ساتھ ہے۔ یہ مسجد مصنوعی جھیل پتراجایا کے کنارے بنائی گئی ہے۔ اس مسجد کے آٹھ گنبد چھوٹے اور ایک گنبد بڑا ہے۔ مرکزی گنبد کا قطر ۱۶۵ رفٹ اور اس کے واحد منار کی بلندی ۳۷۷ رفٹ ہے۔

یہ مسجد جدید اسلامی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس مسجد کے ڈیزائن میں ایرانی، ملائیشیائی اور عرب فن تعمیر کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اس مسجد کی تعمیر پر ۲۵ رکروڑ ملائیشین رنگٹ لاگت آئی جو امریکی ڈالروں میں آٹھ کروڑ بنتی ہے۔ اس مسجد میں گلابی رنگ کا گرینائیٹ (پتھر) استعمال کیا گیا ہے جس سے اس مسجد کی شان و شوکت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس مسجد میں ۱۵ رہزار نمازیوں کے لیے گنجائش ہے۔ مسجد کا صحن اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس میں بوقتِ ضرورت ۵ رہزار نمازی مزید نماز ادا کر سکتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلابی

قمیص میں ملبوس وہ خوبصورت اور سمارٹ نوجوان ساحل سمندر پر استادہ ہے۔ اس کی نگاہیں ڈوبتے سورج پر جمی ہوئی ہیں اور وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ یہ پُرکشش نوجوان بالی وڈ کا مشہور اداکار عامر خان ہے۔ لیکن وہ ساحل سمندر پر کرکٹ میچ میں برطانوی راج کو شکست دینے یا کسی مافیا کا تیا پانچہ کرنے نہیں آیا، بلکہ یہ اس کے ٹاک شو یا گفتگو پر مشتمل ٹی وی پروگرام ''ستیہ مے وجیتے'' کا ابتدائی منظر ہے..... وہ پروگرام جس نے بھارت میں نہ صرف مقبولیت کا نیا ریکارڈ قائم کیا بلکہ عوام سے لے کر حکومت تک کو جھنجھوڑ ڈالا۔

عامر خان دنیا کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری کا معروف اداکار اور سماجی کارکن ہے۔ اس کی دل موہ لینے والی اداکاری دیکھیے، تو مشہور امریکی فلم سٹار، مائیکل جے فاکس یاد آتا ہے اور عامر کی شہرت و عوامی مقبولیت دیکھی جائے تو ٹام کروز! اس کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ ۴۷ سالہ ہونے کے باوجود بڑے کمال سے ۲۵ سالہ نوجوان کی اداکاری کر لیتا ہے۔ وہ بھارتی فلمی صنعت میں ربع صدی گزار چکا۔ اس دوران میں عامر نے کئی بار روایتی فلمی رسم و رواج کو چیلنج کیا اور انھیں بدل کر دم لیا۔

سماجی میدان میں بھی اس کی خدمات کم نہیں۔ اس کا حالیہ مظاہرہ تب ہوا جب ستیہ مے وجیتے پروگرام دیکھتے ہوئے لاکھوں نہیں کروڑوں بھارتی مجبور ہو گئے کہ وہ اپنے گریبان میں جھانکیں، سوئے ضمیر کو جھنجھوڑ کر جگائیں اور معاشرتی برائیوں کے خلاف جہاد کریں۔

آج عامر خان نیم انقلابی رہنما بن چکا ہے جو وزیراعظم سے مل کر معاشرتی مسائل پر گفتگو کرتا، اخبار میں بالم لکھتا اور معاشرہ سدھارنے کی قوت رکھنے والی فلمیں بناتا ہے۔ اس کا خواب یہ ہے کہ بھارتی متوسط طبقہ بیدار ہو اور وہ ملک میں انصاف، قانون کی حکمرانی اور آزادئ رائے پر مبنی انقلاب لے آئے۔

عامر احساسِ فخر سے کہتا ہے ''میرے بس میں بہت کچھ ہے۔ میں چاہوں تو کہانیاں سنا کر آپ کا پتھر دل موم کر دوں۔ چاہوں تو آپ کو ہنسا دوں، یا پھر آپ کی آنکھوں میں آنسو لے آؤں۔ حتیٰ کہ کسی چیز کے متعلق آپ کا زاویۂ نظر بھی بدل سکتا ہوں۔'' گزشتہ ۱۳ مہینوں میں اگر ۵۰ سے ۸۰ کروڑ بھارتیوں پر ستیہ مے وجیتے پروگرام کے اثرات دیکھے جائیں، تو یقین ہو جاتا ہے کہ عامر سچ کہتا ہے۔

فلمی دنیا میں آمد

عامر خان ۱۴ مارچ ۱۹۶۵ء کو بمبئی میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ، طاہر حسین فلم پروڈیوسر تھا۔ چنانچہ عامر بچپن ہی سے اداکاری کی طرف مائل ہو گیا۔ ماں کے تعلق سے وہ ممتاز ادیب و سیاسی رہنما مولانا ابوالکلام آزاد کا رشتہ دار ہے۔ شاید اسی لیے وہ ایک ذہین، ذکی الحس اور دوسروں کا دکھ درد سمجھنے والا انسان بھی ہے۔

۸ سال کا تھا کہ عامر نے ''یادوں کی بارات'' نامی فلم میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ ۱۹۸۸ء میں بحیثیت ہیرو خوبرو عامر کی پہلی فلم ''قیامت سے قیامت تک'' ریلیز ہوئی۔ پہلی ہی فلم نے اُسے بالی وڈ میں صفِ اول کا اداکار بنا دیا۔ آج وہ سلمان خان اور شاہ رخ خان کے ساتھ بالی وڈ پر حکمرانی کرنے والے ''تین خانوں'' میں سے ایک ہے۔

فلمی کیریئر کے پہلے عشرے میں عامر بطور کھلنڈرے اور رومانی نوجوان کے کئی فلموں میں جلوہ گر ہوا۔ اس کی بعض فلموں کو ناکامی کا بھی منہ دیکھنا پڑا تاہم عامر بمبئی کی فلمی دنیا میں کمال پرست (Perfectionist) کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔ یعنی وہ اپنا ہر کام کمال مہارت سے انجام دینے کا شوقین ہے۔

عامر خان کو فلمی دنیا سے باہر نیک و بد حالات سے گزرنا پڑا۔ مثلاً چند مواقع پر اس کی اداکاراؤں اور ہدایت کاروں سے منہ ماری ہوئی۔ ان واقعات کو خاصی شہرت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

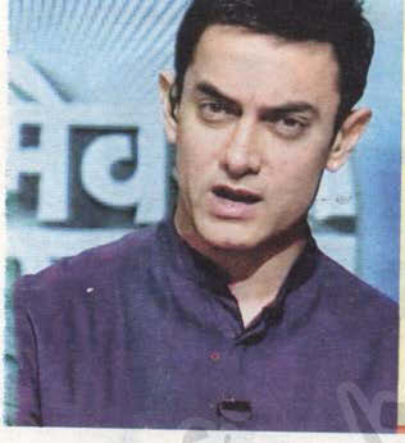

ستیہ مے وجیتے کو جایئے

ستیہ مے وجیتے کا پہلا پروگرام ۶ رمئی ۲۰۱۲ء کو نشر ہوا جبکہ آخری پروگرام جولائی کے آخری ہفتے میں دکھایا گیا۔ کل ۱۳ر پروگرام نشر ہوئے۔ یہ ستیہ مے وجیتے کا پہلا سیزن تھا، عامر اپنی فلم ''دھوم ۳'' کی شوٹنگ کے بعد دوسرا سیزن بھی انجام دینے کا متمنی ہے۔ یہ پروگرام سٹارنیٹ ورک کے تمام چینلوں اور بھارت کے قومی ٹیلی ویژن دوردرشن پر دکھایا گیا۔ مزید برآں یہ ۸ر قومی زبانوں مثلاً ملیالم، تامل، تلگو، بنگالی، مراٹھی وغیرہ میں ترجمہ (ڈب) کر کے بھی پیش ہوا۔ پروگرام اتوار کی صبح دکھایا جاتا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کا مشاہدہ کرسکیں۔

عامر نے نہ صرف ستیہ مے وجیتے کا آئیڈیا تخلیق کیا بلکہ پیش کار (پروڈیوسر) اور میزبان بھی وہی بنا۔ پانی کی کمی، بڑھاپا، فرقہ واریت، نسل پرستی، شراب خوری، ملاوٹ شدہ غذائی اشیا، گھریلو تشدد، معذوروں کے مسائل، عدم برداشت، فضول خرچی، بچوں پر جنسی تشدد اور بچیوں کو پیدائش سے قبل مار دینا پروگراموں کے نمایاں موضوع تھے۔

ملی۔ پھر وہ فلمی ایوارڈز کی تقریبات میں نہیں جاتا..... اس کا کہنا ہے کہ وہاں اداکاری کی بنیاد پر اعزاز نہیں دیے جاتے۔

بالی وڈ میں مشہور اور کامیاب ہیرو سال میں ۲/۵ر فلمیں کرتے اور کروڑوں روپے کماتے ہیں۔ لیکن عامر کئی برس سے سالانہ صرف ایک فلم میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھلا رہا ہے۔ وہ فلموں میں فحش مناظر سے پرہیز کرتا اور ضرورت پڑے، تو اپنی آواز کا جادو بھی جگاتا ہے۔ آج بھارت میں عامر حقیقی کلچرل آئیکون بن چکا ہے..... اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کو علم ہی نہیں، یہ اعزاز اسے کیونکر ملا؟

عامر خان مسکراتے ہوئے کہتا ہے'' آج بھی اگر کوئی مجھ سے دریافت کرے کہ آپ کے کیا خواب ہیں اور اگلے ۲۰ر برس میں آپ کیا بننا چاہتے ہیں، تو میں قطعیت سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال امید ہے کہ مَیں اگلے ۲۰ر سال کے دوران میں ریٹائر ہو جاؤں گا۔''

سماجی کارکن یا انقلابی کے طور پر عامر کا کیریئر سازلمحہ ۲۰۰۱ء میں آیا جب اس نے فلم ''لگان'' بنائی۔ بحیثیت پروڈیوسر یہ اس کی پہلی فلم تھی۔ تب اس نے گجرات کے پتے صحراؤں میں ۶ر ماہ گزار کر فلم بندی کی۔ لگان ایسے غریب دیہاتیوں کی داستان ہے جنھوں نے برطانوی امرا کو کرکٹ میچ جیتنے کا چیلنج دیا۔ یہ بہرحال ایسا موضوع نہیں تھا کہ فلم کو کھڑکی توڑ یا بلاک بسٹر بنا دیتا۔

انوپما چوپڑا بالی وڈ کی ممتاز فلمی ناقد ہے۔ یہ انوپما ہی ہے جس کے شوہر نے ۲۰۰۹ء میں ''تھری ایڈیٹس'' بنائی جو بالی وڈ میں سب سے زیادہ کمائی کرنے والی فلم ہے۔ عامر اس فلم کا بھی ہیرو ہے۔ وہ کہتی ہے ''اس زمانے میں ہر کوئی امریکا یا یورپ میں مقیم بھارتیوں پر فلم بنا رہا تھا لیکن عامر کو کہانی سنانے کا ملکہ حاصل ہے۔ میں تو کہوں گی کہ فلموں کے کاروبار میں وہ سب پر بھاری ہے۔''

لگان ۳ر گھنٹے ۴۵ر منٹ کی طویل فلم ہے۔ اس کے باوجود عام وخواص نے اُسے پسند کیا۔ آج بھی اس کا شمار بہترین بالی وڈ فلموں میں ہوتا ہے۔ وہ بہترین غیرملکی فلم کے شعبے میں آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئی۔ عامر اس تقریب میں شرکت کرنے ضرور گیا۔

ایک یادگار فلم دینے کے بعد عامر ۴ر سال فلمی دنیا سے غیرحاضر رہا۔ اس دوران عامر نے ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کے باعث اپنی بیوی کو طلاق دی اور ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے شادی کرلی۔ پھر عامر دنیائے فلم میں وارد ہوا تو سماجی و سیاسی مسائل اس کی فلموں کے بنیادی موضوع بن گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''رنگ دے بسنتی'' میں ان بے فکرے اور من موجی طلبا و طالبات کو دکھایا گیا جو کرپشن کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ ''تارے زمین پر'' میں ڈیس لیکسیا (Dyslexia) کے شکار بچوں کی حالت زار عیاں کی گئی۔ ''تھری ایڈیٹس'' میں کمزور بھارتی نظام تعلیم فلم کا موضوع تھا۔ لندن یونیورسٹی میں بھارتی سینما پڑھانے والے پروفیسر راحیل ڈاور کا کہنا ہے ''عامر بڑا جوش و جذبہ رکھتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ بامقصد اور کوئی پیغام دینے والی فلمیں بنائی جائیں۔''

ستیہ مے وجیتے کی آمد

چند برس قبل ایک ٹیلی ویژن نیٹ ورک نے عامر خان کو ''گیم شو'' کرنے کی پیشکش کی تاہم اس نے انکار کر دیا۔ وہ کوئی بالکل مختلف اور تعمیری ٹی وی پروگرام کی میزبانی کرنا چاہتا تھا۔ وہ پھر غور و فکر کرنے لگا اور یوں ستیہ مے وجیتے کے آئیڈیا نے جنم لیا۔

یہ درست ہے کہ ستیہ مے وجیتے کی خوب تشہیر ہوئی، تاہم کوئی بھی مصنوعہ محض اشتہار بازی سے مقبول نہیں ہوتی۔ ستیہ مے وجیتے کو دراصل کئی وجوہ کی بنا پر زبردست کامیابی ملی اور وہ لاکھوں لوگوں کا محبوب ٹی وی پروگرام بن گیا۔

اول وجہ یہ کہ پروگرام میں ان مسائل پر کھل کر گفتگو ہوئی جن پر عام بھارتی عموماً بات نہیں کرتے یا انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دوم عامر خان کی ذہانت بھری گفتگو اور متانت آمیز میزبانی نے پروگرام کو چار چاند لگا دیے۔ سوم ہر مسئلہ کو محض انسانی نقطہ نظر سے دیکھ کر یہ کوشش کی گئی کہ اُسے تعمیری انداز میں حل کیا جائے۔ ہر پروگرام ذات پات، طبقاتی، مذہبی اور سیاسی کشمکش سے ماورا تھا۔ چہارم یہ کہ پروگرام کا جو موضوع ہوتا، اس پر بھرپور تحقیق ہوتی اور تمام ضروری پہلو سامنے لائے جاتے۔

ایک کی طاقت

دشرتھ مانجھی، ایک گڈریا، کیوں ۲۲ سال پہاڑ سے لڑتا رہا؟

(عامر خان کا چشم کشا کالم)

''میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ میں سوا ارب انسانوں میں محض ایک انسان ہوں۔ بالفرض اگر میں تبدیل ہو بھی گیا، تو اس سے معاشرے پر کیا فرق پڑے گا؟ پھر دوسرے کیسے بدلیں گے؟ انھیں کون بدلے گا؟ پہلے دوسرے بدل جائیں، تو پھر میں بدل جاؤں گا۔'' میں روزمرّہ کام انجام دیتے ہوئے اکثر ایسے منفی جملے سنتا ہوں۔ تاہم دشرتھ مانجھی کی داستان ان تمام جملوں کا منہ توڑ جواب ہے۔ داستان یہ سچائی آشکار کرتی ہے کہ محض ایک آدمی بھی کارہائے نمایاں دکھا سکتا ہے۔ یہ ہمیں ایک کی طاقت سے روشناس کراتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ حقیقتاً انسان پہاڑ ہلا سکتا ہے۔

گیلور ریاست بہار کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو چاروں طرف سے سنگلاخ پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے۔ نزدیک ترین قصبے تک پہنچنے کے لیے دیہاتیوں کو ۲۰۰ کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑتا۔ تاہم ایک پہاڑی راستہ بنتا، تو یہ سفر صرف ۵۰ کلومیٹر رہ جاتا۔ ایک دن گاؤں کے نوجوان، دشرتھ مانجھی نے طے کیا کہ وہ پہاڑی توڑ کر راستہ بنائے گا۔ اس نے اپنی بکریاں بیچ کر ہتھوڑا اور چھینی خریدی اور پہاڑی توڑنے کے کام کا آغاز کر دیا۔ یہ دیکھ کر کئی گاؤں والوں نے اس کا مذاق اُڑایا اور اُسے پاگل قرار دیا۔ تاہم دشرتھ مانجھی ان کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے کام میں مگن رہا۔ اُسے پہاڑی کاٹ کر راستہ بناتے ہوئے ۲۲ سال لگ گئے، مگر دشرتھ نے ہمت نہ ہاری اور کام کو تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرکاری مشینری پر اثرات

ستیہ مے وجیتے نے صرف عوام ہی کو نہیں جھنجھوڑا بلکہ اپنے حال میں مست سیاسی حکومت اور افسرشاہی کو بھی حقائق دنیا سے متعارف کرایا۔ ایک پروگرام میں طبی شعبے میں پائی جانے والی کرپشن افشا ہوئی اور مطالبہ کیا گیا کہ بھارتی عوام کو سستی ادویہ ملنی چاہئیں۔ بعدازاں پارلیمنٹ میں شعبۂ طب کے متعلق بحث ہوئی تو اس میں عامر کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔

ایک پروگرام میں ہاتھ سے فضلہ اُٹھانے والے مردوزن کی بپتا بیان ہوئی۔ بعدازاں عامر بھارتی وزیراعظم منموہن سنگھ سے ملا تاکہ اس ذلت آمیز پیشہ کا خاتمہ کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ واضح رہے بھارت میں تقریباً ۵/لاکھ مردوزن اس پیشہ سے وابستہ ہیں۔

پروگرام نے بھارتی متوسط طبقہ کو بھی خواب غفلت سے بیدار کیا۔ دراصل بھارت کی ظاہری معاشی ترقی سے خصوصاً شہری طبقہ یہی سمجھتا ہے کہ بیشتر قومی مسائل حل ہوچکے، لیکن ستیہ مے وجیتے نے یہ دیومالا پاش پاش کردی۔ یہ پروگرام حقائق کو پوری طرح بے نقاب کرکے شہری و دیہی آبادی کے سامنے لے آیا۔

نریندر کمار نئی دہلی کا ممتاز ماہر عمرانیات ہے۔ وہ کہتا ہے ”پروگرام نے بھارتیوں کو یاد دلایا کہ ہمارے معاشرے میں مسائل کم نہیں ہوئے۔ مزید برآں اس نے بحث مباحثے کا آغاز کیا اور لوگوں کو مدد دی کہ وہ مسئلہ کا حل دریافت کرلیں۔“

پروسیتا دے گا اعتراف جرم

ستیہ مے وجیتے کا پہلا پروگرام ان معصوم بچیوں کے متعلق تھا جنھیں شقی القلب والدین پیدا ہونے سے قبل ہی قتل کر دیتے ہیں۔ پروگرام میں ایشایا گنگ نے رونگٹے کھڑے کر دینے والی اپنی داستان الم سنائی۔ ۸/برس میں اس کے خاوند نے ۶/بچیاں پیدائش سے قبل ہی مار ڈالیں۔ پھر خاوند نے ایشا کے چہرے پر تیزاب پھینکا اور اُسے گھر سے نکال دیا۔

یہ پروگرام دیکھتے ہوئے لکھنؤ کی پروسیتا دے زاروقطار رونے لگی۔ احساس گناہ اور ضمیر کے کچوکوں نے اُس کا دل و دماغ چھلنی کردیا۔ اُسے یاد ہے کہ ۴/برس قبل وہ دوسری بار حاملہ ہوئی۔ اس سے قبل وہ ایک پیاری سی بچی کی ماں بن چکی تھی۔ جب اسکینگ سے پتا چلا کہ حمل پھر لڑکی کا ہے، تو شوہر نے زبردستی ضائع کرادیا۔ دراصل لاکھوں شوہروں کے مانند اُسے بھی بیٹا درکار تھا۔ اب جو پروسیتا نے پروگرام دیکھا، تو روتے ہوئے چیخ چیخ کر کہنے لگی ”ہاں، میں نے اپنے بچے کو اس لیے مار ڈالا کہ وہ لڑکی نکلا۔“

بھارت میں باشعور اور تعلیم یافتہ طبقہ بہت پہلے یہ جان چکا تھا کہ ملک میں لڑکیوں کی تعداد کم ہورہی ہے۔ گو حکومت سخت قوانین بنا چکی، شہروں اور دیہات میں ہزاروں مرد ہر سال پیدائش سے قبل ہی الٹراساؤنڈ دیکھ کر بیٹیاں مار ڈالتے ہیں لیکن عامرخان کے پروگرام نے بھارت بھر میں اتنی سنسنی پھیلائی اور لوگوں کو ایسا غم وغصہ دکھانے پر مجبور کیا کہ ریاست راجھستان نے یہ مذموم عمل روکنے کے لیے ایک خصوصی کمیٹی بنا دی۔ یاد رہے اسی ریاست میں بیٹیوں کا قتل بہت عام ہے۔

تلوین سنگھ معروف بھارتی سیاسی کالم نگار ہے۔ اس نے اپنے ایک کالم میں لکھا ”یہ عجیب امر ہے اور طرفہ تماشا بھی کہ بالی وڈ کے ایک اداکار نے بھارتی صحافت کی کمزوریاں اور خلا بھی پر عیاں کردیے۔ اس پروگرام نے

ذرا تصور کیجیے کہ اُسے اپنا کام انجام دیتے ہوئے روزانہ کتنی دشواریوں اور کٹھنائیوں سے نبرد آزما ہونا پڑا ہوگا۔ اس کے باوجود صرف ہتھوڑے اور چھینی سے لیس ایک انسان پہاڑ سے ٹکرا گیا۔ سوچیے، اس نے پہلے دن کتنے مربع انچ چٹان توڑی ہوگی؟ اس دن شام کو گھر جاتے ہوئے اس کے کیا احساسات تھے؟ ایک ہفتہ بعد اس کا کام کہاں تک پہنچا؟ تب اس کے جذبات کی نوعیت کیا تھی؟ یقیناً ایک ہفتے بعد اُسے اپنی منزل دور، بہت دور لگی ہوگی۔ جب لوگوں نے مذاق اُڑایا اور اس کی ہمت شکنی کی، تو دشرتھ نے کیا سوچا ہوگا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ مسلسل ۲۲/سال اپنی مہم سر کرتا رہا؟

اب آپ کو اور مجھے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں دشرتھ مانجھی بننا چاہیے یا ان دیہاتیوں جیسا جنھوں نے اُسے بھٹکانے کی بھرپور کوششیں کیں؟ دشرتھ نے ایسے کام کا بیڑا اٹھایا جس کی تکمیل پر کبھی کو فائدہ ہوا۔ لیکن ساتھی بننے کے بجائے دوست احباب اس پر آوازے کستے رہے۔

چنانچہ کیا ہمیں دیہاتیوں جیسا بننا چاہیے یا ہم دشرتھ مانجھی کی طرح زندگی گزاریں جو بے یارومددگار ہونے کے باوجود محض یقین کی طاقت کے بل پر اپنے کام میں جُتا رہا؟ ہم میں سے ہر ایک کو خود سے یہ سوال پوچھنا چاہیے اور اس کے جواب ہی میں ہمارا مستقبل پوشیدہ ہے۔ ہمارے جوابات ہی میں درج ذیل سوالوں کے جواب بھی پوشیدہ ہیں:

کیا میں ملک وقوم کی تعمیروترقی میں حصہ لینے کا خواہش مند ہوں؟ میں یقین کی دولت چاہتا ہوں یا شک و شبہات کا زہر؟ کیا میری خواہش ہے کہ پورے جوش وجذبہ سے اپنے خوابوں کی تکمیل کروں یا ایک نک چڑھا، منفی ذہن رکھنے اور دوسروں کی بھی ہمت شکنی کرنے والا بن جاؤں؟

میں اس خواب پر یقین رکھتا ہوں جو ہمارے وطن کے بانیوں نے دیکھا تھا کہ اس ملک کے تمام شہریوں کو انصاف، آزادی اور حقوق میسر ہوں گے۔ قانون سب کو ایک نظر سے دیکھے گا اور کسی کو دوسرے پر سیاسی، معاشی یا مذہبی لحاظ سے فوقیت حاصل نہیں ہوگی۔

بعض ہم وطنوں کا خیال ہے کہ یہ خواب مردہ ہوچکا، مگر میں اس امر سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ ضرور ہے کہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا، مگر وہ ختم نہیں ہوا۔ آج بھی ہزاروں بھارتیوں کے دلوں میں یہ خواب زندہ ہے۔ سیکڑوں بھارتی پوری زندگی بتا دیتے ہیں کہ یہ خواب مرنے نہ دیں۔ ان میں سے اکثر کو خبر نہیں ہوتی کہ یوں وہ بھارتی آئین کا جھنڈا بلند کیے رکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ گزشتہ ۶۵/برس کے دوران ہم میں سے کئی لوگ کچھ چالاک، کچھ زیادہ ہی عملی، کچھ تنگ مزاج، کچھ مادہ پرست اور خودغرض ہوچکے۔ چنانچہ اب ضرورت ہے کہ ہم اپنے دلوں میں کچھ اُمید، آدرش، ایمان، یقین، اعتماد، معصومیت..... اور کچھ دیوانگی کو جگہ دیں۔ تصور کیجیے، اگر ایک دشرتھ مانجھی پہاڑ چیر سکتا ہے، تو سوارب دشرتھ مانجھی تو دنیا ہلا دیں گے۔

ستیہ مے وجیتے کا میرا سفر اختتام پذیر ہوا مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ خاتمہ نہیں درحقیقت آغاز ہے۔ اس اُمید بھرے آغاز کے موقع پر میں رابندرناتھ ٹیگور کی درج ذیل دعا پڑھتے ہوئے اپنا سر جھکا رہا ہوں:

جہاں ذہن خوف سے آزاد ہو اور سر بلند
جہاں علم مفت ہو
جہاں الفاظ سچائی کی گہرائی سے جنم لیں
جہاں عقل و دانش کا چشمہ صحرا میں گم نہ ہو
اے خدا
آزادی کی اسی جنت میں میرے ہم وطنوں کو بیدار کرنا

ستیہ مے وجیتے..... جیت صرف سچ کی

urdudigest.pk
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزشتہ ۱۳ مہینوں میں اگر ۵۰ سے ۸۰ کروڑ بھارتیوں پر ستیہ مے وجیتے پروگرام کے اثرات دیکھے جائیں، تو یقین ہو جاتا ہے کہ عامر سچ کہتا ہے

صحافیوں کو باور کرایا کہ مسائل پر بار بار لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ کبھی نہ کبھی تو حل ہو جائیں۔“

آخری پروگرام

سیزن کے آخری پروگرام میں عامر خان نے بھارتی معاشرے کے ایسے گمنام ہیروز کو پیش کیا جو مشکلات کے باوجود حق کی راہ پر گامزن رہے اور سیکڑوں لوگوں کی زندگیاں بدل ڈالیں۔ ستیہ مے وجیتے کے ہر پروگرام کا آغاز ایک منفرد گیت سے ہوتا۔ اس پروگرام کا گیت کچھ یوں تھا:

”نکل پڑو رے بندھو، نکل پڑو رے
نکل پڑو رے
ناممکن بھی ممکن ہووے، کر کے دیکھو رے بندھو
نکل پڑو رے“

اس گانے کے ذریعہ لوگوں کو پیغام دیا گیا کہ وہ پہلا قدم تو اٹھائیں، پھر ثابت قدمی و محنت سے وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ پہلے مہمان سرودایہ ٹرسٹ، گجرات کے ٹرسٹی تھے۔ سانحہ گودھرا کیمپ کے بعد جب انتہاپسند ہندو پوری ریاست میں مسلمانوں کا قتل عام کرنے لگے، تو بیسیوں مسلم بچے یتیم ہو گئے۔ سرودایہ ٹرسٹ نے پھر کئی مسلم بچوں کو پناہ دی۔ ٹرسٹیوں کو انتہاپسند ہندوؤں نے دھمکیاں دیں، مگر وہ بدستور مسلم بچوں کو پناہ دیتے رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

اسی طرح مقبوضہ کشمیر میں ایک خاتون کشمیری پنڈت، آشا بھٹ کی داستان نے بھی دلوں کو چھوا اور امن کے دیپ جلائے۔ آشا مسلم اکثریتی علاقہ میں مقیم تھی۔ جب علاقہ میں بھارتی فوج اور مجاہدین کے مابین مجادلہ بڑھا، تو اس نے خوفزدہ ہو کر نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن جب آشا نے اپنا فیصلہ گاؤں کے مسلم پڑوسیوں کو سنایا تو انھوں نے زبردستی اُسے روک لیا۔ پڑوسیوں نے آشا کو یقین دلایا کہ مجاہدین امن پسند شہریوں کو کچھ نہیں کہتے۔ چنانچہ آشا نے فیصلہ تبدیل کر لیا۔ یہی نہیں، بعدازاں وہ گاؤں کی سرپنچ (مکھیا) منتخب ہوئی۔ آج بھی گاؤں میں ہندو اور مسلم گھرانے امن و ہم آہنگی سے رہ رہے ہیں۔ غرض ستیہ مے وجیتے کے ہر پروگرام میں بھارتی معاشرے کے زخم دکھاتے ہوئے عامر خان نے ایسی ہستیوں کو بھی متعارف کرایا جو کئی رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

تنقید کی چھری

ستیہ مے وجیتے اور عامر خان کو تنقید کی چھری تلے سے بھی گزرنا پڑا مثلاً بعض دانشوروں نے عامر پر یہ الزام لگایا کہ وہ لوگوں کے جذبات سے کھیل رہا ہے۔ اس پر یہ الزام بھی لگا کہ اگر اُسے غریبوں کا اتنا ہی خیال ہے، تو وہ فی پروگرام ۳ کروڑ روپے کیوں لیتا رہا؟

عامر خان مثبت تنقید کو سراہتا اور منفی سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ اس کا کہنا ہے ”تعمیری تنقید کے ذریعے میں خود کو نکھارتا ہوں۔ ورنہ منفی تنقید نقصان پہنچانے کے علاوہ کوئی خدمت انجام نہیں دیتی۔“ بھارت میں یہ رجحان عام ہے کہ کوئی اداکار یا اداکارہ سماجی میدان میں آ نکلیں، تو رفتہ رفتہ وہ سیاست میں پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم عامر کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ لوگوں کے دُکھ درد بٹا کر ہی خوش ہے۔ ■

بھارت کی ایک گھی بنانے والی کمپنی سے آئی ٹی کی دنیا کے بڑے نام ”وائپرو“ تک کا سفر

آئی ٹی کمپنی، وائپرو (Wipro) اور رفاہی کاموں سے عالمی پہچان بنانے والے باہمت شخص کی زندگی کی چند جھلکیاں

نیا بل گیٹس

عظیم پریم جی

بل گیٹس کی طرح پریم جی بھی اپنی دولت کا بڑا حصہ اپنی زندگی میں ہی وسائل سے محروم لوگوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں

عاطف مرزا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۵۰

برس قبل چھوٹی دکانوں پر گھی کنستروں میں فروخت ہوتا تھا۔ کوئی شخص محلے کے دکاندار سے گھی خریدنے جاتا تو دکاندار ہاتھ اس کنستر میں ڈال کر پیالے کے ذریعے گھی نکالتا اور پھر اسے ترازو میں تولتا تھا۔ اس گھی کے ڈبے کے اردگرد دیکڑوں مکھیاں اور مچھر منڈلا رہے ہوتے تھے۔

نوجوان عظیم پریم چند جی کے لیے یہ منظر تکلیف دہ تھا۔ اس کی نفاست پسندی اسے اس منظر کو بدلنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہ نوجوان گھی بنانے والی ایک مقبول کمپنی کے مالک کا بیٹا تھا۔

پریم جی کو اس کے والد نے انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے امریکی یونیورسٹی سٹین فورڈ (Stanford) بھیجا۔ اس کے لیے ایک آپشن یہ تھا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد امریکا میں کیریئر کی منصوبہ بندی کرے لیکن اچانک تبدیل ہونے والے حالات اسے اور ہی طرف لے گئے۔

۵۱/سال کی عمر میں اس کے والد ہارٹ اٹیک سے انتقال کر گئے تو پریم جی نے واپس بھارت آکر اپنے خاندانی کاروبار سے منسلک ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ۱۹۶۰ء میں وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بمبئی آگیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۱/برس تھی۔

واپسی پر اسے کوکنگ آئل کمپنی کا چیف ایگزیکٹو منتخب کیا گیا۔ اس کمپنی کی بنیاد ۱۹۴۵ء میں پریم جی کے والد نے رکھی تھی۔ کمپنی کی پہلی میٹنگ میں ایک شیئر ہولڈر نے پریم جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا نوجوان میں تمھیں مشورہ دوں گا کہ اپنے شیئرز کسی سینئر کو فروخت کردو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہوگا کیونکہ تم اس کمپنی کے معاملات کبھی بہتر طریقے سے نہیں چلا پاؤ گے۔

وہ اس حوصلہ شکنی سے گھبرانے والا نہیں تھا۔ وہ کمپنی کو آگے لے کر جانے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ وہ گھی پیکٹس میں پیک کرکے فروخت کرنے کے تصور سے جدت لے کر آیا۔ یہ ایک انقلابی تصور ثابت ہوا اور اسے زبردست مقبولیت ملی۔ اس کے بعد کمپنی صابن، آئل اور ڈائیپر بھی بنانے لگی۔

۳/سال کے عرصے میں کمپنی مستحکم ہوگئی اور وہ لائٹ بلب، انجینئرنگ کے آلات، ہائیڈرالک سلنڈر بھی بنانے لگی۔ پہلے ۵/سالوں میں اس کا ٹرن اوور ۴۰/ملین روپے سے بڑھ کر ۱۹۴/ملین روپے تک پہنچ گیا۔

آج وائپرو (Wipro) آئی ٹی سروسز، کنسلٹنگ اور آؤٹ سورسنگ خدمات فراہم کرنے والی بین الاقوامی کمپنی ہے۔ اس کا ہیڈکوارٹر انڈیا کے شہر بنگلور میں ہے۔ ۷/بلین ڈالر ریونیو کی حامل اس کمپنی کے ملازمین کی تعداد ایک لاکھ ۳۰/ہزار سے زائد ہے۔ اس کا کام دنیا کے ۵۴/ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ وائپرو فورچون ۵۰۰/کی نمایاں کمپنیوں کے ساتھ کام کرتی ہے۔ آؤٹ سورسنگ کی دنیا میں ریسرچ اور ڈویلپمنٹ کی خدمات دینے والی دنیا کی بڑی کمپنیوں میں شمار کی جاتی ہے۔

پریم جی کو انڈیا میں آؤٹ سورسنگ کے کام کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ نوکیا پروڈنشل اور مائیکروسافٹ جیسی کمپنیوں نے ان کے ساتھ مل کر اپنا کام انڈیا میں آؤٹ سورس کیا۔

اس کمپنی نے گھی بنانے سے اپنا سفر شروع کیا۔ کمپنی کے ''لوگو'' میں سورج مکھی کی موجودگی آج بھی اس کے ابتدائی کاروبار کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

پریم جی نے تعلیم ادھوری کیوں چھوڑ دی؟
وہ ترقی کے لیے کرپشن اور رشوت کو کیوں رُکاوٹ سمجھتے تھے؟
کیا دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے ذہانت کافی ہے؟
دُنیا کا امیر شخص سادگی پر کیوں یقین رکھتا ہے؟

عظیم پریم جی آج دنیا کے امیرترین افراد میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کی دولت کا اندازہ ۱۵/بلین ڈالر سے زائد لگایا جاتا ہے۔ انھیں ایشیا ویک نے دنیا کے ۲۰/بااثر ترین افراد میں شمار کیا اور ٹائم میگزین نے ۲/مرتبہ دُنیا کے ۱۰۰/مؤثر ترین افراد کی فہرست میں شامل کیا۔

عظیم پریم جی نے ہمیشہ امکانات پر نظر رکھی۔ ۷۰ء کی دہائی میں معاشی پالیسیاں تبدیل ہوئیں۔ بھارتی حکومت نے غیرملکی فرمز سے کہا کہ اپنے آپریشنز میں ۶۰/فیصد تک بھارتی لوگوں کو شامل کریں۔ ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے کمپیوٹر بنانے والی کمپنی آئی بی ایم (IBM) نے بھارت میں اپنے آپریشنز ختم کردیے۔ اس فیصلے سے کئی قابل لوگ بیروزگار ہوگئے۔ عظیم پریم جی نے اس ٹیلنٹ کو اپنے ساتھ ملا کر ٹیکنالوجی کمپنی کا آغاز کردیا۔

۱۹۷۷ء میں انھوں نے کمپنی کو وائپرو پراڈکٹس کا نام دیا۔ وائپرو نے اپنے کمپیوٹر متعارف کروائے۔ سافٹ ویئر کے پوٹینشل کو دیکھتے ہوئے پریم جی نے سافٹ ویئر کا رخ کرلیا۔ سافٹ ویئر میں کمپنی نے اپنی پہچان بنائی تو کئی بڑی کمپنیاں آئی ٹی کے متعلقہ کاموں کو بھارت میں آؤٹ سورس کرنے لگیں۔

وائپرو کی کامیابی میں پریم جی کی کاروباری سوجھ بوجھ کے علاوہ ان کی دیانت داری کو بھی اہم سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں حکومتی افسر نے وائپرو (Wipro) کے آفس میں بجلی مہیا کرنے کے لیے رشوت کا مطالبہ کیا۔ پریم جی نے نہ صرف انکار کردیا بلکہ اس رشوت سے ڈیڑھ سو گنا زیادہ رقم خرچ کرکے پاور پلانٹ لگا لیا۔ اسی دیانت داری کی پالیسی کے باعث دفاعی اور خلائی معاہدات میں وائپرو کو ترجیح ملتی رہی۔

اپنی اس خوبی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں ہی یہ جان لیا تھا کہ ہمارا کردار ہمارا مقدر بن جاتا ہے۔ ایک فرد، ایک ادارے اور ایک معاشرے کا کردار اس کی کامیابی کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے۔ اگر آپ وائپرو کو ایک کامیاب کمپنی سمجھتے ہیں تو میں اس کامیابی کی سب سے اہم وجہ اس کی اقدار کو کہوں گا۔ ہم نے شروع میں ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ ہمارے تمام کاموں اور فیصلوں کی رہنمائی ہماری اقدار کریں گی۔ ہم نے دیانت داری سے کام لیا۔ اسی وجہ سے ہم بدترین کاروباری حالات میں بھی مشکل فیصلے کرنے میں کامیاب رہے۔ ہم نے ۷۰ء کی دہائی کی ابتدا ہی میں اپنی اقدار کا تعین کرلیا تھا۔ آج کل تو یہ محض ایک فیشن بن کر رہ گیا ہے۔

پریم جی کا کہنا ہے کہ ایک کمرشل ادارہ اگر نفع کمانا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ دولت کے پیچھے نہ بھاگا جائے۔ ہمیں ایسا ادارہ بنانا ہوگا جہاں ہر ملازم کو موقع ملے کہ وہ خوشی سے کام کرے۔ ایسا کام جو لوگوں کی خدمت جیسا مقصد لیے ہوئے ہو۔ ہمیں ایسا ادارہ بنانا ہوگا جو جدت پسندی، دیانت داری اور صارفین کی خدمت جیسی اقدار پر یقین رکھتا ہو۔ جب آپ ہر روز اور ہر لمحہ ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اقدار پر عمل کریں گے تو نفع خود بخود ملنے لگے گا۔

بزنس ویک کے سینیئر لکھاری سیٹو ہام نے بنگلور ٹائیگرز کے نام سے عظیم پریم جی کی کرشماتی شخصیت، انقلابی سوچ اور وائپرو کمپنی کی کامیابی پر شہرہ آفاق کتاب لکھی ہے۔ اس میں وائپرو کی کامیابی کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے بزنس کی ترقی کے اصول لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہر روز جدت پسندی سے کام لیں۔ کسٹمرز پر سے اپنی توجہ ہٹنے نہ دیں۔ ملازمین میں کام کی لگن پیدا کریں۔ تیزی سے ترقی کے لیے ۳؍سال آگے کی منصوبہ بندی کریں۔ سٹیو ہام نے لکھا ہے کہ پریم جی ان کاروباری شخصیات میں سے ہیں جو رشوت نہ دینے پر یقین رکھتی ہیں۔

بل گیٹس دنیا کی سب سے بڑی سافٹ ویئر کمپنی کے بانی ہیں اور انھیں دنیا کے مؤثر ترین افراد میں شمار کیا جاتا ہے۔ ۲۰۰۰ء میں انہوں نے بل اینڈ میلنڈا گیٹس کے نام سے رفاہی ادارہ بنایا۔ یہ ادارہ عالمی سطح پر صحت کو بہتر بنانے اور غربت کے خاتمے کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ دنیا کے بڑے رفاہی اداروں میں سے ایک ہے اور اس کے پاس ۳۳؍بلین ڈالر سے زائد رقم موجود ہے۔

بل گیٹس کی طرح پریم جی اپنی آئی ٹی کمپنی وائپرو اور رفاہی کاموں کے حوالے سے عالمی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر میں اپنی اولاد کو اپنی دولت کا ایک چھوٹا حصہ بھی دے دوں تو اسے خرچ کرنے کے لیے انھیں کئی زندگیاں درکار ہوں گی۔ ان کی سوچ یہ ہے کہ جنھیں بہت کچھ ملتا ہے انھیں بہت کچھ معاشرے کو واپس بھی کرنا چاہیے۔

99 ترقی کے لیے جدت اور تخلیقی ذہن ضروری ہے۔ ہماری جدت کا سفر صارفین کے خیالات سننے سے شروع ہوتا ہے۔ اچھی پراڈکٹس سامنے لانے میں صارفین سے بہتر رابطہ سب سے اہم ہے 66

ان کی رفاہی تنظیم عظیم پریم جی فاؤنڈیشن پرائمری تعلیم پر توجہ دے رہی ہے۔ اسے وہ ۲؍بلین ڈالر کی امداد دے چکے ہیں۔ اس کا ہدف ۶۴۰؍اضلاع میں سے ہر ایک ضلع میں ۲؍سکول قائم کرنا ہے۔ یہ فاؤنڈیشن معیاری ٹیچرز تیار کرنے کے لیے اپنی یونیورسٹی بھی قائم کر چکی ہے۔ یہ یونیورسٹی ۳؍ پروگراموں میں ماسٹرز کی ڈگری دے رہی ہے۔ اس فاؤنڈیشن سے اڑھائی ملین بچے مستفید ہو رہے ہیں اور اسے دنیا کی بہترین کارپوریٹ سٹیزن تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم ہی سماجی اور معاشی ترقی کی بنیاد بنتی ہے۔ سکول کا بنیادی مقصد بچے کی راہنمائی کرنا ہے کہ وہ اپنے اور دنیا کے بارے میں کھوج لگا سکے۔ سکول کا مقصد بچے کی صلاحیتوں کی نشاندہی اور ان کی نشوونما کرنا بھی ہے۔ جیسا کہ ہر بیج کے اندر مستقبل کا درخت چھپا ہوتا ہے، ہر بچہ لامحدود پوٹینشل کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ ایسے سکول کا تصور کریں جو بچے کو ایسے بیج کی صورت میں دیکھتا ہے جسے نشوونما درکار ہے۔ وہاں استاد ایسا باغبان ہوگا جو بچے کے اندر موجود پوٹینشل کو باہر لانے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ یہ تصور ہمارے موجودہ تصور سے مختلف ہے۔ آج بچے کو ایسی مٹی سمجھا جاتا ہے جسے ہم اپنی مرضی کی شکل دے سکیں۔ استاد اور والدین یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس مٹی کو کیا شکل دی جائے۔

عظیم پریم جی کو علم سے محبت ہے۔ انھوں نے کئی برس بعد سٹین فورڈ یونیورسٹی سے مطالبہ کیا کہ فاصلاتی طریقۂ تعلیم (Distance Learning) کے ذریعے انھیں ڈگری مکمل کرنے کی اجازت دی جائے۔ انھوں نے ۵؍ماہ میں صرف ۳۰۰؍گھنٹے صرف کر کے اپنا تعلیمی کام مکمل کر لیا۔ اس کے لیے انھیں صبح جلدی کام شروع کرنا پڑتا اور رات دیر تک جاگنا پڑتا۔ آخر کار محنت رنگ لائی۔ ایک دن پروفیسر کا فون آیا کہ یونیورسٹی آپ کو ڈگری جاری کر رہی ہے۔ اب انھیں اطمینان اور خوشی تھی کہ وہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کر چکے ہیں۔ انھوں نے فخر کے ساتھ ڈگری دفتر میں آویزاں کر لی۔ وہ کہتے ہیں:

لیڈرشپ کے لیے سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہر طرح کے حالات میں سیکھا جائے۔ جب ہم متکبّر بن جاتے ہیں تو سیکھنا چھوڑ دیتے ہیں

''اگر میں آج کے نوجوانوں میں سے ایک ہوتا تو میں امریکا کے کسی اچھے تعلیمی ادارے کا انتخاب کرتا۔ ہمارے تعلیمی ادارے صرف انجینئرنگ اور تیکنیکی چیزوں کی بات کرتے اور طالب علموں کی سوچ کو محدود کر دیتے ہیں۔ جبکہ امریکی ادارے طالب علموں کو انجینئرنگ کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ چیزوں کو سماجی حوالے سے دیکھنے کی تربیت بھی کرتے ہیں۔'' انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی مل چکی ہے۔

عظیم پریم کی عمر ۶۵؍برس ہے اور وہ سادگی پر یقین رکھتے ہیں۔ ہائیکنگ، پڑھنا، جاگنگ اور گالف ان کے مشاغل میں شامل ہیں۔ پریم جی کی بیوی بھی اپنے خاوند کی طرح میڈیا کی خبروں سے دور رہنا پسند کرتی ہے اور بے جا پبلسٹی کو اچھا نہیں سمجھتی۔ وہ پریم جی کی رفاہی تنظیم کا حصہ ضرور ہے لیکن اس کی زیادہ دلچسپی ناول نگاری اور لکھنے میں ہے۔ وہ اپنا پہلا ناول بھی مکمل کر چکی ہے۔ دنیا کے امیر ترین شخص کی بیوی نے اپنے ناول کی تقریب رونمائی بھی سادگی سے منعقد کی۔

پریم جی کا خیال ہے کہ عام لوگ بھی غیر معمولی کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''انفارمیشن ٹیکنالوجی کے پاور ہاؤس وائپرو کے چیئرمین عظیم پریم جی کے علاوہ کسی اور کو بھارت کی معاشی پیش رفت کی مجسم شکل نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بھارت کی آئی ٹی آؤٹ سورسنگ صنعت کا بانی ہے۔ اس کی بدولت بھارت کی بڑھتی ہوئی مڈل کلاس سے ماہرین کی ایک پوری نسل سامنے آئی ہے۔ عظیم پریم جی یقین رکھتا ہے کہ مضبوط تعلیمی نظام معاشی ترقی برقرار رکھنے کے لیے بہت اہم ہے جو لاکھوں لوگوں کو غربت سے نکالنے کے لیے درکار ہے۔ اسی لیے وہ بھارت میں پرائمری تعلیم کو پھیلانے کے لیے پوری طرح مصروف ہے۔ اس کی عظیم پریم جی فاؤنڈیشن کے پروگراموں سے اڑھائی ملین سے زائد بچے مستفید ہو رہے ہیں۔ رفاہی سرگرمیوں کے میدان میں بھارت میں اس کی قائدانہ حیثیت اس کی باقی رہنے والی میراث ہوگی۔ اس کا اپنی فاؤنڈیشن کو ۲ بلین ڈالر دینا جدید بھارت کی تاریخ میں سب سے بڑا عطیہ ہے۔'' (ٹائم میگزین)

انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ کمپنی کے لیڈرشپ کے پروگراموں میں ملازمین کو خود لیکچر دیتے اور بہترین ٹیمیں اور لیڈر پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ عظیم جی کی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ قابل

محنت کا متبادل کوئی چیز نہیں ہم میں سے بہت سے لوگ ذہین ہیں۔ فرق اس سے پڑتا ہے کہ کوئی کتنی محنت کرتا ہے دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے آپ کو پوری توجہ سے اور زیادہ لمبے عرصے کے لیے محنت کرنا ہوگی

لوگوں کو اپنے ساتھ ملاتے اور اچھی ٹیمیں تیار کرتے ہیں۔ عظیم پریم جی نوجوانوں کو ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی میں کامیابی کے اصولوں کی تعلیم بھی دیتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسائل سے لاتعلق نہ رہیں، ان کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اپنے اندر ایک ولولہ اور مقصدیت پیدا کریں، یہ سب سے اہم ہے۔ اس سے آپ کو اپنا کام کرنے کے لیے توانائی ملے گی۔

''محنت کا متبادل کوئی چیز نہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ ذہین ہیں۔ فرق اس سے پڑتا ہے کہ کوئی کتنی محنت کرتا ہے۔ دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے آپ کو پوری توجہ سے اور زیادہ لمبے عرصے کے لیے محنت کرنا ہوگی۔''

''بعض اوقات جب آپ کو زندگی میں بہت کچھ مل جاتا ہے تو آپ حیران ہونے لگتے ہیں کہ آیا آپ اس کے اہل بھی ہیں یا نہیں۔ یہ شکرگزار ہونے کا موقع ہوتا ہے۔ ہمیں بہت سی چیزوں کے لیے شکرگزار ہونا چاہیے۔ ہمارے والدین، اساتذہ، سینیئرز ہمارے لیے اتنا کچھ کرتے ہیں کہ ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔''

ترقی پذیر ممالک کے انٹرپرینوئرز Entrepreneurs کے لیے پریم جی ایک روشن مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بزنس لیڈروں کو ترقی کے لیے عظیم پریم جی کے کاروباری اور ذاتی زندگی کے اُصول سامنے رکھنا ہوں گے۔

ہماری خوبیاں کب نکھر کر سامنے آتی ہیں

پریم جی آئی آئی ٹی دہلی کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کامیابی کے اُصولوں کا ذکر ان الفاظ میں کر رہے تھے:

★.....زندگی کے بارے میں سب سے دلچسپ چیز یہ ہے کہ جب آپ کو اس کی سمجھ آنے لگتی ہے تو یہ ختم ہونے کے قریب ہوتی ہے۔ اپنے والد کا بزنس شروع کرنے کے فیصلے کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ بہت سے لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں سٹین فورڈ میں تعلیم کے بعد امریکا میں کوئی اچھی ملازمت شروع کر دوں اور اپنے والد کے گھی کا کاروبار چیلنج سمجھ کر اختیار کرنے کا خیال دل سے نکال دوں۔ لیکن اب جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو اپنے اس فیصلے پر خوشی محسوس کرتا ہوں۔ درحقیقت یہیں سے لیڈرشپ پیدا ہوتی ہے کہ جب آپ نے مشکل فیصلہ کرنا ہو تو اپنے اندر سے آنے والی چھوٹی سی آواز سنیں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں۔ اگر کیریئر میں آگے بڑھنا ہو تو چیلنجز کو قبول کرنا سیکھیں۔

★.....محنت سے کمائے گئے ایک روپیہ کی قدر و قیمت بغیر محنت کے ملنے والے ۵ روپے سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو چیز آپ کو تحفتاً ملتی ہے یا وراثت میں ملتی ہے، وہ جتنی آسانی سے ملتی ہے اُتنی ہی آسانی سے چلی جاتی ہے۔ میرے خیال میں ہم اس چیز کی قدر کرتے ہیں جو ہم اپنی محنت سے کماتے ہیں۔

★.....کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو ہر بار جیتے۔ زندگی میں چیلنجز ہوتے ہیں۔ کچھ میں آپ کامیاب ہوتے ہیں اور کچھ میں ناکام۔ کامیابی ملے تو خوش ہوں لیکن اسے سر پر سوار نہ کریں۔ اگر ایسا کریں گے تو آپ ناکامی کی طرف جانے لگیں گے۔

★.....بااعتماد لوگ ہمیشہ سیکھنے میں لگے رہتے ہیں۔ یورپ میں ایگزیکٹوز پر کیے گئے حالیہ سروے کے دوران یہ دیکھا گیا کہ لیڈرشپ کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر طرح کے حالات میں سیکھا جائے۔ جب ہم متکبر بن جاتے ہیں تو سیکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ یاد رکھیں ہر چیز کو بہتر سے بہتر کیا جا سکتا ہے۔ یہ مسلسل سفر کا نام ہے۔ جب ہم بیرونی حالات کے زیرِ اثر فیصلے کرنے کے بجائے سوچ سمجھ کر تجزیہ کرتے ہوئے قدم اٹھاتے ہیں تو یہ سب سے مناسب بات ہوتی ہے۔

★.....نوجوان اکثر صحت کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دیتے۔ دنیا بھر میں کام کے دوران تناؤ کی کیفیت بڑھتی رہے گی لیکن آپ کو خود اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ اپنی اقدار کا تعین کریں۔ یہ مشکل نہیں لیکن اصل چیز وہ الفاظ نہیں جو ان کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں بلکہ اصل چیز ہمارے وہ چھوٹے چھوٹے اعمال ہوتے ہیں جو ان کے تحت کیے جاتے ہیں۔

★.....جب ہم جیتنے کے لیے کھیلتے ہیں تو ہماری خوبیاں نکھر کر سامنے آتی ہیں۔ اس سے ہم اپنی رسائی سے باہر کی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہر قیمت پر جیتنے کی کوشش کرنا اچھی بات نہیں۔ ہمیشہ جیتنا اور دوسروں کی قیمت پر جیتنے کی کوشش کرنا بھی اچھا نہیں۔ ہر وقت کچھ نیا کرنے کے بارے میں سوچیں۔ ہر بار پچھلی کوشش سے بہتر کوشش کرنے کے بارے میں سوچیں۔ اسی طرح مسائل حل کرنے کے لیے اپنے اپنے حصے کی کوشش کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔'' ■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مفید راہنمائی..... قابلِ عمل مشورے

حاملہ خواتین کیا کھائیں؟

ڈاکٹر تحسین گیلانی

زندگی کے سب سے خوبصورت مگر نازک دِنوں میں کیا کھانا چاہیے اور کس کھانے سے پرہیز بہتر ہوگی

عالیہ جب حاملہ ہوئی، تو قدرتاً اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ آخر ۵/ برس بعد اُمید بر آنے والی تھی لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس کی جان عذاب میں آ گئی۔ ساس سمیت خاندان کی تمام بڑی بوڑھیوں نے متضاد نصیحتیں کر کے بے چاری عالیہ کا دماغ گھما دیا۔

بیشتر نصیحتوں کا مرکزی نقطہ یہ اَمر ہوتا کہ فلاں غذا نہ کھاؤ اور فلاں چیز خوب اُڑاؤ مگر اگلے ہی لمحہ دوسری بی بی کوئی اور منطق سامنے لے آتی۔ حالانکہ حاملہ کی غذا بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ عورت جو کچھ کھائے، وہ بڑھتے بچے پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ذیل میں ان تمام غذائی عناصر کا ذکر ہے جو ایک حاملہ کو دورانِ حمل درکار ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی روزمرہ کی غذا میں کم یا ناپید ہو جائے، تو وہ بچے کی نشوونما پر منفی اثرات ڈالتا ہے۔

زیادہ کھانا فائدہ مند نہیں

ہمارے ہاں یہ بات تقریباً کہاوت بن چکی ہے کہ حاملہ کو چاہیے وہ ۲/ آدمیوں جتنا کھانا کھائے۔ یہ بات غلط ہے۔ گو حاملہ کو یقیناً بعض غذائی عناصر مثلاً کیلشیم، فولاد اور پروٹین کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، لیکن زائد حرارے (کیلوریز) اسے دوسری سہ ماہی ہی میں درکار ہوتے ہیں۔

دوسری اور تیسری سہ ماہی میں بھی حاملہ کو چاہیے کہ صرف ۳۰۰/ حراروں والی زائد غذا کھائے۔ لیکن یہ غذا ردی یعنی فاسٹ فوڈ قسم کی نہ ہو، بلکہ وہ ایسی غذائیں کھائے جو بچے کی جسمانی نشوونما میں حصہ لیں مثلاً آدھی پیالی میوہ کھا لیا یا سینڈوچ لے لیا اور یہ بات یاد رکھیے کہ روزانہ ۲/ آدمیوں جتنا کھانا کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس ردی و فضول غذا سے دور رہیے اور صرف مفید غذائیں کھائیے۔

کام سے پرہیز

برصغیر پاک و ہند میں کئی صدیوں سے یہ دیومالا بھی پھیلی ہوئی ہے کہ حاملہ عورت کو کام نہیں کرنا چاہیے۔ بس وہ بستر پر لیٹ کر آرام کرے حالانکہ جدید طبی سائنس اس امر کو غلط ثابت کر چکی ہے۔

حاملہ عورت کو چاہیے کہ وہ معمول کی سرگرمیاں انجام دے اور خود کو چاق و چوبند رکھے۔ یوں وہ پورے ۴۰/ ہفتے ہشاش بشاش رہتی، ذہنی دباؤ کا نشانہ نہیں بنتی اور حمل سے متعلق کئی خرابیوں مثلاً حملی ذیابیطس (Gestational Diabetes) سے محفوظ رہتی ہے۔ مزید برآں حرکت کرنے سے زچگی بھی آسان ہوتی ہے اور بعد ازاں بدن سمارٹ کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی۔

فولاد، کیلشیم اور پروٹین

درج بالا تینوں غذائی عناصر حاملہ اور بچے کی صحت کے لیے ضروری ہیں۔ حاملہ کو چاہیے کہ وہ غذاؤں سے ۲۷ تا ۳۰/ ملی گرام فولاد ضرور حاصل کرے۔ فولاد کے بڑے ذرائع گوشت، ثابت اناج، ساگ، جئی کا دلیہ اور خشک خوبانی ہیں۔ ایک پیالی ثابت اناج کھانے سے ۱۸/ ملی گرام فولاد حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک پیالی ساگ ۶.۵۰/ ملی گرام جبکہ ایک پیالی خشک خوبانیاں ۳.۵۰/ ملی گرام فولاد مہیا کرتی ہیں۔

یہ واضح رہے کہ جن غذاؤں میں وٹامن سی ہوتا ہے، انہیں بھی تقریباً روزانہ استعمال کرنا چاہیے۔ دراصل وٹامن سی فولاد کو جسم میں جذب ہونے میں مدد دیتا ہے۔ حاملہ کے لیے کیلشیم کی روزانہ مقدار ۱۰۰۰/ ملی گرام ہے۔ دودھ اور اس سے بنی مصنوعات اس معدن کا خزانہ ہیں۔ ایک گلاس خالص دودھ پینے سے اُسے ۴۰۰/ تا ۵۰۰/ ملی گرام کیلشیم باآسانی مل سکتا ہے۔

اگر حاملہ ڈیری مصنوعات پسند نہیں کرتی، تو وہ دیگر غذاؤں سے کیلشیم حاصل کرے مثلاً ایک پیالی پکا ساگ ۲۴۶/ ملی گرام کیلشیم فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح ایک پیالی بند گوبھی ۹۴، پھول گوبھی ۶۱ اور پھلیاں (Beans) ۴۶/ ملی گرام کیلشیم فراہم کرتی ہیں۔ خشک انجیر بھی اس معدن کا مخزن ہے۔ ایک پیالی انجیریں ۲۴۱/ ملی گرام کیلشیم فراہم کرتی ہیں۔ تاہم گرم ہونے کی بنا پر انجیروں کا روزانہ استعمال مناسب نہیں۔

حاملہ کو چاہیے کہ وہ روزانہ ۶۰/ ملی گرام پروٹین بھی جزوِ بدن بنائے۔ ہر قسم کا گوشت خوب پروٹین رکھتا ہے۔ جو خواتین گوشت سے پرہیز کرتی ہیں وہ سویابین اور دالیں کھا سکتی ہیں۔ یہ بھی پروٹین فراہم کرتی ہیں۔

ڈی ایچ اے اومیگا۔ 3 چکنائی (Fats) کی ایک قسم ہے۔ حاملہ کو اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چکنائی مچھلیوں کی بیشتر اقسام میں ملتی ہے، تاہم انڈے، اخروٹ اور سویابین کا دودھ بھی ڈی ایچ اے اومیگا۔۳ مناسب مقدار میں فراہم کرتے ہیں۔

وٹامن بی ۱۲/ بچے کے ذہن کی نشوونما کرتا اور اُسے ذہین بناتا ہے۔ یہ وٹامن مرغی، مچھلی، سرخ گوشت، انڈے اور ڈیری مصنوعات میں ملتا ہے۔ اگر کوئی حاملہ سبزی خور ہے، تو وہ ڈاکٹر کے مشورہ سے حیاتین تجویز کرا سکتی ہے۔

مچھلی...... بچے کے لیے مفید غذا

حاملہ کے مالی حالات اچھے ہوں، تو وہ ہفتے میں ایک ڈیڑھ کلو مچھلی ضرور کھائے۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جو خواتین زمانہ حمل میں مچھلی کھائیں، ان کے بچے ذہنی طور پر طاقتور اور چست و چالاک ہوتے ہیں جبکہ مچھلی نہ کھانے والی کے بچے ذہنی طور پر پسماندہ پائے گئے اور وہ دوسروں سے میل ملاپ کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مچھلی میں ڈی ایچ اے (Docosahexanoic Acid) اومیگا۔۳ چکنائی ملتی ہے۔ بچے کے ذہن اور آنکھوں کی نشوونما کے لیے یہ چکنائی ضروری ہے۔ چونکہ ہمارا جسم یہ چکنائی نہیں بناتا لہٰذا اُسے غذاؤں سے حاصل کرنا چاہیے۔ اس کی کچھ مقدار مالٹا کے رس اور دہی میں بھی ہوتی ہے۔

حاملہ کے لیے لازم ہے کہ وہ روزانہ ۲۰۰ ملی گرام ڈی ایچ اے اومیگا۔تھری غذا سے حاصل کرے۔ بدقسمتی سے پاکستانی حاملہ خواتین کی بیشتر تعداد زیادہ سے زیادہ ۵۰ تا ۱۰۰ ملی گرام ہی لے پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ان کے بچوں کی نشوونما متاثر ہوتی ہے بلکہ زچگی کے بعد وہ ڈیپریشن کا بھی نشانہ بنتی ہیں۔ اس چکنائی کی کمی ہی ڈیپریشن کا بڑا سبب ہے۔ لہٰذا حاملہ روزانہ ۲۰۰ ملی گرام ڈی ایچ اے اومیگا۔۳ کھانا معمول بنالے۔

باورچی خانہ صاف رکھیے

زمانۂ حمل میں حاملہ کو چاہیے کہ وہ گندگی سے دور رہے تاکہ کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ کئی بیماریاں آنول کے راستے نازک و معصوم بچے تک بھی جا پہنچتی اور اُسے تکلیف دیتی ہیں۔ لہٰذا حاملہ مضرِ صحت غذا نہ کھائے، اَدھ پکے کھانوں سے دور رہے اور دن میں اکثر و بیشتر ہاتھ ضرور دھوئے۔ یوں وہ خطرناک بیماریوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

کولین کی افادیت

آپ نے شاید کولین (Choline) کا نام نہ سنا ہو، مگر یہ بھی بڑا اہم غذائی عنصر ہے۔ یہ وٹامن بی کمپلیکس کا ایک جزو ہے۔ حاملہ کو چاہیے کہ وہ غذاؤں سے روزانہ ۴۵۰ ملی گرام کولین حاصل کرے۔ یہ حیاتین انڈے، سویابین سے بنی غذاؤں، پھول گوبھی اور جگر میں ملتا ہے۔

کولین کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ہونے والے بچے کی یادداشت بڑھاتا اور ایسی ذہنی صلاحیتیں پیدا کرتا ہے کہ وہ نت نئی باتیں جلد سیکھ سکے۔ وجہ یہ ہے کہ کولین ہمارے دماغ میں یادداشت کے مرکز، ہپوکامپس (Hippocampus) کی نشوونما میں حصہ لیتا ہے۔

حاملہ اگر ۲ انڈے کھائے، تو اُسے ۲۵۰ ملی گرام کولین مل جائے گی۔ تاہم وہ زردی سے منہ نہ موڑے، کیونکہ بیشتر کولین اسی میں ہوتی ہے۔ نیز آدھی پیالی بھنی سویابین کھانے سے ۱۰۷ ملی گرام کولین ملے گی۔

نامیاتی غذا کھائیے

نامیاتی (Organic) سے ایسی غذا مراد ہے جو کیڑے مار ادویہ، مصنوعی کھادوں اور دیگر کیمیائی مادوں کے بغیر اُگائی جائے۔ یعنی ان کی نشوونما میں صرف قدرتی کھادیں استعمال کی جائیں۔ ایسی غذائیں کم زمینوں پر اُگنے کی وجہ سے مہنگی ہوتی ہیں، تاہم ان میں غیر نامیاتی غذاؤں کی نسبت غذائیت زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا حاملہ کی جیب اجازت دے، تو وہ نامیاتی گوشت، سبزیاں اور پھل کھائے۔ ان غذاؤں میں معدنیات، حیاتین اور دیگر غذائی عناصر زیادہ ہوتے ہیں۔ ■

کیفین سے بچاؤ

جدید طبی تحقیق کافی کے فوائد سامنے لا رہی ہے، لیکن حاملہ خواتین وہ تمام مشروبات کم سے کم استعمال کریں جن میں کیفین ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جسم میں کیفین کی زیادتی ہوجائے تو حمل گرنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ روزانہ ایک دو پیالی کافی ہی نوشِ جاں کریں۔

مسکراتی لکیریں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk
urdudigest.pk

وزن کم کریں مگر صحت نہیں

کسی بھی قیمت پر وزن کم کرنے کا جنون

شارٹ کٹ ڈھونڈنے کے چکر میں اپنی صحت برباد نہ کیجیے

نوشین ناز
ماہر غذائیات/ نیوٹریشنسٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت

دیر سے میں اُسے سُن رہی تھی۔ ایسی باتیں میں روز سُنتی ہوں:

(۱) مجھے اپنا وزن ہر صورت کم کرنے ہے چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔

(۲) مجھے ڈاکٹر صاحبہ کوئی ایسی دوائی لگادیں جس سے میرا وزن جلد از جلد کم ہوجائے۔

میرا جواب: آپ کو پتا ہے کہ ایسی ادویات گردوں کے علاوہ فرٹیلٹی سسٹم کو تباہ کردیتی ہیں۔

اُس کا جواب: مجھے نہیں پتا جو بھی ہو مجھے اپنا وزن کم چاہیے۔

میں نے اس کے اس اعلیٰ پائے کے جواب میں بے اختیار ''سبحان اللہ'' کہا تھا۔ بی بی کے پاس عقل کی کمی تھی اگرچہ وزن کی کافی زیادتی تھی۔

میرا سوال: آپ کو پتا بھی ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

اُس کا جواب: جی یہ کہ میرا وزن کم ہوجائے!! اُس نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

میرا سوال: چاہے اُس کی قیمت کچھ بھی ہو؟

اُس کا جواب: ہاں کچھ بھی۔

میرا سوال: چاہے آپ کی صحت بھی.....؟؟

اُس کا جواب: ہاں مجھے ایسی صحت نہیں چاہیے جس میں بس موٹاپا ہی ہو۔

میرا سوال: اگر آپ کا وزن کم ہوجاتا ہے اور آپ چل پھر نہیں سکتیں۔ کھایا ہضم نہیں کرسکتیں۔ اپنے اور دوسروں کے کاموں کے لیے محتاج ہوں تو ایسے وزن کم کرنے کا فائدہ؟

اُس کا جواب: مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو چکی ہے!! میرا دل کرتا ہے کہ کوئی کھینچی لوں اور جہاں جہاں سے ماس لٹک رہا ہے، وہاں سے کاٹ ڈالوں۔ اس کے غصے کی شدت میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔

میرا سوال: تو پھر کبھی کاٹ کر دیکھا؟

جواب: یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟

میرا سوال: جیسی آپ کر رہی ہیں۔ میں پہلے مسکرائی پھر میرا قہقہہ جو کب کا دبا بیٹھا تھا، باہر نکل آیا۔

اُس کا سوال: آپ مجھ پر ہنس رہی ہیں؟

میرا جواب: نہیں چندا! تمھاری باتوں پر.....!!

اُس کا سوال: کیوں.....؟؟

میرا جواب: کیونکہ تم بس وزن کم کرنا چاہتی ہو چاہے تمہیں کچھ بھی ہوجائے۔ چاہے تو کھینچی سے کاٹو یہ کیا بات ہوئی؟ میرے پاس آکر بھی تم نے دوائی مانگنی ہے تو میرا ماہرِ غذائیت ہونے کا فائدہ؟

میرا کام تم کو اچھی اور موزوں غذا بتانا ہے۔ تاکہ تم صحت کے سفر پر گامزن ہو کر مٹاپے اور دوسری بیماریوں سے بچو نہ کہ اس طرح کے شارٹ کٹ ڈھونڈو اور اپنی صحت کا ناس بلکہ سوا ستیاناس مارلو۔

اُس کا سوال: کھا کھا کر تو میں اور موٹی ہوجاؤں گی۔ وہ اب بھی کنونس (Convince) نہیں ہوئی تھی۔

میرا جواب: کھانا تو تم کو کھانا ہے ہی۔ اپنی پسند کا کھاؤ یا میری پسند کا۔ ہاں یہ ہے کہ میرا بتایا کھا کر فائدہ زیادہ ہے۔ میں نے تحمل سے جواب دیا۔

اُس کا سوال: تو میں کیا پتلی ہوجاؤں گی؟

میرا جواب: ان شاء اللہ..... اللہ کی مدد رہی تو۔

اُس کا سوال: لو اب اللہ پر ڈالیں گی۔

میرا جواب: ایک خاموش مسکراہٹ تھی۔ (بی بی کو بھرپور کونسلنگ کی ضرورت تھی۔)

اُس کا سوال: تو پھر میں پتلی ہوجاؤں گی ناں!

میرا جواب: ان شاء اللہ.....!!

میں نے بھرپور انداز اور پوری توجہ سے اس کا Diet Plan لکھتے جواب دیا۔ مجھے اُسے عصر کی نماز سے پہلے فارغ کرنا تھا۔ مگر میرا ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔

جب میں کلینک پر ''Patient'' دیکھتی ہوں تو اکثر ایسے مریضوں سے وابستہ پڑتا ہے جو کئی مریضوں کا وقت

لے جاتے ہیں۔ ایک گھنٹہ..... یعنی اچھی خاصی کافی کمائی کا نقصان..... لیکن اس معاملے میں میرا نقطہ نظر تھوڑا الگ ہے۔ میں ایک گھنٹہ اکثر ضائع کر دیتی ہوں!! بے شک اُس دن مجھے فیس کم اکٹھی ہوتی ہے لیکن اطمینان زیادہ اکٹھا ہوتا ہے کیونکہ ایسے میں مجھے گھنٹہ بھر کونسلنگ بھی کرنی پڑتی ہے۔

مایوسی ایک ایسی دلدل ہے جو مریض کو بہت پہلے مار چکی ہوتی ہے، اُس کی خوشی کو اُس کی امید کو.....!! وہی خاتون ایک ماہ بعد تشریف لائیں۔ ۴ر کلو وزن کم کر کے آئی تھیں۔ خوشی چھپائے نہ چھپتی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اُن کا صحت کا سفر اُن کی امیدوں کے برعکس شروع ہو چکا ہے۔

میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ یہ کالم بھی اپنے اردگرد موجود موٹے لوگوں کے لیے تسلی اور ڈھارس کا باعث بنے۔ ان کی امید بندھائے۔ آئیے دوسروں کے سفرِ صحت کو آسان کرتے ہیں.....!! قارئین کرام! آپ بھی ایسے موٹے لوگوں کی جو اپنا وزن کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ہمت توڑنے کا باعث نہ بنیں بلکہ اُس سے کہیں کہ ''شاباش تم کرسکتے ہو۔''

''کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ ہر موٹا شخص وزن کم کرسکتا ہے اگر وہ ایک بار نہیں مسلسل محنت پر ایمان رکھے۔''

اب آئیے اس ماہ کے سوال اور جواب کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔

شوگر اور وزن دونوں کنٹرول میں نہیں

سوال: میری عمر ۳۸ر سال ہے۔ قد ۵ر فٹ ۵ر انچ اور وزن ۷۰ر کلوگرام ہے۔ میں ایک Diabetic مریض ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے ڈائیٹ پلان تجویز کریں۔ مہربانی کریں میری شوگر اور وزن کنٹرول میں آجائے۔

(ساجدہ ربانی۔ گجرات)

جواب: شوگر میں مٹاپا بہت نقصان دہ ہے۔ وزن کم کرنے کی تجویز شوگر کے مریض کو ضرور دی جاتی ہے۔ خاص طور پر جو Type 2 Diabetic ہوتے ہیں۔

عموماً Dietry Theropy میں لو کیلوری غذا جو ۱۰۰۰ر سے ۱۵۰۰ر پر ہو، قد کے لحاظ سے اور ۳۰ر Physical Activity سے ۴۰ر منٹ آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔

آپ سو کر اٹھتے ہی کوئی فروٹ لیں اور ایک گھنٹہ بعد ہلکا پھلکا ناشتا کریں۔ ۱۰ر بجے سکم دودھ کا گلاس۔ ۱۲ر بجے امرود یا سیب لیں۔ ۲ر بجے فور گرین آٹے کا چھوٹا پھلکا اور چھوٹی پلیٹ سالن ایک پلیٹ سالن اور گرین ٹی لیں۔ شام میں ہلکا پھلکا Snake جو کم سے کم ۵۰ر کیلوری کا ہو۔ اسی طرح آپ کا ڈنر بھی بے حد کم کیلوری پر ہو۔

چائے کا استعمال صرف ایک مرتبہ ہو اور پانی کا استعمال زیادہ کریں۔ سونے سے ایک گھنٹہ پہلے ایک کپ سکم ملک کا لیں۔ خوش رہیں، غصے اور زیادہ تھکن سے بچیں۔

کیا میں اوورویٹ ہوں

سوال: میری عمر ۲۳ر سال ہے اور میرا وزن ۵۴ر کلوگرام اور قد ۵ر فٹ ۳ر انچ ہے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ میں Overweight ہوں تو میرا ڈائیٹ پلان کریں۔

(جیا کمال۔ کراچی)

جواب: آپ کے قد کے لحاظ سے آپ بہت اچھے وزن میں ہیں۔ اگر آپ کم کرنا چاہتی ہیں تو ۵۰ر کلوگرام کرلیں یوں ماڈل ویٹ میں آجائے گا۔ آپ کو ڈائیٹ اور ویٹ پروگرام پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ ۳۰ر منٹ پہلے اور بعد میں اپنے Main میل سے پہلے پانی نہ پیا کریں۔ سارا دن خوب پانی کا استعمال کریں۔ اپنی باڈی کو اچھا Hydrate کرنے کے لیے اپنے Meals کو ۴ر سے ۶ر Periodic Episodes میں تقسیم کرلیں۔ تازہ پھلوں کا استعمال Snacks کے طور پر کریں اور روز ۳۰ر منٹ کی واک کریں۔

پیٹ بہت بڑھ گیا ہے

سوال: میری عمر ۲۹ر سال ہے۔ میرا پرابلم ہے کہ

urdudigest.pk
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا پیٹ زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ مہربانی کرکے اس مسئلے کے لیے مجھے ورزش بتادیں۔

جواب: آپ کو اپنے Belly Fat کے لیے regular ورزش کرنی ہوگی۔ آپ Spine Position میں لیٹ جائیں۔ دونوں ہاتھ سائیڈ پر ساتھ میں رکھیں۔ آرام سے اپنی دونوں ٹانگیں ۴۵ڈگری اینگل پر اُٹھائیں اور دونوں ٹانگوں کو استعمال کرتے ہوئے Cycling شروع کردیں۔

اس کو ۳/مرتبہ دہرائیں۔ ایک مرتبہ میں ۲۰/منٹ cycle کریں۔ یہ ورزش آپ کے Lower Abdominal کے مسلز پر اثر کرے گی۔

زمین پر لیٹی پوزیشن پر لیٹ جائیں۔ اپنی ٹانگوں کو موڑ لیں اور اپنے Hips کو اوپر اُٹھائیں۔ ۱۰ سے ۱۵/ سیکنڈ اُٹھائیں پھر نارمل پوزیشن میں آجائیں۔ ۵/ Set کرلینا کافی ہیں۔ اس کے علاوہ Balanced Diet بھی لیں۔

سوال: میری عمر ۳۳/سال ہے۔ میری Height اور Weight سب ٹھیک لیکن میرا پیٹ اور Belly بہت Heavy ہیں۔ مجھے کچھ ورزشیں بتائیں اور کوئی کھانا بھی۔

جواب: آپ ۱۰۰/گرام دودھ میں Oatmeal لیں ناشتے میں۔ بوائل چکن اور Vegetable Curry اپنے Meal میں لیں اور Fresh فروٹ Snacks میں استعمال کریں۔

زمین پر ایک ایک طرف سائیڈ کرکے لیٹ جائیں۔ سر کو Support کرنے کے لیے ہاتھ رکھیں۔ اُس کے نیچے پھر اپنی ٹانگ کو ۴۵/ کے اینگل تک اُٹھائیں اور دو تین سیکنڈ کا Stay کریں اور ۱۵/ Set لگالیں۔ باری باری دونوں ٹانگوں پر کریں۔ یہ آپ کی Lateralabs کے مسلز کو مضبوط کرے گی اور آپ کے مسئلے کے لیے اچھے حل دے گی۔

بال بہت باریک ہوگئے ہیں

سوال: میرے بال بہت Healthy تھے۔ لیکن اب بہت باریک ہوگئے ہیں۔ مجھے حل بتائیں۔

(شریل شاہ۔ لیہ)

جواب: بال Environment کے بدلنے سے بھی گرتے ہیں۔ ایسے میں بہت احتیاط سے چلیں۔ اپنی غذا پر بہت توجہ دیں۔ بہت سارے Chemicals اور Cosmetics اور Hormonal Imbalance اور Stress وغیرہ بھی ہیرفال کا باعث بنتے ہیں۔ آپ اپنی Scalp اور Roots میں بہت Gently کوکونٹ اور بادام کے تیل کا مساج کیا کریں۔ روز ۱۰/سے ۱۵/منٹ کریں۔ نیم کے پتے پانی میں بوائل کرکے پانی ٹھنڈا کرکے رکھیں اور اُس سے بال Rinse کریں۔ غذا میں Green Leafy Veg، سلاد، دودھ، فروٹ اور Sprout کا استعمال کریں۔ زیادہ پروٹین، دودھ، سویابین، ہول گرین، دہی کا استعمال کریں اور شریل چندانا میں ماہر غذائیت ہوں، زیادہ بہتر ہوگا کہ آپ مجھ سے غذا کے متعلق سوال کریں اور خدا کے لیے Message ایک سے دو بار سے زیادہ نہ کریں پلیز۔ سب کے Message کا جواب باری سے مل جاتا ہے۔ دیر سے سہی لیکن جواب میں ضروری دیتی ہوں۔

بازو بہت موٹے ہوگئے ہیں

سوال: میری عمر ۳۰/سال ہے۔ قد ۵/فٹ اور وزن ۷۸/کلوگرام ہے۔ میرے بازو بہت موٹے ہیں۔ میرا وزن کتنا ہونا چاہیے اور مجھے بازوؤں کے لیے کوئی ورزش بتادیں۔

(عمیرہ قاسم۔ میانوالی)

جواب: آپ کا وزن ۵۰/ سے ۵۵/کلوگرام کے درمیان رہنا چاہیے۔ بازوؤں کے لیے اپنے پاؤں کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ رکھ کر فرش پر کھڑے ہوں۔ اس کے بعد دونوں بازو اطراف سے سامنے کی طرف لاتے

ایک درخواست

میں کال نہیں لیتی۔ صرف Message دیکھتی ہوں۔ میسج کا جواب میسج سے نہیں دیتی بلکہ کالم میں باری آنے پر دیتی ہوں۔ اُمید ہے آپ لوگ خیال رکھیں گے۔ میسج محفوظ رہتے ہیں۔ اپنی اچھی دعاؤں میں مجھے، میرے بچوں اور اہلِ خانہ کو یاد رکھیے گا۔

شکریہ

ہوئے بالکل سیدھے کریں پھر پیچھے کی طرف لے جاتے ہوئے سرکل کی طرح گھمائیں اور ۱۰/کی گنتی شمار کریں۔ اس کے بعد اسی طرح یہ عمل پیچھے سے آگے کی طرف بازوؤں کو گھمائیں۔ اپنے باقی جسم کو بالکل سیدھا رکھیں اور ٹانگوں میں خم نہ ڈالیں۔ بازوؤں کی فالتو چربی رفتہ رفتہ کم ہوگی۔ اس مقصد کے لیے مفید ورزش ہے۔

اسی طرح اپنے دونوں پاؤں کے مابین مناسب فاصلہ رکھ کر اس طرح کھڑی ہوں جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں ۲/خالی بوتلیں پکڑ لیں۔ اپنے دونوں بازوؤں کو اسی طرح باری باری اوپر نیچے کریں کہ آپ کی کہنیاں نہ ہلیں اور آپ کے ہاتھ کندھوں سے اوپر نہ جائیں بلکہ کندھے بالمقابل رہیں۔ اس ورزش کو بار بار دہرائیں۔ اس سے جسم کے پٹھوں میں حرارت پیدا ہوگی اور آپ مزید ورزش کے لیے تیار ہوجائیں گے۔ بازوؤں اور پیٹ کے عضلات میں اس ورزش سے مضبوطی پیدا ہوگی۔ آہستہ آہستہ خالی بوتلوں کو بھر کر استعمال کریں۔ اپنا وزن کم کریں، اس سے بھی مٹاپا کم ہوگا۔

۲۵/کلو وزن زیادہ ہے

سوال: میری عمر ۳۳/سال ہے۔ قد ۵/فٹ ۷/انچ اور وزن ۹۰/کلوگرام ہے۔ پلیز پلیز میرے لیے ڈائیٹ پلان کریں۔ میں آپ کو ساری عمر دعائیں دوں گی۔

(مدروش۔ لاہور)

جواب: آپ کو ۲۵/کلو وزن کم از کم کرنا ہے اور یہ وزن آہستہ آہستہ کم ہوگا۔ پلیز یاد رکھیے کہ کالم میں مجھ سے پلان لینے کے لیے ضروری ہے کہ آپ لوگ اپنی کھانے پینے کی روٹین اور فزیکل ایکٹوٹی ضرور بتائیں۔ میرے لیے آپ کا پلان Design کرنا آسان ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ کو کوئی فزیکل پرابلم (Health Issue) ہے وہ بھی بتائیں۔ یہ بات میں ہر بار دہراتی ہوں، لیکن آپ سب مجھے میسج تو بہت کرتے ہیں لیکن ادھورے میسج کس کام کے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پوری تفصیل لکھ کر بذریعہ خط بھجوا دیا کریں۔ پھر بھی راہنمائی ہوسکتی ہے۔ بہت ایمرجنسی ہو، شادی کی تاریخ رکھی جا چکی ہو تو وقت لے کر بالمشافہ ملاقات کریں۔

مدروش آپ ناشتا میں دلیہ ۲/اونس، سگترے کا جوس لیں۔

۱۲/بجے: ۲/سیب

۲/بجے: مچھلی ۴/اونس

شام میں: سویا ملک کا ایک گلاس

رات کا کھانا: گوشت ۴/اونس، ایک روٹی، سلاد ایک پلیٹ، گرین ٹی۔ سونے سے ایک گھنٹہ پہلے آدھا گلاس سویا ملک اور اسپغول کا چھلکا ایک سپون لیں۔ زیادہ پانی کا استعمال کریں۔ ۴۰/منٹ کی واک اور رکوع وسجود اچھا کریں۔

مبارک ہو

ذیشان احمد جدہ ۵/کلو، رومان نقوی لاہور ۳/کلو، شرجیل مقصود گوجرانوالا ۵/کلو، بلقیس میانوالی ۲.۵/کلو، نے اپنا وزن بہت اچھا کم کیا ہے۔ آپ کی دعاؤں کا بے حد شکریہ۔ ایسے میسجز اور فون خوشی بھی دیتے ہیں اور اپنی مخلصانہ اور بے لوث خدمت کی کامیابی کا احساس بھی دوچند ہوتا ہے۔

■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُردو ڈائجسٹ
کا مقبول سلسلہ

مشورہ حاضر ہے

صغیرہ بانو شیریں

آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، بڑے بڑے مسائل کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

ملیریا بخار

ہماری قاریہ بہن، بیگم کرنل ساجد میانوالی سے کہتی ہیں۔ ”میرے بچے کو ملیریا بخار ہے۔ اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔ اتر جاتا ہے پھر چڑھ جاتا ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ آپ اس بارے میں ضرور لکھیے تا کہ بہت سارے لوگوں کا بھلا ہو جائے۔ اس کی علامات اور بہتری کے لیے بتائیے کیا کریں؟

ڈاکٹر کی دی ہوئی دوا پابندی سے کھلائیے۔ ملیریا میں چکوترہ بہت مفید ہے، روزانہ کھلانا چاہیے۔ اسی طرح تلسی کی چائے مفید ہے۔ دارچینی کی چائے فائدہ دیتی ہے۔ موٹی کٹی ہوئی دارچینی ایک چائے کا چمچ لے کر ایک گلاس پانی میں اُبالتے ہیں۔ پھر اس میں ایک چٹکی پسی ہوئی کالی مرچ اور ایک چمچہ شہد ملا کر پیتے ہیں۔ اسی طرح تلسی کے ۷/پتے پانی میں چائے کی طرح پکا کر چھان کر چٹکی بھر کالی مرچ چھڑک کر پیتے ہیں۔ ملیریا میں تازہ پھل اور سبزیاں مفید ہیں۔ نیم کے پتے پانی میں اُبال کر رکھیں۔ یہ پانی آپ گھر میں رکھے پودوں کو دے سکتے ہیں۔ نیم کے پانی سے مچھر نہیں آتے۔ پوری آستین کی قمیص اور لمبا پاجامہ پہنیے۔ بازار میں بہت سارے لوشن دستیاب ہیں وہ آپ جسم کے کھلے حصوں پر لگا کر سو سکتے ہیں۔ نیم کے سوکھے پتے، کلونجی، حرمل ملا کر کمرے میں دُھونی دیں۔ گھر سے باہر پانی نہ کھڑا ہونے دیں۔ مچھر گندے اور ٹھہرے پانی میں انڈے دیتے ہیں۔ ملیریا کی علامت معلوم ہوتے ہی ڈاکٹر کی تجویز کردہ دواؤں کا استعمال کرنا ضروری ہے۔ مچھر مارنے کے لیے گھروں میں جلیبی یا میٹ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ استعمال شدہ میٹ سنبھال کر رکھیے۔ نیم کے پتے ڈیڑھ گلاس میں خوب اُبال کر پانی چھان کر اس میں میٹ ملا دیں۔ جب میٹ اچھی طرح نرم ہو جائیں تو پانی چھان کر اسپرے کی بوتل میں بھر کر کمرے میں خوب اسپرے کریں۔ اس سے مچھر بھاگ جائیں گے۔ نیم کے پتوں کی دھونی اچھی طرح ہفتہ میں ایک بار دی جائے تو مچھر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی سی احتیاط گھر والوں کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

شوہر کا مسئلہ

میری شادی کو ۲/سال ہوگئے۔ اللہ نے ایک بیٹی بھی عنایت فرمائی ہے۔ میرے گھر کا مشترکہ نظام ہے۔ ساس، سسر، دیور ساتھ رہتے ہیں۔ دو تین ماہ سے میں یہ بات محسوس کر رہی ہوں، شوہر مجھ پر توجہ نہیں دے رہے۔ اتوار کے دن وہ بازار

جاتے ہیں۔ پہلے میں ساتھ چلی جاتی تھی اب بچی کی وجہ سے نہیں جاسکتی۔ گھر کے کاموں میں الجھی رہتی ہوں۔ رات گئے تھک کر لیٹ جاتی ہوں۔ نیند بھی پوری نہیں ہوتی۔ صبح اٹھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ آپ ہی بتائیے میں کیا کروں اور کیسے اپنے شوہر کی توجہ حاصل کروں۔ (م۔ا)

بی بی! سارا قصور آپ کا ہے۔ مجھے لگتا ہے بچہ ہونے کے بعد آپ نے اپنے آپ پر توجہ دینی چھوڑ دی ہے۔ بچے بھی ہوتے ہیں۔ گھر بار کا مسئلہ ہوتا ہے مگر آپ کو سب سے پہلی ترجیح اپنے شوہر کو دینی چاہیے۔ آپ صبح ناشتا بنا کر ان کے پاس بیٹھ کر ساتھ دیجیے۔ شام کو ان کے آنے سے پہلے اپنے پر توجہ دیں۔ کپڑے بدلیں، بال ٹھیک کریں اور پھر شوہر کر اچھی سی چائے بنا کر دیں۔ ان کے ساتھ ہنسیں بولیں۔ بچی کو بھی تیار کر کے اپنے ساتھ گود میں رکھیں۔ وہ بازار جائیں تو سب کام چھوڑ کر ان کے ساتھ جائیے۔ بچی کو آپ اپنی ساس کے پاس چھوڑ کر جاسکتی ہیں۔ اسی طرح صبح ناشتا کے وقت بھی آپ بچی کو ساس کے حوالے کر سکتی ہیں اور ۱۵/۲۰/منٹ شوہر کے ساتھ بیٹھ سکتی ہیں۔ بچہ ہونے کے بعد معمولات میں تھوری بہت تبدیلی آتی ہے مگر عقل مند بچیاں سارے کام سنبھال لیتی اور اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہتی ہیں۔

اپنے گھر کو ٹوٹنے سے بچائیے۔ شوہر پر بھرپور توجہ دیجیے۔ آپ کے سارے مسئلے خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے اور آپ کے شوہر بھی خوش رہیں گے۔ چند ماہ کی بات ہے، بچی ذرا بڑی ہوگی تو آپ کو بھی سہولت ہو جائے گی۔ عورت پر بہت ساری ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور ان ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے تھوڑی سی قربانی دینی پڑتی ہے۔

لکنت

ہمارے قاری رحمت اللہ بلوچ فورٹ منرو سے لکھتے ہیں۔ میرا بچہ ۷/سال کا ہے۔ پہلے وہ ہم سے تتلا کر بات کرتا تھا۔ اب اسے لکنت کی بیماری ہوگئی ہے۔ چند الفاظ پر اٹک جاتا ہے۔ بظاہر صحت مند ہے۔ میں اس کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان ہوں۔ کوئی دعا ہو یا دوا ہو تو ضرور بتائیے۔

جو بچے لکنت کا شکار ہوتے ہیں ان پر خاص توجہ دینی چاہیے۔ احساسِ کمتری کی وجہ سے وہ اور زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ بچے کو پیار سے سمجھائیے کہ وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اکیلے کمرے میں جا کر جن حروف پر اٹک جاتا ہے، ان حروف کو زور زور سے دہرانے کی مشق کریں۔ کچھ بچے اکیلے میں بالکل صاف لفظ ادا کرتے لیکن سب کے سامنے اٹک جاتے ہیں۔ ان کو خوف ہوتا ہے کہ وہ لفظ بول نہیں پائیں گے۔ ان کا یہ خوف آپ پیار سے ختم کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہومیو پیتھک ادویہ بھی اس معاملے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اسی طرح قرآنِ پاک کی سورۃ طٰہٰ کی آیت ۲۵/سے لے کر ۲۸/ویں تک بچے کو زبانی یاد کرائیں اور بچے کو دن میں کئی بار پڑھنے کی ہدایت کریں۔ آیات کی برکت سے زبان صاف ہو جائے گی۔

پنساری سے تھوڑا عقرقرحا خریدیں۔ اسے پیس کر رکھ لیں۔ چٹکی بھر عقرقرحا تھوڑے سے شہد میں ملا کر بچے کی زبان پر اور منہ کے اندر اچھی طرح لگائیں۔ اس سے منہ کے اندر سے پانی اور رال بہے گی۔ دن میں ۲/بار لگانا ہے۔ یہی نسخے صدیوں سے آزمائے جاتے ہیں، آپ بھی اللہ کا نام لے کر آزمائیے۔ عقرقرحا اور تیزپات کے پتے ۱۲۔۱۲/گرام، کالی مرچ ۶/گرام ملا کر پیس کر دن میں ۲/بار منہ میں لگانے سے لکنت ٹھیک ہو جاتی ہے۔

سینے کی جلن

میرا پہلا بچہ ہونے والا ہے۔ باوجود کوشش کے میں کھا نہیں سکتی۔ سینہ میں اتنی جلن ہوتی ہے کہ برداشت سے باہر۔ کچھ کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ ڈاکٹر نے دوائی دی ہے مگر جلن میں کمی نہیں ہو رہی۔ اس بارے میں بتائیں۔ (بیگم مشتاق حسین)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے ایسا لگتا ہے آپ مرغن کھانا لیتی ہیں۔ حمل کے دوران سادہ غذا لینی چاہیے۔ مسالے دار، چٹ پٹی، تلی ہوئی چیزیں کھانے سے یہ مسئلہ ہوجاتا ہے۔ آپ تھوڑا تھوڑا کر کے چار پانچ بار کھانا لیں۔ رات کو سونے سے پہلے ایک پیالی دودھ پینے سے جلن میں کمی ہوتی ہے۔ اپنے کھانے میں پھل ضرور شامل کریں۔ کبھی کیلا کھالیا، موسم کے پھل لے لیے۔ دہی، دالیں، مغزیات، دودھ، دلیہ لیں۔ ناشپاتی مل جائے تو ضرور کھائیں۔ آپ کی غذا سادہ اور متوازن ہونی چاہیے۔ اپنی ڈاکٹر سے ضرور معاینہ کراتی رہیں اور جو دوائیں دیں، وہ ضرور کھائیں۔

خون کی کمی

میرے بچے میں خون کی کمی ہے۔ ڈاکٹر نے دوائیاں دی ہیں۔ علاج ہورہا ہے۔ کالج میں پڑھتا ہے۔ آپ اس کے لیے کوئی غذائی ٹوٹکا بتائیں تاکہ وہ جلدی ٹھیک ہوکر پڑھائی مکمل کرسکے۔ (رعنا اسلم)

بی بی! ہمارے ہاں حکیم لوگ تو خون کی کمی کی دوا ''فولاد'' سمجھتے اور اس کے لیے دوا دیتے ہیں۔ آپ کھانا کھلانے کے بعد ۲/کینو یا مالٹے موسمی ضرور کھلائیے۔ بکری کا قیمہ لاکر ہلکا سا نمک اور کالی مرچ ڈال کر کباب بنائیے۔ ایک کباب صبح ناشتے میں اور ایک شام کی چائے کے ساتھ ایک ماہ تک ضرور کھلائیے۔ اسی طرح آپ بکری کے قیمہ میں لہسن، پیاز، نمک وغیرہ ڈال کر بھون کر کھلاسکتی ہیں۔ صحت بہتر ہوجائے گی۔ کینو کے موسم میں بچوں والے گھر میں آپ اس کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں تاکہ آپ کی اور بچوں کی صحت بہتر رہے۔

ہاضمہ ٹھیک نہیں

چند ماہ سے مجھے عجیب سا محسوس ہورہا ہے۔ پراٹھا کھالوں یا دوپہر کو سالن وغیرہ تو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ ڈکاریں آتی ہیں۔ کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہتا۔ بالکل سادہ کھانا لوں تو طبیعت بوجھل نہیں ہوتی۔ کیا کرنا چاہیے۔ (سلیم احمد۔ کراچی)

کراچی میں پپیتا عام دستیاب ہے۔ کہنے کو تو یہ سستا پھل ہے مگر اس کے فائدے بے شمار ہیں۔ سخت سے سخت گوشت پر آپ کچا پپیتا لگادیں تو وہ گل جاتا ہے۔ معدہ کے مریضوں کے لیے یہ تحفہ ہے۔ اس کے کھانے سے قبض دور ہوجاتا ہے۔ مرغن کھانا ہضم ہوتا ہے۔ آپ پکا ہوا پپیتا لاکر گھر میں رکھیں۔ کھانا کھانے کے بعد ۲/۳ قاشیں کھا لیجیے۔ کھانا معدہ پر بوجھ نہیں بنے گا۔ آپ کے معدہ، جگر، آنتوں کا عمل ٹھیک رہے گا۔ اس سے آپ کے دل کو بھی تقویت ملے گی۔ ۱۰/۱۵ دن کھا کر دیکھیے۔ پھلوں کی چاٹ یا سلاد میں پپیتا شامل کیا جائے تو صحت کے لیے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ دوا کی دوا ہے اور غذائیت سے بھرپور پھل بھی۔

نیند کی کمی

میری نیند آج کل پوری نہیں ہورہی۔ دفتر میں کام کی زیادتی ہے اور گھر میں بچہ بیمار ہے۔ رات کو سوتا ہوں تو نیند اچٹ جاتی ہے۔ میں نیند لانے والی گولی نہیں کھانا چاہتا۔ نیند کی کمی سے کام متاثر ہورہا ہے۔ نیند کی کمی کیسے ٹھیک ہوگی اور میں گہری نیند کیسے لے سکوں گا۔ (صدیق رانا)

نیند کی گولیاں کھانے سے اعصاب اور پٹھوں پر بُرا اثر پڑتا ہے پھر ان کی عادت ہوجاتی ہے۔ آپ ہمدرد مطب کی سوبینا خریدیں۔ رات کو گرم دودھ میں ملا کر لیجیے۔ چند دنوں میں آپ کو خود محسوس ہوگا، نیند اچھی آرہی ہے۔ بادام، چاروں مغز اور دوسری چیزیں دماغ اور اعصاب کو سکون دیتی ہیں اور ان کے مابعد اثرات بھی نہیں ہوتے۔ آپ بھی کھائیے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کو اچھی نیند آجائے گی۔ ■

زندگی کی سب سے قیمتی متاع
اچھی کتاب
سے
زیادہ کچھ اور نہیں

کتابوں کی کہکشاں

یہ کالم آپ کو کتابوں پر تبصرے سے کافی مختلف لگے گا
اس میں کتاب اور صاحب کتاب دونوں کا تذکرہ رہے گا

نوید اسلام صدیقی

''کتابوں کی کہکشاں'' کے عنوان سے کتابوں اور اُن کے مصنفین کے تعارف کا ایک مستقل سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ ان شاء اللہ اس عنوان کے تحت باقاعدگی سے آپ کو (ادارہ کو موصول شدہ) نئی شائع شدہ کتب کے بارے میں آگاہ رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

عیسائیت کی دیومالا
(The Myth of God Incarnate)

پروفیسر ڈاکٹر عارفہ فرید نے جان ہک (John Hick) کی کتاب کا ترجمہ اور اپنے کچھ دیگر مضامین اس کتاب کا حصہ بنائے ہیں۔ کتاب کے تعارف میں مصنفہ لکھتی ہیں ''یہ ۹۰-۱۹۸۹ء کی بات ہے میں بحیثیت فل برائٹ اسکالر کلیرمونٹ گریجویٹ اسکول کے شعبہ مذہب میں ''یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے درمیان مشترک فلسفیانہ مسائل: عصرِ حاضر کے فلسفۂ تحلیل اور فلسفۂ لسان کی روشنی میں'' تحقیق کر رہی تھی۔ عالمی شہرت یافتہ عیسائی عالم دین اور فلسفی پروفیسر جان ہک کی مرتب کردہ کتاب اسطورِ تجسیم اللہ (The Myth of God Incarnate) پر پڑی۔ میں کتاب کو جوں جوں پڑھتی گئی، میری دلچسپی اس میں بڑھتی گئی اور مجھے یہ جان کر انتہائی حیرت اور مسرت ہوئی کہ پروفیسر جان ہک کے خیالات حضرت عیسیٰؑ کی ارضی اور روحانی حقیقت سے متعلق اسلام کے اس موضوع پر اعتقادات سے بہت قریب ہیں۔ کتاب میں پروفیسر ہک اور اُن کے رفقاء نے حضرت عیسیٰؑ سے متعلق عیسائیوں کے نظریہ تجسیم (Incarnation) کی مکمل طور پر نفی کی ہے اور تثلیث کے روایتی عقیدہ سے بہت ہٹ کر عیسائیت کی تفہیم کی ہے۔ پروفیسر ہک اور اُن کے رفقاء کی عیسائیت کی یہ نئی تفہیم حضرت عیسیٰؑ سے متعلق قرآنی آیات اور واقعات سے بہت مشابہ ہے۔ چنانچہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس کتاب کے بعض مضامین کو اردو میں ترجمہ کر کے مسلم اور غیر مسلم قارئین تک پہنچاؤں۔''

اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائی دنیا کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے عقائد کے کھوکھلے پن کا احساس ہوتا جارہا ہے۔ کوئی سائنسی ذہن رکھنے والا انسان 'ایک میں تین اور تین میں ایک' جیسے عقائد کو تسلیم نہیں کرتا۔ ان غلط نظریات نے مغرب میں مذہب کے خلاف باغی پن پیدا کیا۔ اب یا تو اُن کو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو قبول کرنا ہوگا یا پھر لوگوں کا فوج در فوج مسلمان ہونا برداشت کرنا پڑے گا۔

نام کتاب: عیسائیت کی دیو مالا
مصنف: پروفیسر جان ہک
ترجمہ: پروفیسر ڈاکٹر عارفہ فرید
ناشر: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی
قیمت: ۳۰۰ روپے

☆☆

اقبال عظیم۔ حیات و ادبی خدمات

یہ بنیادی طور پر ناصر حیات کا ایم اے (اردو) کا مقالہ ہے۔ ''اقبال عظیم حیات و ادبی خدمات'' کے زیرِ عنوان اس مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ان کے حالاتِ زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں نعت کی مختصر روایت کے ساتھ ساتھ اقبال عظیم کی نعت کا فنی و فکری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں غزل کی مختصر روایت اور اقبال عظیم کی غزل کا فکری و موضوعاتی اور فنی مطالعہ ہے۔ اس مقالے کا چوتھا باب اقبال عظیم کی نثری خدمات کا احاطہ کرتا ہے اور پانچویں باب میں متفرقات کے عنوان سے ان کی کچھ متفرق اصناف سخن سے متعلق نگارشات کو پیش کیا گیا ہے اور آخری باب میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے لیے مواد کافی محنت سے جمع کیا گیا ہے اور تفصیل سے ہر پہلو کو بیان کیا گیا ہے، اس لیے اقبال عظیم کے مداحوں کو اس کتاب سے ان کے حالاتِ زندگی، ان کی شاعری کے محرکات اور موضوعات سے متعلق ضروری معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ اس کتاب میں وہ غیر مطبوعہ کلام بھی شامل کرلیا گیا ہے جو اس سے پہلے کے کلیات میں شامل نہیں تھا۔

اشاعت: توکل اکیڈمی
کاشانہ خلیل، بالمقابل کالج برائے خواتین
اُردو بازار، کراچی فون: 0321-8762213
قیمت: ۳۶۰ روپے

پاکستان کہانی

ڈاکٹر عمران مشتاق کی بچوں اور نوجوانوں کے لیے تحریر کردہ کہانیوں کا یہ ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔

اختر عباس مدیر اردو ڈائجسٹ کی رائے کتاب کی پشت پر درج ہے: ''ڈاکٹر عمران مشتاق بھی خوب ہیں، یہ رہتے تو گوروں کے دیس میں ہیں اور دل میں اپنے پیاروں کو لیے گھومتے ہیں۔ زندگی کی خوبصورتی صرف منظروں سے ہوتی تو پہاڑی علاقے، جھرنے اور جھیلیں ہی مرکزِ نگاہ ہوتیں۔ وہیں لوگ بستے، وہیں جیتے، مگر سچ یہ ہے کہ منظر صرف دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ جینے کے لیے تو صرف انسانوں ہی کی بستیاں بسانی پڑتی ہیں، جہاں رہنا اور جینا ہوتا ہے، پھر ہی زندگی آگے چلتی ہے۔

ڈاکٹر عمران مشتاق بھی ایسی ہی بستی کے مقیم ہیں جو برطانیہ کی کاؤنٹی وارک شائر کے ایک شہر رگبی میں آباد ہے۔ وہاں کے بچوں کی نفسیات کو سلجھاتے سلجھاتے وہ خود جگت ڈاکٹر بنتے گئے۔ اب ان کا محور و مرکز صرف گورے بچے نہیں ہیں، کالے، پیلے، گندمی، سب ہی انہیں عزیز ہیں۔ کسی کو بھی کم نہیں جانتے۔ سب کی بہتری کے خواب

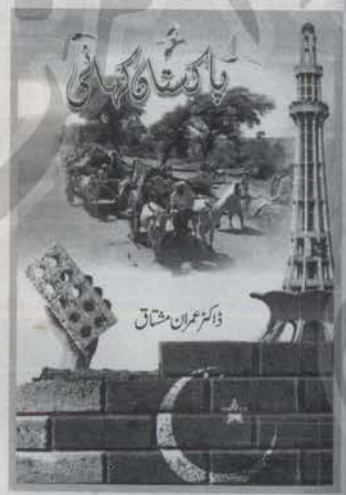

دیکھتے ہیں۔ آنکھیں خواب دیکھنے میں لگی ہیں تو قلم ان ہی خوابوں کو کاغذ پہ اُتارنے اور کہانیاں بنانے میں لگا ہے۔ اتنی سنجیدگی، دلجمعی سے لگے ہیں کہ ایک لمحہ تو دل چاہتا ہے کہ کہہ دوں..... لگے رہو..... ڈاکٹر صاحب!

اس کتاب کی اکثر کہانیاں جستہ جستہ بھی دیکھیں اور ان کا ذائقہ چکھا۔ طویل کہانیاں زیادہ دلچسپ لگیں۔ ان کا پیغام بھی واضح ہے اور کہانی کی بُنت بھی مضبوط ہے۔ ڈاکٹر صاحب، جیسے اپنے کلینک پر آنے والوں پر فرداً فرداً توجہ دیتے ہیں اور ویسی ہی بھرپور توجہ ان کی کہانیوں کو بھی ملتی ہے۔''

کرن کرن روشنی پبلشرز
ٹوائی لائٹ کمپیوٹر سٹڈیز
۴۱- حامد کمرشل سنٹر، ممتاز آباد، ملتان
موبائل 0301-7488695
قیمت: ۱۰۰ روپے

☆☆

شائیزوفرینیا (Schizophrenia) نفسیات کے آئینے میں

امیر حسین جعفری مصنف کا تعارف کراتے ہوئے بتاتے ہیں ''ڈاکٹر خالد سہیل گزشتہ ۳۰ برس سے علمِ نفسیات سے علمی، تحقیقی، تخلیقی اور جذباتی سطح پر منسلک ہیں۔ انہوں نے پشاور کے خیبر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے زنانہ ہسپتال میں نہ صرف اپنی ملازمت کا آغاز کیا بلکہ اپنی حساس طبیعت اور پیشہ ورانہ دیانت کے باعث بہت جلد مسیحا کی حیثیت بھی حاصل کی۔

دو برس ایران میں خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۷۷ء میں آپ ایران سے کینیڈا منتقل ہوگئے۔ آپ نے کینیڈا کی میموریل یونیورسٹی سے نفسیات میں ایف آر سی پی (FRCP) کی ڈگری حاصل کی۔ اپنے میلان طبع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی تشفی اور اپنے والد کی ذہنی بیماری کے آزار کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اس خواہش نے کہ نوع انسانی شائزوفرینیا کے کرب اور دیگر نفسیاتی مسائل کی تکالیف سے کیونکر آزاد ہوسکتی ہے، انہیں نفسیات کے میدان کے انتخاب کی ترغیب دی۔ آپ نے اپنی تخلیقی اپچ کے باعث کینیڈا میں پہلی بار اپنی نوع کا انتہائی منفرد طریقۂ علاج Green Zone Therapy ایجاد کیا۔ اس طریقۂ علاج سے نہ صرف ان کے کلینک میں مریضوں کا علاج ہوتا ہے بلکہ اپنی کامیابی کے باعث یہ طریقۂ علاج کینیڈا کے دیگر صوبوں میں بھی مقبولیت رکھتا ہے۔

شائزوفرینیا کے موضوع پر آپ کی یہ کتاب علمِ نفسیات کے حوالے سے ان کی فکری اور علمی کاوشوں کی ایک اہم کڑی ہے جو نہایت سادہ زبان اور عام فہم اظہار میں نوع انسانی کے دقیق اور پیچیدہ ذہنی مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل پیش کرتی ہے۔ یقیناً یہ کتاب اپنے دامن میں علمِ نفسیات کے طالب علموں اور ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے گراں قدر معلومات رکھتی ہے۔

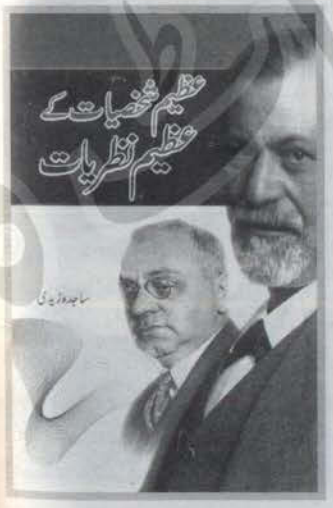

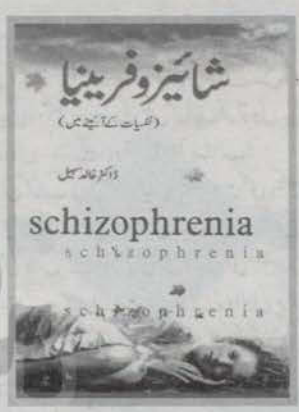

ناشر: سٹی بک پوائنٹ
نوید اسکوائر، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 021-2762483
قیمت: ۲۰۰/روپے

عظیم شخصیات کے عظیم نظریات

کتاب کے آغاز میں مصنفہ کا ایک اہم علمی مضمون ہے 'انسانی شخصیت'۔ لکھتی ہیں 'انسانی شخصیت کی مقناطیسیت کا راز کیا ہے کہ مختلف علوم کے ماہرین اور محققین کے لیے ہمیشہ سے ایک دلکش اور دلچسپ موضوع رہی ہے۔ مذہب، دینیات، فلسفہ، نفسیات، شاعری، ڈرامہ، ناول اور علم الانسان غرض انسانی علوم کی کون سی شاخ ایسی ہے جس کے ماہرین نے اپنے اپنے انداز میں اور اپنی اپنی حدود میں شخصیت کی نوعیت کو سمجھنے، اس کے عناصر کو دریافت کرنے اور اس کی حدود، گہرائی اور گہرائی کا احاطہ کرنے کی مسلسل کوششیں نہ کی ہوں۔ اگر فن شاعری و مصوری پر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے ابد آلاباد سے ہی اپنی یہ تلاش جاری رکھی ہے یعنی خود اپنی ذات (یا ذاتِ انسانی) کو موضوع بنا کر اس کے مخفی گوشوں تک رسائی کرنے کی کاوش، تقریباً ہر زمانے اور ہر کلچر میں اس کا مطمح نظر رہی ہیں۔ ان میں سے کم و بیش ہر علم کے ماہرین نے اپنے مخصوص دائرہ کار میں رہ کر شخصیت کے بڑے جامع اور مربوط، بہت گہرے اور دور

رس تصورات پیش کرنے میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ ایک انتہائی علمی کتاب ہے جو ماہرین نفسیات اور فلاسفر حضرات یقیناً بہت دلچسپی سے پڑھیں گے۔

مصنفہ: ساجدہ زیدی
ناشر: سٹی بک پوائنٹ
نوید اسکوائر، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 021-2762483
قیمت: ۷۰۰/روپے

☆☆

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی

یہ کتاب سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں ہے۔ اس کتاب کا آغاز آپؒ کے خاندانی پس منظر سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد درج ذیل ابواب میں حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ ولادت با سعادت، زمانہ رضاعت، بچپن کا زمانہ، ابتدائی تعلیم، زمانہ طالب علمی کی باتیں، بیعت و خلافت کی باتیں، عبادت و ریاضت کرنے کی باتیں، درس وتدریس کے زمانہ کی باتیں، اخلاق و

عادات اور فضائل مبارکہ، فضائل حضور سیدنا غوث الاعظم، اولاد و ازدواج، حضور غوث الاعظم کا فیض مبارک، کرامات، تصانیف حضور غوث الاعظم، وصال مبارک، اقوال مبارک۔

مصنف: محمد اعظم رضا تبسم
ناشر: زُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
فون نمبر: 051-5551519
قیمت: ۲۰۰/روپے

☆☆

حضرت یوسفؑ

یہ کتاب بھی محمد اعظم رضا تبسم کی ہے۔ اس کتاب میں حضرت یوسفؑ کے واقعات کافی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

مصنف: محمد اعظم رضا تبسم
ناشر: زُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز
اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
فون نمبر: 051-5551519
قیمت: ۳۲۰/روپے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

وصی شاہ

ہارلینڈ

سینڈر ۱۸۹۰ء میں امریکا میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس کا باپ ایک غریب کان کن تھا اور اپنی موت تک ساری عمر کوئلے کی کان کی کھدائی میں مصروف رہا اور جوانی ہی میں ہارلینڈ اور اس کے چار بہن بھائیوں کو یتیم کرگیا۔ باپ کی موت کے وقت سینڈر کی عمر صرف ۱۶رسال تھی اور اس پر اپنے چھوٹے ۴ر بہن بھائیوں کا بوجھ اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ سینڈر نے کمسنی میں پہلی نوکری ایک شرٹ بنانے والی فیکٹری میں کی۔ اس دوران میں اس کی ماں بھی نوکری پر جاتی تھی۔ ماں کی ہدایت کے مطابق ماں کی غیر موجودگی میں سینڈر کو اکثر اپنے بہن بھائیوں کے لیے گھر میں کھانا بھی بنانا پڑتا تھا۔ سینڈر نے اس دوران میں اپنی ماں سے کئی کھانے بنانے سیکھ لیے۔

اگلے چند برس سینڈر کو اپنا اور اپنے بہن بھائیوں کا جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کئی نوکریاں کرنی پڑیں۔ اس نے کھیتوں میں پھل توڑنے کا کام بھی کیا۔ کمسنی میں بس کنڈکٹری کی۔ نوکری بھی کی۔ کچھ عرصہ کے لیے فائر مین بھی رہا اور آخر میں ایک بہت چھوٹے سے سروس اسٹیشن کا آغاز کیا۔ یہیں سے سینڈر کی کامیابی کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ سینڈر کے چھوٹے سے سروس اسٹیشن پر جو مسافر رکتے تھے وہ ان کے لیے کھانے کا انتظام بھی کرنے لگا۔ ماں سے جو کھانے بنانے اس نے سیکھے تھے ان میں خاص طور پر فرائیڈ چکن ایک ایسی ڈش تھی جو مسافروں میں بہت مقبول ہونا شروع ہوگئی اور اس کے بنائے ہوئے فرائیڈ چکن کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ یہیں سے سینڈر نے اپنے پہلے ریسٹورنٹ کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۵ء تک جب سینڈر ۴۵رسال کا ہوا تو اس کے فرائیڈ چکن کی دھوم دور دور تک پھیل چکی تھی۔ تبھی گورنر روبی لیفون نے اسے ''کینٹکی کرنل'' کا خطاب دیا۔

لیکن اس کی زندگی کی جنگ اور اتار چڑھاؤ ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں کچھ وجوہات کی بنا پر سینڈر کا بزنس تباہ ہوگیا اور سینڈر کو انتہائی مشہور اور چلتا ہوا کامیاب ریسٹورنٹ بند کرنا پڑا اور مالی حالت یہاں تک خراب ہوگئی کہ اس کو سوشل سیکورٹی کا سہارا لینا پڑا۔ جب اس نے ۱۰۵رڈالر کا سوشل سیکورٹی کا پہلا چیک وصول کیا اس وقت اس کی عمر ۶۵رسال تھی مگر پہلے چیک کی وصولی پر ہی ساری عمر، زندگی سے جنگ لڑنے والے سینڈر نے طے کیا کہ وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر بقیہ زندگی گورنمنٹ کی خیرات وصول کرتے نہیں گزارے گا۔

اس کے پاس ایک ہنر تھا۔ بہترین اور لذیذ فرائیڈ چکن بنانے کا کامیاب ہنر۔ اس نے گورنمنٹ کے ۱۰۵رڈالر کے چیک کو لات مار کر مختلف کمپنیوں اور لوگوں کو اس بزنس میں پیسہ لگانے کے لیے قائل کرنا شروع کیا اور یوں اس فوڈ چین کی بنیاد پڑی جسے دنیا KFC یعنی کینٹکی فرائیڈ چکن کے نام سے جانتی ہے۔ اس وقت کرنل کی عمر ۶۲رسال تھی اور سال تھا ۱۹۵۲ء اور آج تقریباً ۱۰۵ر سے زائد ممالک میں اس کی ۱۷۰۰۰ر سے زائد شاخیں ہیں اور یہ دنیا کی دوسری بڑی فوڈ چین تصور کی جاتی ہے۔

سینڈر کی یہ سکسیس سٹوری مجھے آج دو وجوہات پر یاد

صحت بخش عادت

قہقہے

قہقہہ ہنسی اور مسکراہٹ کا احساس کسی ٹانک سے کم نہیں

زبیر وحید

طنز و مزاح اور جگت بازی کو اکثر سنجیدہ لوگ بڑی سطحی شے گردانتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ کسی پر بلاوجہ پھبتی کس کر ہنسنا اس شخص کی تذلیل کے مترادف ہے۔ لیکن کچھ ماہرین کا خیال ہے، ضروری نہیں کہ دوسروں پر پھبتی اور جگت بازی سے ہی ہنسی آتی ہو۔ اس کے لیے کچھ محرکات اور بھی پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ہنسی بڑی انمول شے ہے اور اگر لوگ لمبی اور صحت مند زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ قہقہے لگایا کریں اور خود کو خوش و خرم رکھیں۔ ۲ر ہزار سال قبل ارسطو نے کہا تھا ''قہقہہ ایک جسمانی ورزش ہے اور صحت کے لیے قیمتی شے ہے۔'' قہقہہ طویل عمری کا ایک راز ہے۔ اس سے ذہنی دباؤ اور جذباتی تناؤ میں کمی آتی ہے۔

ڈاکٹر جان کیلوگ، بیٹل کریک (Battle Creek) میں ایک شفاخانہ چلا رہے تھے۔ ان کے شفاخانہ میں بڑے مشہور اور امیر مریضوں کا علاج ہوتا تھا۔ وہ مریض وہاں مناسب خوراک اور ورزشیں کرتے تھے لیکن ان تمام ورزشوں اور غذاؤں کے مقابلہ میں ان مریضوں کو اس شفاخانہ میں ہنسنے کے اوقات کار میں ہنسنے سے بہت زیادہ فائدہ ہوتا تھا۔ مریضوں کو علاجی غسل سے زیادہ قہقہے لگانے سے بحالی صحت اور ترنگ کا احساس ہوتا تھا۔ قہقہوں کا دور شفاخانہ کے جمنیزیم ہال میں کرایا جاتا تھا۔ جمنیزیم ہال میں لوگ قہقہوں سے اپنی پریشانی اور ذہنی دباؤ کو رفع کرتے تھے۔ بالکل اسی تکنیک پر ایک اور مشہور ڈاکٹر نے اپنے طالب علموں کو مشورہ دیا کہ وہ بھی قہقہوں سے اپنی الجھنوں اور پریشانیوں کو دور کیا کریں۔

نفسیات اور فلسفہ کے بہت سے ماہرین افلاطون، ارسطو، کانٹ، برجسن، فرائڈ اور کوئسلر نے قہقہہ کی نفسیات پر بہت سے مقالے لکھے ہیں۔ یہ تمام لوگ قہقہہ کی اس خوبی پر متفق ہیں کہ قہقہہ یک دم تمام پریشانیوں اور ذہنی دباؤ کو دور کر دیتا ہے اور بندہ پرسکون اور اس کے اعصاب ڈھیلے ہوجاتے ہیں۔

ہنسنے سے آنکھوں میں چمک، چہرے کی جلد میں نرمی اور ہمارے اعصابی اور غدودی نظام میں درستگی پیدا ہوتی ہے۔ ہنسنے سے ہاضمہ تیز ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ہنسی اور مسکراہٹ سپاٹ چہروں کو بھی پُرکشش بنا دیتی ہے۔ جرمن ماہر بشریات نے مووی کیمرے کے ذریعہ انسانی رویوں پر بڑی تفصیل سے کام کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ''انسانی رویوں پر ہنسنے اور قہقہوں کے بڑے مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس نے مثال کے ذریعہ بتایا کہ ایک فلم کے دوران ایک چینی عورت کو دس منٹ تک مسلسل غصہ کی حالت میں دیکھتے ہوئے کوئی پُرکشش اثر پیدا نہ ہوا لیکن جونہی اس کے سپاٹ چہرے پر مسکراہٹ نے جنم لیا تو وہ اچھی لگنا شروع ہوگئی۔ ماہر بشریات کا کہنا ہے کہ قہقہہ، ہنسی اور مسکراہٹ کا احساس ذہنی تناؤ کم کرنے اور قوت برداشت کو بڑھانے میں مدد دیتا ہے اور یہ کسی ٹانک سے کم نہیں ہے۔ قہقہے زندگی بچاتے اور اسے نکھارتے ہیں۔ اس میں رنگینیاں پیدا کرتے ہیں اور جینے کی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ دنیا شاید اس قدر کرب ناک جگہ نہیں ہے، اگر ہم اس میں ہنسی اور خوشیاں بکھیرتے رہیں خود بھی ہنسیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے رہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم ناجائز اور فضول رسومات کی تقلید میں یہ سب کچھ بھولتے جارہے ہیں۔

ہمارا مذہب اسلام ہمیں دوسروں کی تضحیک کی صورت میں ہنسنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمارے نبیؐ بھی مسکرانے کو ہی احسن طریقہ سمجھتے تھے۔ بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اخلاقی اعتبار سے تمسخر کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ ایسے ہنسنے اور قہقہے لگانے سے ضمیر کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk
urdudigest.pk urdudigest.pk

آئی۔ ایک وجہ انتہائی مسرت اور خوشی لے کر آئی جب کہ دوسری قدرے اداس کر دینے والی تھی۔

پہلی انتہائی خوش کر دینے والی وجہ اور خبر یوم آزادی کے قریب ملنے والی محمد محسن علی کی خبر تھی۔ جن کے والد ایک تندور چلاتے ہیں اور محمد محسن علی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر تندور پر کام کرتا تھا اور رات ۱۲ر بجے تک مزدوری کے بعد علی الصباح پڑھائی کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ محمد محسن علی کا بتانا ہے کہ اس نے ۲ر ایمرجنسی لائٹس رکھی ہوئی ہیں تا کہ لوڈشیڈنگ کے باعث اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہو۔ محسن علی نے ۸۰۰ر میں سے ۶۸۸ر نمبر لے کر نہ صرف موجودہ سال بی اے میں پہلی پوزیشن حاصل کی بلکہ پنجاب یونیورسٹی کی سطح پر اب تک سب سے زیادہ نمبرز حاصل کرنے کا ایک نیا ریکارڈ بھی قائم کر دیا۔ اس سے پہلے یہ ریکارڈ ۶۸۰ر نمبر حاصل کرنے والے طالب علم کے پاس تھا۔

ثابت یہ ہوا کہ کامیابی انہی کے قدم چومتی ہے جو زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور پنجوں میں پنجہ لڑا کر زندگی سے لڑنا جانتے ہیں۔ زندگی سے گھبرا کر ہارتے نہیں۔ زندگی کو زیر کر کے اس سے اپنا حق وصول کرنا جانتے ہیں۔ محمد محسن علی پوری پاکستانی قوم، طلبا اور خصوصاً اس طبقے اور اس طبقے کے طالب علموں کے لیے مشعل راہ ہیں جن کے حقوق ۲ر فیصد اشرافیہ نے غصب کر رکھے ہیں۔ محمد محسن علی کی کامیابی ہمیں یہ بتاتی اور سکھاتی ہے کہ اگر نظریں (K2) کی چوٹی پر ہوں تو حالات اور موسم کیسے ہی کیوں نہ ہوں، K2 کی چوٹی انسانی عزم و حوصلہ کے قدموں تلے آجایا کرتی ہے۔ قوم کو، طالب علموں کو، پسے ہوئے محروم طبقہ کو محسن علی کی کامیابی ۱۴راگست کے قریب مبارک ہو۔

افسوس اور دکھ مجھے ایک نیوز چینل پر رپورٹ دیکھ کر ہوا جو میرے ہی شہر سرگودھا سے تعلق رکھنے والے نوجوان کی تھی کہ اس نے ایم اے پاس کرنے کے بعد ایک ریڑھی لگائی ہے۔ چینل پر رپورٹ بنانے والوں نے رپورٹ کچھ یوں مرتب کی تھی کہ جیسے ریڑھی لگانا ایم اے کرنے کے بعد اس نوجوان کے شایان شان نہیں رہا ہے۔ رپورٹ میں التجا کی گئی تھی کہ نوجوان کو کوئی سرکاری نوکری دی جائے۔ ہمیں، ہمارے ذرائع ابلاغ کو اپنی قوم کے نوجوانوں کی رہنمائی عقل و ہوش کا دامن تھام کر کرنی چاہیے۔ ہر وقت گورنمنٹ کو بُرا کہنے کی ریس میں شعور کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہمیں اپنے نوجوانوں کو بتانا چاہیے کہ ہم انؐ کی امت ہیں جو اپنے کپڑوں میں پیوند خود لگاتے اور اپنے جوتے خود گانٹھ لیا کرتے تھے۔ سو پہلی بات تو یہ کہ کام کوئی بھی ہو اس میں عار نہیں ہے۔ عار تو جھوٹ، فراڈ، فریب، کرپشن، بے ایمانی، رشوت اور دو نمبری میں ہے۔ میرے نزدیک ایک کرپٹ بیوروکریٹ، جج، جرنیل، سیاستدان، بزنس مین یا صحافی سے کہیں زیادہ بہتر وہ موچی ہے جو جوتے پالش کرتا ہے، وہ خاکروب ہے وہ جمعدار ہے جو گٹر میں اُتر کر بدبودار گٹر کی صفائی کرتا مگر حلال رزق کماتا ہے۔ اسی طرح ڈگری کے بعد ضروری نہیں ہے کہ سرکاری نوکری ہی کی جائے۔ آپ کوئی تندور کھول کر یا چھابڑی لگا کر یا ریڑھی لگا کر یا برگر کا کھوکھا لگا کر یا پلمبری کا کام سیکھ کر یا گاڑیوں کی ورکشاپ کھول کر اس کو آہستہ آہستہ سینڈر کی طرح ایک بڑے بزنس میں بدل سکتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جس چینل پر یہ رپورٹ چلی اس کے مالک نے خود ایک ایسے اخبار کی بنیاد رکھی تھی جہاں اخبار کے بنیادی چھوٹے چھوٹے کام بھی موصوف شروع میں خود کیا کرتے تھے اور آج ان کا خاندان ایک بڑے میڈیا گروپ کا مالک ہے۔ سینڈر کی کامیابی ہمیں اور ہمارے نوجوانوں کو یہی سکھاتی ہے کہ سفر بھلے عمر کے کسی بھی حصہ میں شروع ہو اور کہیں سے بھی شروع ہو چاہے مائنس سے ہی کیوں نہ شروع ہو وہ ۱۰۵ر سے زیادہ ممالک میں ۷۰۰۰ر شاخوں تک پہنچایا جا سکتا ہے اور اس سے بھی مزید آگے کہ محنت کرنے والوں، ہمت نہ ہارنے والوں اور کسی بھی کام کو نیچ یا ہیچ نہ سمجھنے والوں کے لیے..... ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں.....

اس ہفتے میں اپنے ایک عزیز سے ملنے کینیڈا آیا ہوا ہوں جو ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ یہاں ہسپتالوں میں عوام کو آگاہ کرنے کے لیے بہت سے پروگرام بھی ترتیب دیے جاتے ہیں۔ اتفاق سے جب میں ہسپتال میں اپنے مریض کی عیادت کے لیے آیا تو برین ہیمبرج یعنی دماغ کی رگیں پھٹنے سے بچنے کے لیے کیا پیشگی اقدام ضروری ہیں، اس پر سیمینار ہو رہا تھا۔ میں نے اس سیمینار میں شرکت کی، چند گھنٹوں میں بہت سی مفید معلومات مجھے حاصل ہوئیں۔ لیکچر دینے والے پروفیسر نے حاضرین کو بتایا کہ دس اشیا ایسی ہیں جن کا روزمرہ استعمال انسانوں کو نہ صرف صحت مند رہنے میں مدد دیتا ہے بلکہ برین ہیمبرج کے خطرے سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ تمام کی تمام اشیا ایک وقت میں استعمال کریں بلکہ اپنی آسانی کو مدنظر رکھ کر ان کو استعمال میں لائیں۔ پہلی چیز جس پر پروفیسر کی خصوصی توجہ تھی وہ کھانے میں ہلدی کا لازمی استعمال ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اپنے کھانے میں ہلدی کو ضرور شامل کریں۔ ان اشیاء کے استعمال سے کئی بیماریوں خصوصاً بلڈ پریشر کو روکنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اُس نے بتایا کہ ایشیائی باشندے تو اپنی غذاؤں میں جب ہلدی، ادرک، لہسن اور دھنیا مرچ پاؤڈر شامل کرتے ہیں تو اس کی وجہ سے نمک کم ڈلتا ہے جو بلڈ پریشر کو اعتدال میں رکھنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ تجربات بتاتے ہیں کہ انسان دماغ کی الزائمر نامی بیماری سے بھی بچ جاتا ہے نیز دماغ میں پیدا ہونے والے سفید خونی سیل سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ہلدی کے استعمال سے اگر دماغ میں اسٹروک پیدا بھی ہو جائے تو وہ اس کو زائل کر دیتا ہے۔ دوسرے نمبر پر ایسی مچھلی کا استعمال جس پر موٹی کھال ہو اور چربی بھی ہو، اس کے کھانے سے دماغ کی شریانیں محفوظ رہتی ہیں۔ اس مچھلی میں اومیگا ۳ فیٹی ایسڈ ہوتا ہے جو دل کی دھڑکنوں کو تقویت پہنچاتا ہے لہٰذا موٹی موٹی مچھلیاں جن میں چربی زیادہ ہو مثلاً سالمن سارڈین، میکریل اور ٹراؤٹ وغیرہ پر تجربات کیے گئے۔ ان مچھلیوں کا استعمال برین ہیمبرج سے بچاؤ اور دل کی دھڑکنیں معمول میں رکھنے میں مددگار ثابت ہوا۔ تیسرے نمبر پر بڑی بڑی شملہ مرچیں جو رنگ برنگی ہوتی ہیں، ان میں Vitamin-B6، Vitaminn-C، فولیٹ اور پوٹاشیم وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں جو دماغ کو تر و تازہ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کے استعمال سے دماغ ٹھنڈا رہتا ہے اور بہت سی (Inflammations) سے محفوظ رہتا ہے۔ انھیں ہر طرح کی غذا میں شامل کر کے برین ہیمبرج اور دیگر دماغی اسٹروکس سے بچا جا سکتا ہے۔ چوتھے نمبر پر اسٹابریز، بلیو بیریز، شہتوت کی تمام قسمیں ہیں جنھیں کھانے سے دماغ کو بہت تقویت پہنچتی ہے اور دماغ کی قدرتی صفائی ہوتی ہے اور فاضل مادے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس پھل میں پولی فینائل ہوتا ہے اس سے بھی ہم دماغ کی صفائی بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں، جس سے دماغ بہتر طریقے سے کام کرتا ہے اور نروس سسٹم مکمل طور پر صحت مند رہتا ہے۔ پانچویں نمبر پر (NUTS) یعنی خشک میوہ جات (Dry Fruits) جن میں اخروٹ، بادام، مونگ پھلی، ہیزل نٹ اور برازیلین نٹ وغیرہ شامل ہیں جنھیں کھانے سے انسانی جسم میں خراب کولسٹرول پیدا نہیں ہوتا، اور اگر یہ خراب کولسٹرول پیدا ہو بھی گیا ہو تو وہ ضائع ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے دل پر اٹیک نہیں ہوتا۔ مگر یہ اشیا مناسب مقدار میں کھائی جانی چاہئیں۔ اخروٹ کا استعمال ڈاکٹس، دماغی بیماریوں کو روکنے میں بہت اہم کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ عمر بڑھانے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

برین ہیمبرج سے بچاؤ کا طریقہ

خلیل احمد نینی تال والا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلچسپی، معلومات
اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ،
یہی ہے اِس
کوئز کا اصل مقصد

یہی ہے قصہ کوئز

انچارج کوئز:
غلام سجاد

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اُکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، اس کی ۳ر بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بغور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے ۲ر سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے ۶ر شماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ وصی شاہ کی شاعری کی ۲ر خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماھنامہ اُردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہ ستمبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔ (الف) ہیروشیما (جاپان) (ب) امریکا۔ قصہ کوئز ۲۔ (الف) مکی ماؤس (ب) والٹ ڈزنی
قصہ کوئز ۳۔ (الف) بیتھل (بیت المقدس) (ب) اسرائیل

درست جوابات دینے والوں کے نام

ڈاکٹر نوید عفرا (لاہور)، پروفیسر خان محمد (پشاور)، محمد ندیم (لاہور)، شعیب شاہد (لاہور)، عقیل احمد (کراچی)، حافظ احمد ہاشمی (لاہور)، مصباح العین (گوجرانوالا)، حافظ طیبہ ناز (لاہور)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ (لاہور)، سعدت اللہ (ڈیرہ اسماعیل خان)، محمد سعید بشیر (لاہور)، محمد احمد (کراچی)، مرزا فرحال بیگ (حیدر آباد)، طٰہٰ یٰسین (حیدر آباد)، ریاض الدین منصوری (سانگھڑ)، فائزہ علوی (فیصل آباد)، محمد عرفان (لاہور)، فضل رحیم (پشاور)، آرتھر فرخ حیات (ساہیوال)، فاطمہ عبدالمجید (کراچی)، محمد عمیر مغل (لاہور)، عامر غنی (فیصل آباد)، صادقہ احسان (اسلام آباد)، فضہ بتول (فیصل آباد)، عمر حمید (فیصل آباد)، محمد یوسف قریشی (حیدر آباد)، عبدالماجد مغل (کراچی)، فیاض مدثر مبین (کراچی)، فضل داد (جہلم)، بشارت علی کوثری (قصور)۔

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

۱۔ ریاض الدین منصوری، این ڈی سویٹ ہاؤس، چودھری کارنر، سانگھڑ
۲۔ آرتھر فرخ حیات، 521/R، فرید ٹاؤن، ساہیوال

آپ کو ۶ر ماہ تک اُردو ڈائجسٹ کے شمارے اور وصی شاہ کی کتب بطور تحفہ ملیں گی

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھی بھجوا سکتے ہیں

قصہ کوئز/۱

ان کا نام نواب میرزا تھا۔ دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ ذوق کے شاگرد تھے اور اردو زبان کے مزاج سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کی زبان کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خان کو انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں پھانسی دے دی تھی۔ وہ اس واقعے کے بعد ہی رام پور چلے گئے تھے اور وہاں نواب کلب علی خان کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے کلام میں بھی کسی قسم کی کوئی افسردگی، آزردگی، دردمندی یا سوز و گداز وغیرہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان کے کلام میں شوخی، شرارت، چھیڑ چھاڑ، طنز و طعن، رشک اور بدگمانی کے مضامین عام ہیں۔ ان کی زندگی ہی میں ان کی شہرت و مقبولیت پورے ملک میں پھیل گئی تھی اور ان کی شاعری کا ڈنکا ہر طرف بجنے لگا تھا۔ علامہ اقبالؒ بھی ابتدا میں ان کے شاگرد رہے تھے۔ اور ان کی موت پر اقبالؒ نے ایک پُر تاثیر مرثیہ لکھا تھا جس میں ان کی شاعری کی خوبیاں بیان کی گئی تھیں۔

(الف) اس مشہور شاعر کا تخلص کیا تھا؟
(ب) شاعری کی کون سی صنف ان کی پہچان تھی؟

قصہ کوئز/۲

وہ سقراط کی روایت کا آخری بڑا مفکر تھا جو ۳۸۴ رق م میں پیدا ہوا۔ وہ ۱۷ر برس کا تھا جب وہ افلاطون کی اکیڈمی میں داخل ہوا۔ جہاں وہ ۲۰ر برس پہلے طالب علم اور پھر مدرس رہا۔ ۳۴۳ رق م میں مقدونیہ کے شاہ فلپ نے اسے اپنے بیٹے اسکندر کا اتالیق مقرر کیا۔ لیکن اس کے شاگرد نے اس سے فکر و فلسفہ تو بہت کم سیکھا البتہ نوجوان شہزادے کو سائنس اور یونانی تہذیب کے بعض دوسرے عناصر میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ۷ر سال بعد وہ ایتھنز واپس چلا آیا۔ یہاں اس نے اپنا سکول کھولا جسے وہ اپنی زندگی کے آخری ایام یعنی ۳۲۲ رق م تک چلاتا رہا۔ اس نے افلاطون سے بھی زیادہ لکھا اور زیادہ متنوع موضوعات پر اظہارِ خیال کیا۔

(الف) اس عظیم یونانی مفکر کا کیا نام تھا؟
(ب) اس نے جو سکول قائم کیا اس کا کیا نام تھا؟

قصہ کوئز/۳

بجلی سے جلنے والا بلب ۱۸۷۹ء میں سامنے آیا۔ اس سائنسدان نے دنیا بھر کے انسانوں کو یہ بہترین تحفہ دیا۔ ۱۹۳۰ء میں بجلی کی روشنی کے ۵۰ر سال ہونے پر اس عظیم مؤجد کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جشن منایا گیا جسے عرفِ عام میں "۵۰ر سالہ جشن" کہتے ہیں۔ اس جشن میں ملک کی بہت سی ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔ ملک کے صدر بھی اس عظیم مؤجد کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے منعقدہ تقریب میں موجود تھے۔ اچانک ان کی مسز چیخ اٹھیں "دیکھو!" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی "اُن کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ عظیم شخص بے ہوش ہو کر اپنی کرسی پر آگے کی طرف لڑھک گیا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ سیکڑوں مہمانوں کے چہروں پر فکر و وہم کے بادل چھا گئے۔ محبّت بھرے ہاتھوں نے نحیف مؤجد کو اٹھایا اور لے جا کر ساتھ والے کمرے میں ایک مسہری پر لٹا دیا۔ صدر کے ذاتی معالج جوئیل ٹی بون نے ابتدائی علاج کیا۔ چند لمحوں کے بعد ہی اداس و غمگین مہمانوں کو یہ خبر پا کر تسکین ہوئی کہ عظیم مؤجد کو ہوش آ گیا ہے۔

(الف) اس عظیم مؤجد کا کیا نام تھا؟
(ب) اس کا تعلق کس ملک سے تھا؟

انعامات کے لیے تعاون
خوبصورت اور معیاری کتب
منشورات ہیڈ آفس: منصورہ، ملتان روڈ لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماہِ رواں کی شخصیات

ماہ رواں سے ایک نئے سلسلے کا بھی آغاز کر رہے ہیں۔ بہت محنت سے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ آپ کے لیے اہم معلومات کا ماخذ ثابت ہوگا

محمد خلیل چودھری (دینہ)

اکتوبر میں پیدا ہونے والی شخصیات

یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء قائد ملت لیاقت علی خان

یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء احمد شاہ پطرس بخاری (ادیب)

یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء جسٹس (ر) جاوید اقبال (علامہ اقبال کے فرزند)

یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء فاطمہ جناح (قائداعظم کی بہن)

یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء شکیب جلالی (شاعر)

۲ اکتوبر ۹۷۱ء سلطان محمود غزنوی (فاتح ہندوستان)

۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء مہاتما گاندھی (سیاستدان)

۲ اکتوبر ۱۹۰۴ء لال بہادر شاستری (بھارتی وزیراعظم)

۴ اکتوبر ۱۸۵۳ء مرزا قلیچ بیگ (ادیب)

۴ اکتوبر ۱۹۲۸ء سجاد باقر رضوی (ادیب)

۵ اکتوبر ۱۸۸۰ء حافظ محمود شیرانی (فارسی شاعر)

۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء مولانا حسین احمد مدنی (عالم دین)

۷ اکتوبر ۱۹۱۲ء آل احمد سرور (ادیب)

۷ اکتوبر ۱۹۱۸ء فکر تونسوی (شاعر)

۸ اکتوبر ۱۸۴۴ء بدرالدین طیب (ماہر قانون)

۹ اکتوبر ۱۲۳۷ء حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء یوسف کامران (ادیب)

۹ اکتوبر ۱۸۷۴ء ونسٹن چرچل (سابق برطانوی وزیراعظم)

۱۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء محمد علی بوگرہ (سابق صدر پاکستان)

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء مصطفیٰ زیدی (شاعر)

۱۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء ڈاکٹر کلیم عاجز (شاعر)

۱۲ اکتوبر ۱۸۹۸ء منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی (شاعر)

۱۳ اکتوبر ۱۹۳۸ء جدا فاضلی (شاعر)

۱۳ اکتوبر ۱۹۲۵ء مارگریٹ تھیچر (سابق برطانوی وزیراعظم)

۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء سید امتیاز علی تاج (ناول نگار)

۱۳ اکتوبر ۱۹۲۴ء کشور کمار (گلوکار)

۱۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء بہادر شاہ ظفر (آخری مغل بادشاہ)

۱۴ اکتوبر ۱۹۲۷ء میاں منظر بشیر (سیاستدان)

۱۴ اکتوبر ۱۹۶۸ء راشد لطیف (سابق کپتان پاکستان کرکٹ)

۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء اکبر اعظم (مغل بادشاہ)

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء محسن احسان (شاعر)

۱۶ اکتوبر ۱۹۰۴ء خواجہ غلام السیدین

۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء برق لکھنوی (شاعر)

۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء یاس یگانہ چنگیزی (شاعر)

۱۸ اکتوبر ۱۹۰۲ء جسٹس محمد رستم کیانی (قانون دان۔ ادیب)

۱۹ اکتوبر ۱۹۰۸ء جنرل موسیٰ خان (سابق گورنر بلوچستان)

۱۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء محمد ادریس کاندھلوی (عالم دین)

۱۹ اکتوبر ۱۹۱۹ء مخدوم طالب المولیٰ (سیاسی رہنما)

۲۰ اکتوبر ۱۸۳۳ء الفریڈ نوبیل (نوبل انعام کا بانی)

۲۰ اکتوبر ۱۸۱۹ء سید علی محمد شیرازی (بہائی مذہب کا بانی)

۲۲ اکتوبر ۱۶۸۸ء نادر شاہ (افغان حکمران)

۲۳ اکتوبر ۱۸۸۸ء علامہ عبدالعزیز میمن (عالم دین)

۲۳ اکتوبر ۱۹۲۷ء ڈاکٹر احسان رشید (وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی)

۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء پرتو روہیلہ (شاعر)

۲۳ اکتوبر ۱۹۴۰ء پیلے (فٹ بال کا عظیم کھلاڑی)

۲۵ اکتوبر ۱۸۰۰ء لارڈ میکالے (ماہر تعلیم)

۲۵ اکتوبر ۱۹۰۵ء نوب مشتاق احمد گورمانی (سیاستدان)

۲۵ اکتوبر ۱۹۴۴ء لانس نائیک محمد محفوظ شہید (نشانِ حیدر)

۲۶ اکتوبر ۱۹۰۱ء ڈاکٹر غلام جیلانی برق (ادیب و عالم دین)

۲۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء تھیوڈر روزویلٹ (سابق امریکی صدر)

۲۹ اکتوبر ۱۸۷۱ء مولوی فضل الحق (ادیب)

۳۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا (معروف بھارتی سائنسدان)

۳۱ اکتوبر ۱۳۸۲ء علامہ ابن خلدون

۳۱ اکتوبر ۱۸۷۵ء سردار پٹیل (سیاستدان)

۳۱ اکتوبر ۱۹۱۰ء محمود علی قصوری (ماہر قانون و سیاستدان)

urdudigest.pk

اکتوبر میں وفات پانے والی شخصیات

یکم اکتوبر ۱۹۰۱ء عبدالرحمٰن خان (امیر افغانستان)

یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء ریاض شاہد (مصنف، ہدایت کار اور فلم ساز)

یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء پیر جماعت علی شاہ گیلانی (مذہبی لیڈر)

۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء مختار بیگم (علامہ اقبال کی اہلیہ)

۲ اکتوبر ۱۹۷۴ء نورالامین (پاکستانی نائب صدر)

۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء امام بخش (پہلوان)

۳ اکتوبر ۱۹۶۷ء سیج (ممتاز کارٹونسٹ)

۳ اکتوبر ۱۹۹۱ء جنرل فضل حق (سابق گورنر سرحد)

۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء سر ہدایت اللہ (وزیر اعلیٰ سندھ)

۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء راجہ صاحب محمود آباد (سیاستدان)

۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء مولانا مفتی محمودؒ (عالم دین)

۵ اکتوبر ۱۹۷۹ء احمد پرویز (مصور)

۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء عبدالعزیز فطرت (شاعر)

۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء احمد شاہ پطرس بخاری (ادیب)

۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء مفتی محمد شفیع (عالم دین)

۶ اکتوبر ۱۹۸۱ء انور السادات (مصری صدر)

۶ اکتوبر ۱۹۶۷ء نواب محسن الملک (سیاسی رہنما)

۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء جے پرکاش نارائن (سابق بھارتی صدر)

۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء منشی پریم چند (ادیب)

۸ اکتوبر ۱۹۵۵ء خلیفہ شجاع الدین (سابق سپیکر پنجاب اسمبلی)

۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء ن۔ م۔ راشد (ادیب)

۹ اکتوبر ۱۹۷۹ء نور محمد ترکی (سابق افغان صدر)

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء نوح ناروی (شاعر)

۱۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء بہزاد لکھنوی (شاعر)

۱۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء ایڈیسن (مشہور زمانہ موجد)

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۱ء عارف ہوشیارپوری (شاعر)

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۹ء مظہر شاہ (فلمی اداکار)

۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء مصطفیٰ زیدی (شاعر)

۱۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء شیخ اسماعیل پانی پتی (ادیب)

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۳ء علی ناصر زیدی (ادیب)

۱۳ اکتوبر ۸۹۲ء امام ترمذیؒ (محدث)

۱۳ اکتوبر ۱۹۸۷ء کشور کمار (گلوکار)

۱۳ اکتوبر ۱۹۸۷ء انور کمال پاشا (ہدایتکار، فلم ساز)

۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء راجہ صاحب محمود آباد (سیاستدان)

۱۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء مفتی محمودؒ (عالم دین)

۱۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء خواجہ محمد صفدر (سابق سپیکر)

۱۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء ماتا ہری (جاسوسہ)

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء قائد ملت لیاقت علی خان

۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء نواب محسن الملک (سیاستدان)

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء غلام بھیک نیرنگ (ادیب)

۱۷ اکتوبر ۱۲۶۵ء حضرت بابا فرید گنج شکر (ولی اللہ)

۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء جلال الدین اکبر (مغل بادشاہ)

۱۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء مولانا محمد یوسف بنوری (عالم دین)

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۰ء میجر جنرل سرفراز خان

۱۷ اکتوبر ۱۸۹۸ء سر سید احمد خان (مسلمان رہنما)

۱۸ اکتوبر ۱۹۷۵ء پیر الٰہی بخش (سابق وزیر اعلیٰ سندھ)

۱۸ اکتوبر ۱۹۷۲ء حسن ریاض (صحافی)

۱۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء امداد اللہ مہاجر مکی (نامور مصنف)

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء سلیم ناصر (شاعر)

۲۰ اکتوبر ۱۷۰۷ء ولی دکنی (شاعر)

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء محمد ایوب کھوڑو (سیاستدان)

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۹ء ڈاکٹر سید معین الحق (ادیب)

۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء مرزا ہادی رسوا (ادیب)

۲۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء محمد مالک کاندھلوی (عالم دین)

۲۲ اکتوبر ۱۹۶۴ء خواجہ ناظم الدین (سابق وزیر اعظم)

۲۲ اکتوبر ۱۹۸۷ء ارباب نیاز محمد خان (وزیر اعلیٰ سندھ)

۲۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء میر لائق علی

۲۴ اکتوبر ۱۹۶۸ء قمر جلالوی (شاعر)

۲۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء آغا شورش کاشمیری (ادیب)

۲۴ اکتوبر ۱۹۸۵ء مقبول جہانگیر (ادیب)

۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء ساحر لدھیانوی (شاعر)

۲۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء ابراہیم جلیس (افسانہ نگار)

۲۷ اکتوبر ۱۹۹۵ء ممتاز مفتی (ادیب، افسانہ نگار)

۲۸ اکتوبر ۱۹۶۸ء رئیس احمد جعفری (ادیب)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حمدِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

مارننگ شوز میں نامناسب فقرے بازی

ستمبر کا شمارہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ سامنے ہے۔ حسبِ عادت آخری صفحات پر پہلے نظر پڑی۔ مسئلہ واقعی فکر انگیز ہے۔ اس مسئلے کی بیخ کنی کرنا ضروری ہے۔ یقیناً یہ سچ ہے کہ سماج دشمن عناصر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دیہی علاقوں سے آنے والی طالبات کو اپنا آلہ کار بنا لیتے ہیں۔ کبھی نام نہاد اساتذہ کے روپ میں اور کبھی کلاس فیلوز کے روپ میں۔ کسی مصلحت کا شکار ہوئے بغیر آپ نے ان چہروں کو بے نقاب کر کے بڑی خدمت کی ہے۔

ٹی وی پر روزانہ ٹاک شوز کے نام سے ہونے والے بے ہودہ بھنڈ بازی کے پروگرامز پر قلم اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ ''ہم''، ''جیو'' نامی چینلز پر بھارتی پروگرام جس دیدہ دلیری سے پیش کیے جاتے ہیں، نامناسب اور قابلِ اعتراض فقرے بازی سے سجے مخلوط مارننگ شوز دیکھنے کو مل رہے ہیں، ان پر بھی قلم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ بہرحال سب باتوں سے قطع نظر آپ کی کاوش، محنت اور ہمت نے اردو ڈائجسٹ کو قومی عوامی ڈائجسٹ بنا ڈالا ہے۔

(فریحا خانم۔ عسکری ۱۰، لاہور)

باتیں دانش کی

اردو ڈائجسٹ سے میرا تعلق تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ اس وقت تقریباً تمام ادبی ڈائجسٹ روبہ زوال ہیں۔ ایسے میں اردو ڈائجسٹ نے نصف صدی سے زیادہ اپنے آپ کو منوایا ہوا ہے تو یہ بڑی بات کہلائی جا سکتی ہے۔ گزشتہ سال اس کی مجلسِ ادارت میں جناب اختر عباس کا اضافہ یقیناً ایک بہترین انتخاب ثابت ہوا۔ شوگر، بلند فشارِ خون، ریڑھ کی ہڈی کے مُہروں کی پُرانی تکلیف جیسے اسباب کو بہانہ اور بنیاد بنا کر مجھے سو جانا چاہیے تھا، لیکن کیا کروں کہ آج کل سرہانے اردو ڈائجسٹ پڑا ہے، جس نے سونے کے بجائے مجھے کمپیوٹر کے کلیدی تختہ پر گٹ مِٹ کرنے کو بٹھا دیا ہے۔

تازہ شمارہ کا سرورق ''مدیراتی'' مہارت کے ساتھ بنوایا گیا ہے۔ ۲ رنگوں سرخ اور نیوی بلو میں، اردو ڈائجسٹ لکھوایا گیا ہے، کسی بھی بک اسٹال پر دُور سے سیکڑوں رسالوں کے درمیان بھی سرخ ''اردو'' لکھا نظر آجاتا ہے کیونکہ سرخ رنگ کا تعدد (فریکوئنسی) سب سے زیادہ ہے، اسی طرح نیوی بلو رنگ میں ڈائجسٹ بھی چمک جاتا ہے۔ یہ ۲ رالفاظ اپنے جُدا رنگوں سے اس بات کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ''اردو'' کبھی ''ڈائجسٹ'' ہونے والی نہیں، بلکہ نسیم امروہوی یاد آگئے:

احمدؐ پاک کی خاطر تھا خدا کو منظور
ورنہ قرآں بھی اُترتا بزبانِ اردو

اردو ڈائجسٹ تربیت کے تمام عناصر بھی مہیا کر رہا ہے، مجھے لکھتے ہوئے نصف صدی بیت چکی ہے اور اب کوئی بھی رسالہ، جریدہ، پرچہ اتنا متاثر نہیں کرتا، ہاں کوئی نئی بات چونکاتی ضرور ہے۔ اردو ڈائجسٹ اب مجھے چونکا رہا ہے کیونکہ یہ بہتے پانی کی وہ تاثیر ہے، جو زندگی کا پتا دیتی ہے۔ اردو ڈائجسٹ سے قارئین کا تعلق شیرے میں ڈوبے گلاب جامن جیسا ہے۔ یہ وہ جملے ہیں جو مدیر صاحب ۲۰ رسال پہلے مجھے خطوط میں لکھ کر یقیناً بھول چکے ہوں گے۔ لیکن میں اپنے سفرِ زیست کے آخری Quadrant میں ان جملوں کو یاد رکھے ہوئے ہوں۔

گزشتہ شمارہ میں مجھے خدیجہ مستور کا انتخاب، پانچ غذائیں پسند آئی تھیں۔ قاسمی (پیرزادہ سید احمد شاہ احمد ندیم قاسمی) کے سون سکیسر کی سیر بھی کرا دی۔ غلام رسول صاحب کا اُپندر ناتھ اشک کا انتخاب بھی اچھا تھا۔ عبدالسلام عارف کی ''اس جانب توجہ'' نیز ''دردِل پر دستک'' نے واقعی چونکا دیا تھا۔ کوئی کچھ بھی کرے بس اسلام کو اپنے من چاہے برتن میں نہ اُنڈیلے۔ جس نجی ٹی وی نے اپنی سیاہیاں دھونے کے لیے ''وینا ملک'' جیسی سیاہی کا سہارا لینا چاہا تھا وہ اُلٹا اُنھیں اور داغدار کر گئی۔

اس ماہ محمد مرسی والا آرٹیکل بہت ہی عمدہ اور تفصیلی تھا۔ پاکستانی نوجوانوں کو واقعی سوچ سمجھ کر اپنی قیادت کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ایک غلط فیصلہ بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ نقوشِ صحابہ اور اسلامی کہکشاں ڈائجسٹ کا حسن ہیں۔ کہاں سے ڈھونڈتے ہیں اتنے اچھے مضامین۔ کامیاب بینے خوب تھا اور رتی جناح خوب تر۔ ''باتیں دانش کی'' نیا سلسلہ ہے مگر مبارکباد کا مستحق کہ ہمارے ہاں ہر کوئی انٹرنیٹ سے مغربی دانشوروں کے اقوال اُٹھاتا اور چھاپ دیتا ہے۔ آپ نے اقوال کے ساتھ باقاعدہ دانشوروں کا تعارف دیا ہے۔ کرنل محمد خاں یاد دلا دیے۔ ۱۱ رستمبر، ۱۱ رپہلو لیے ہوئے تھے۔ ۱۱ رسال گزر گئے امریکی مظالم شروع ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کی بابونگری ہم بڈھوں کے لیے دلچسپ تھا۔ ۱۰ رفلمیں مستقبل دکھا گئیں۔ کچھ میں نے دیکھی ہوئی ہیں، باقی دیکھنی پڑیں گی۔ صحت پر مضامین اردو ڈائجسٹ کا حسن اور کمال ہیں۔ صحت نہیں وزن کم کریں نے کتنے ہی لوگوں کی زندگی آسان کی ہے۔ اوپر سے اس شمارہ میں صحت مند رہنے کے ۲۰ رطریقے۔ واہ واہ..... قلم پارے، مودودی صاحب کا اوڑھنا بچھونا جیکی اور سلیم بھائی حق ادا کر دیا۔ صفحات کی نکروں پر آنے والے اقتباسات اور واقعات بہت دلچسپ ہیں۔ کوئز کا سلسلہ منفرد ہے اور چمنِ خیال متوازن اور موزوں۔ بے نیازی اور بے خبری میں کُٹنے کے درد کو روح تک محسوس کیا۔ شکر ہے کسی بہادر آدمی نے اس مسئلہ کو زبان دی۔ ورنہ ہم تو ان مسائل پر گارپٹ ڈال کر اوپر بیٹھ جاتے ہیں۔

(پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی۔ کراچی)

سونامی کا مثبت حوالہ

مصر میں آنے والے انقلاب کے لیے ''سونامی'' کا لفظ محلِ نظر ہے۔ بھلا ایک مثبت تبدیلی کو تباہی و بربادی کے سابقہ یا لاحقہ کے ساتھ کیسے منسلک کیا جا سکتا ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

بھئی! دونوں پرچے مل گئے۔ اس مہینے کا بھی اور گزشتہ ماہ کا۔ ماشاء اللہ بہت ہی خوب صورت اور اچھے لگے۔ پہلا جملہ جو ذہن میں آیا۔ ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ
تحریریں خوب اور پیشکش خوب تر

(مجید نظامی، ایڈیٹر انچیف روزنامہ نوائے وقت)

اردو ڈائجسٹ کے مضمون میں پاکستان میں کسی انقلاب کی ضرورت کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ناقص رائے یہی کہتی ہے کہ جو انقلاب ہمارے ہاں آنا تھا وہ ۱۹۴۷ء میں آ گیا۔ پاکستان کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی حرکیات کا مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ کثیرالجہتی پاکستانی معاشرہ کسی انقلاب کا متحمل نہیں ہوسکتا اور ایسی کوئی کوشش ملک کی سلامتی کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ پاکستان میں اب ''انقلاب'' (Revolution) کی نہیں بلکہ ''ارتقا'' (Evolution) کی ضرورت ہے کہ ارتقائی عمل ہی سے پاکستانی معاشرہ ترقی و استحکام کے راستہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔ مصری سونامی کے لفظ نے یہ ضرور کیا ہے کہ تحریکِ انصاف کی سونامی کو پہلی بار کوئی مثبت حوالہ دیا ہے۔

(ڈاکٹر صاحب! دنیا میں سونامی واقعی تباہی کے لیے استعمال ہوتا رہے ہے۔ مگر ہمارے ہاں عمران صاحب نے اس کو اپنی تحریک کے لیے پسند کرلیا۔ جیسا کہ ہوتا آیا ہے الفاظ دوسرے معاشروں اور زبانوں میں جا کر اپنا مفہوم بدل لیتے ہیں۔ وہاں تو قطرینہ بھی تباہی کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر آپ کے ہمسایوں کے ہاں اس کا مطلب اور استعمال بالکل فرق ہے۔)

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

(ڈاکٹر ندیم اکرام۔ راولپنڈی)

وہ دیکھنے کو اپنی نظر دے گیا ہمیں

ستمبر کا شمارہ نظروں کے سامنے ہے۔ ٹائٹل نے دل خوش کردیا کہ ''مسافروں سے چھلکتا ہے منزلوں کا یقین۔'' مصری سونامی کی کہانی کا جو تجزیہ تھا وہی لب لباب تھا کہ ''پاکستانی نوجوان جو سونامی کی خواہش کو رکھتے ہیں مگر کیا اپنے حصہ کی مشقت برداشت کرنے کو تیار ہیں؟'' کہ محض خواہشوں سے کب منزلیں ملا کرتی ہیں۔ کئی ہفتوں کے پڑھنے کا مواد ہوتا ہے ڈائجسٹ میں اور ہاتھ میں آجائے تو باقی کاموں کی ''ترجیحات'' نہ چاہتے ہوئے بھی بدل جاتی ہیں۔

بھائی...... ! ماہ ستمبر کا خوب حق ادا کردیا آپ نے۔ ۹/۱۱ پر بھی چشم کشا حقائق پیش کردیے اور قائداعظم کی شخصیت کے کچھ اور نفیس در بڑی خوبصورتی سے وا کیے گئے۔ رتی جناح کے متعلق حقائق سے پہلی بار یوں آگہی ہوئی۔ ایک بڑی ''کھوجی ٹیم'' ہے بھائی آپ کے پاس جس کی ''کھوج'' لگانے کی صلاحیت پر کبھی کبھی رشک آتا ہے مجھ جیسے اوروں کو بھی۔ سچ پوچھیں تو بات وہی ہے من و عن جو بیان کی گئی کہ۔

ہم دیکھتے نہیں تو ہمارا قصور ہے
وہ دیکھنے کو اپنی نظر دے گیا ہمیں

جو میں نے ''کھوجی'' کہا تو دیکھیں یہ حضرت حمزہؓ کا تذکرہ کہاں سے کھوج لگا اور واقعی اتنا دلگداز کہ بہت دیر کچھ اور پڑھنے کو جی نہ چاہا۔ لگا صدیوں کا سفر لمحوں میں طے ہوگیا اور ساڑھے چودہ سو برس پچھلی تصاویر پر جمی گرد لمحہ بھر میں صاف ہوگئی۔ ''حضرت علیؓ کی قیمتی وصیت'' پر سوچنے لگی کہ یہ فقرہ ضرور کندہ کرکے فریم میں اپنے گھر کی بیٹھک میں لگواؤں گی مگر ان جملوں کی تعداد اتنی بڑھتی گئی کہ سوچا یہ وصیت یونہی فوٹو کاپی کرا کے لفافے پر اپنے پانچوں بچوں کا نام لکھ کر فائلوں کے بیچ رکھ دوں گی کہ اس سے نایاب الفاظ وصیت کے لیے اور کہاں ڈھونڈے جا سکتے ہیں؟

(افشاں نوید۔ کراچی)

جگہ بچ گئی ہے کیا کروں؟

ایک جگہ ذکر ہو رہا ہے کہ عمدہ مواد تو ہے ہی اردو ڈائجسٹ کے ڈیزائن بھی بڑے اچھے ہوگئے ہیں۔ ہاں ان میں خالی جگہ کافی ہوتی ہے وہاں بھی کچھ دیا جاسکتا ہے۔ اس پر میں نے انھیں منور ظریف کی ایک فلم کا سین بتایا کہ وہ حکیم بنا ہوتا ہے اور بورڈ لکھوانے جاتا ہے۔ دکان کا بورڈ لکھا جاچکا تو تھوڑی سی جگہ بچ جاتی ہے۔ پینٹر پوچھتا ہے'' جگہ بچ گئی اے ایتھے کی لکھاں؟'' منور ظریف اس کی بات کا فی البدیہہ جواب دیتا ہے لکھ دو نیز یہاں سائیکلوں کے پنکچر بھی لگائے جاتے ہیں۔

ہر شمارہ اتنا عمدہ اور خوبصورت آرہا ہے کہ بے اختیار ماشاء اللہ کہنے کو دل چاہتا ہے۔ ٹائٹل سے لے کر دردل پہ دستک سب روکتے اور متوجہ کرتے ہیں۔ دستک میں آپ نے بہت دلگداز انداز میں والدین کو متوجہ کیا ہے۔ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ موزوں الفاظ سے متوجہ کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ اردو ڈائجسٹ نے حق ادا کردیا۔

(روف طاہر۔ خصوصی مشیر برائے صوبائی محکمہ اطلاعات و نشریات، لاہور)

کیسے بھول گئے؟

ٹائٹل اور فہرست کا بدلا ہوا انداز بے شک بہت اچھا تھا۔ موضوعات بھی سارے ہی گور ہوئے۔ مصری سونامی سے لے کر مزاح، صحت، جنونی مسافر، رتی جناح، چین کی نیند، اسلامی زندگی کی کہکشاں اور وزن نہیں صحت مگر آپ دفاع کو کیسے بھول گئے۔

(نعیمہ حکیم۔ ٹھٹھہ صادق آباد، ضلع خانیوال)

تشخیص اور تجویز

محمد مرسی صدرِ مصر کے بارے میں ستمبر کے ڈائجسٹ میں آپ کی تحریر دیکھی اور پڑھی۔ یقیناً فکرافروز ہے اور جناب مرسی کی ذہانت کو ظاہر کرتی ہے۔ آپ نے جماعت اسلامی پر ہی ایک پیراگراف رقم کیا ہے۔ یہ تنقید ہے، تحسین ہے یا تنقیص اس پر کچھ عرض نہیں کرتا۔ ہر لکھاری کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مختلف امور میں اپنی رائے ظاہر کرے۔ اس پر چیں بجبیں ہونا مناسب نہیں مگر لکھنے والے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ تشخیص بھی کرے اور تجویز بھی دے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

ا۔ التحریر اسکوائر میں جمع ہونے والے وہ ہزاروں لاکھوں نوجوان آئیں گے کہاں سے؟ میرا جواب ہے کہ ہزاروں لاکھوں نوجوان اسی دھرتی سے آئیں گے۔

ب۔ جماعت اسلامی کی پوری قیادت نیک دل بزرگوں کی قیادت ہے۔ عوام سے دور اور عوامی مسائل سے کافی دور۔ میرا جواب ہے کہ میرا جواب ہے نیک دل بزرگوں کی قیادت مطلوب ہے یا سیاہ دل والوں کی؟

(یہ تو کوئی جواب نہ ہوا جناب)

ج۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی دعوت سچی ہے...... عوام انھیں اپنی سیاسی قیادت کا حق دینے کے لیے تیار نہیں۔

(صدیقی صاحب! آپ کا غصہ بجا مگر آپ نے غور نہیں فرمایا تشخیص اور تجویز دونوں موجود ہیں۔ آنے والے برسوں میں جماعت کی یوتھ کی سوچ غالب آنے کے بعد جب جماعت سوشل موومنٹ بن جائے گی تو ہی اس کی دعوت کی اپیل کا حلقہ بڑا ہوگا۔ دوسری صورت میں مجھے تو حالات بدلنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔)

(عتیق الرحمن صدیقی۔ درویش روڈ، ہری پور)

پُرعزم لیڈر ملنے کی آرزو

مصر کے انقلابی رہنما صدر محمد مرسی کے بارے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بزنس میں کامیابی کی کہانیاں لوکل ٹچ کے ساتھ

بیسیوں جگہ تعریف کی ہے۔ اتنی تعریف کم ہی کسی چیز کی زندگی میں کی ہوگی۔ اب اردو ڈائجسٹ پڑھ کر، دیکھ کر اور محسوس کر کے فی الحقیقت دل میں ایک خوشی کا احساس جاگتا ہے۔ آپ پوچھیں گے کیا اچھا لگتا ہے تو یوں سمجھیں کہ پورا اُسلوب۔ گیٹ اپ، کہانیاں، اپنے ہاں کے بزنس مینوں کی کامیابی کی کہانیاں لوکل ٹچ کے ساتھ اور پھر عمدہ اور جدید کھلا کھلا فراخ گیٹ اپ پرچہ میں جان پیدا کر دی ہے۔ ونڈرفل۔

(امیر العظیم۔ سی ای او، فیوچر وژن ایڈورٹائزنگ، لاہور)

تحقیقی تحریر نے معلومات میں خاصا اضافہ کیا اور دل میں اِک خواہش اُبھری ''کاش ہمیں بھی کوئی ایسا پُرعزم اور محبِ وطن رہنما میسر آجائے۔''

میں انٹرنیٹ پر پڑھ رہا تھا کہ ایرانی پارلیمنٹ میں اتنے پی ایچ ڈی ہیں، اتنے حافظ قرآن اور عالمِ دین...... یعنی تمام ممبرز انتہائی پڑھے لکھے ہیں جبکہ دوسری طرف ہم نے جعلی ڈگری ہولڈروں کی ایک کھیپ اپنی قومی اسمبلی میں بٹھا رکھی ہے۔ کسی کی جعل سازی پکڑی جاتی ہے تو ساری ہمدردی اس کے ساتھ ہوتی ہے کہ بے چارہ کیوں پکڑا گیا۔

گوشۂ قائد پر معلوماتی اور دلچسپ تحریریں تھیں۔ معروف ادیب سلیم احمد کو بھی اچھے انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ مجموعی طور پر شمارہ بہترین تھا۔ کہانیاں، بہترین لے آؤٹ عمدہ رسالہ کسی کتاب جیسا مستقل نوعیت کا لگا...... بہت خوب۔ (رانا محمد شاہد۔ بورے والا)

سچے موتیوں کا ہار

اس ڈائجسٹ میں اسلامی زندگی کی کہکشاں، رتی جناح، مری کہانی فرض شناسی کی بے مثال داستان۔ وزن کم کرنے اور صحت برقرار رکھنے والی غذائیں، صحت مند رہنے کے ۲۰ طریقے تو ایسے تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں کہ اس طرح تو کوئی سرجن ڈاکٹر بھی فیس لے کر نہ بتائے۔ مٹاپے سے بچنے کے لیے ایسے ایسے کامیاب غذائی نسخے اور تجربات کا ذکر کسی اور جریدے میں نہیں۔ اردو ڈائجسٹ میں پڑھنے کو اتنا کچھ ملتا ہے کہ میرے پاس لکھنے کو الفاظ نہیں۔ اتنا کہوں گا کہ اردو ڈائجسٹ سچے موتیوں کا ہار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی پوری ٹیم کو اسی طرح محنت اور لگن سے کام کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

(میاں میر احمد مستانہ سہروردی۔ ڈاہرانوالا، ضلع بہاولنگر)

نیا انداز

معیار بے شک روز بروز بہتر سے بہتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لے آؤٹ سے لے کر مضامین کے انتخاب اور ترتیب تک ہر جگہ نیا پن جھلکنے لگا ہے۔

اس مرتبہ اردو ڈائجسٹ کی پیشانی پر لفظ ''نیا انداز'' بہت بھلا لگا مگر یہ لفظ قاری کو مبلغ ۲۰ روپے میں پڑا۔ میٹر (مواد) اس قدر عمدہ اور معیاری ہے کہ اضافہ گراں نہیں گزرا۔

(سخی رشید اعوان۔ گوجرانوالہ)

علم و عرفان سے بھری بوری

دردِل یہ دستک اس ماہ دل پر دستک کے بجائے تازیانے کی طرح لگا۔ نہ جانے کیوں ماں باپ بچوں خصوصاً لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے نام پر کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ تو آبگینے ہیں ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اللہ بچائے ایسی تعلیم اور ایسے اداروں سے جہاں یہ خرافات فیشن کا حصہ ہیں۔ اس کا سبب دین سے دوری ہی ہے۔ ماں باپ جتنی توجہ اور اہمیت آج کل جدید علوم کے حصول پر دیتے ہیں اگر اس کا ۵۰ فیصد بھی دینی تعلیم اور بچوں کی ذہنی تربیت پر دیں تو یوں تباہی نہ

بہت اعلیٰ

پرچہ بہت اعلیٰ ہوگیا ہے۔ یوں سمجھو پڑھنے کے قابل ہوگیا ہے۔ مضامین اتنے عمدہ کہ یقین نہیں آتا۔ جس کی جتنی جتنی محنت ہے اس کو اُتنی شاباش۔

(عطاالحق قاسمی۔ چیئرمین الحمرا آرٹس کونسل)

پھیلے۔ گوشۂ صحابہ میں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے بارے میں پڑھا تو دل بھر آیا۔ سبحان اللہ! وہ کیا مسلمان تھے جو دین کی خاطر قربان ہوئے۔

پنسل کی کہانی سادہ مگر براہِ راست دل میں اتر کر سوچنے پر مجبور کر دینے والی تھی۔ Letter of the Month میں شیر نواز گل صاحب نے اردو ڈائجسٹ کے شمارہ کو ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈی سے تشبیہ دی جو یقیناً سچ ہے مگر سچ تو یہ بھی ہے کہ ہمیں اردو ڈائجسٹ ملتا ہے تو لگتا ہے کہ کوئی مفت میں علم و عرفان سے بھری بوری ہمارے حوالے کر گیا ہے۔

(زرنگار۔ نوکھر منڈی، ضلع شیخوپورہ)

شدتِ درد

ستمبر کا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ قیمت میں ۲۰ روپے کا اضافہ کوئی زیادہ نہیں ہے اس لیے کسی قسم کی معذرت کی ضرورت نہیں تھی۔

آپ کا کالم ہو یا طیب اعجاز کا نوٹ یا پھر الطاف حسن قریشی کا تبصرہ اور تجزیہ، ہر تحریر سے اس ملک و قوم کے لیے ایک تڑپ اور درد کا اظہار نظر آتا ہے۔ اس شدتِ درد کو صرف ملک سے محبت رکھنے والے لوگ محسوس کر سکتے ہیں ورنہ ''ہوس زدہ'' اور حرص زدہ حکمرانوں کے کانوں پر جوں رینگتی ہے اور نہ ہی کیبل زدہ اور موبائل زدہ عوام خوابِ غفلت سے بیدار ہونے پر تیار ہیں۔

(کرامت راؤ۔ گوٹھ محمد ابڑو، ضلع ٹیاری، سندھ)

میں نے تو پرچہ بند کرا دیا تھا

مسلسل لیٹ ملنے پر میں نے اردو ڈائجسٹ ۲ سال پہلے بند کرا دیا تھا۔ کبھی کٹا ہوا ملتا، کبھی پھٹا ہوا۔ ابھی اتفاق سے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ خوبصورت شکل، نفیس، سیلوفین پیکنگ۔ میں نے فوراً بینک جا کر سالانہ خریداری کے پیسے جمع کروائے۔ ڈائجسٹ واقعی نمبر لے گیا ہے۔

(چودھری محمد خان چوہان۔ سیالکوٹ)

لے آؤٹ کمال کی

اردو ڈائجسٹ اتنا عمدہ ہوگیا ہے کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ لے آؤٹ سب سے کمال کی ہے۔ بہت جان پیدا ہو گئی ہے۔ بالکل مزاج بدلا ہے۔ کہانیاں ایک جگہ، مضامین الگ اور ترتیب کے ساتھ پھر ان میں بھی جدت اور تازگی ہے۔ میں بھی اس کا حصہ رہا ہوں۔ کافی محنت کی مگر جیسا مزاج تھا اسی کو چلایا۔ بدلاؤ اب آیا ہے۔

(محمد نعیم بلوچ۔ میگزین گروپ ایڈیٹر روزنامہ نئی بات لاہور)

صحت نہیں وزن کم کریں، بہت عمدہ

ہیلتھ کے حوالے سے بہت عمدہ آرٹیکلز ہوتے ہیں۔ ''وزن کم کریں صحت نہیں'' نے بہت سے ایسے لوگوں کو زندگی دی اور آسانی سے نوازا ہے۔ بہت عمدہ سلسلہ ہے کبھی بند نہ کریں۔ کِڈنی والا آرٹیکل بھی بہت اچھا تھا۔

(ندیم الحق۔ فیز VI، لاہور)

■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اعلانات کی بے اثری، بے وُقعتی اور بے توقیری

افسوس ہوا اُس گھر پر جس میں لوٹ کا مال چھپالیا گیا

درِ دل پہ دستک

اختر عباس

نہ تو یہ درد ایک دن کا ہے اور نہ اس کی دوا کسی ایک دن میں، ایک پل میں اثر کرے گی۔ عام لوگوں تک یہ دکھ پہلی بار اس شدت سے کارٹونوں اور خاکوں کے ذریعے پہنچا، جو ڈنمارک میں شائع ہوئے۔ وہاں کے مسلمانوں نے پہلے وہاں کے اہل علم اور اہل سیاست سے رابطہ کیا، پھر اسلامی ممالک کے سفیروں سے ملاقات کی کہ دل آزاری کا دکھ مشترک تھا۔ دل سے دل جڑتا گیا۔ سبھی ایک اللہ پر ایمان اور رسول اکرمؐ کی محبت کی مضبوط ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یورپ انھیں گزشتہ ۱۵۰ر سال سے آزار دے رہا ہے۔ وہاں کوئی ۶۰ر ہزار سے زائد کتابیں ایسی چھپ چکی ہیں، جن میں آنحضورؐ کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ یورپ کے دانشوروں نے یہ سمجھا اور درست سمجھا کہ مسلمانوں کی محبت کے مرکز اور محور پر اتنے حملے کرو کہ یہ بے حس ہوجائیں، بے بس ہوجائیں۔ یہ ذہنیت وہاں پوری شدت سے کارفرما ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کوئی بدنصیب ایسا نہیں ہوگا، جس نے قلم چلانا اور لفظ لکھنا سیکھا اور آنحضورؐ کی ذات پر اپنی کم علمی کے تیر نہ برسائے ہوں۔

اس نہ ختم ہونے والی مہم کے دو اہداف تھے، اپنی قوم، نسل اور اہل علم کو پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات سے دور کرنا اور دوسرا مسلمانوں کو مدافعانہ پوزیشن پر روکے رکھنا، انھیں ہمیشہ وضاحتوں اور جوازوں کی نہ ختم ہونے والی لاحاصل سرگرمی میں مصروف رکھنا تاکہ وہ کبھی اپنی اصل دعوت، پیغام اور جادواثر قرآن کو نبی مہربانؐ کی ذات، صفات اور اثرپذیری کو لے کر عام لوگوں تک آہی نہ سکیں۔ عیسائی اہل قلم کے لکھے اور تخلیق کردہ لٹریچر کا اثر ایسے مسلمانوں پر بھی ہوا جو پیدا تو ایسے گھر میں ہوئے جہاں مکانوں کے باہر نیم پلیٹ پر مسلمانوں جیسے نام تھے، مگر وہ لٹریچر ہمیشہ یورپ اور مغرب سے آنے والا ہی پڑھتے تھے۔ اللہ اور رسولؐ کی محبت رہنے کو ہمیشہ ایسا دل منتخب کرتی ہے جس کے لیے وہ پہلی محبت ہو۔ دشمنوں پر آنکھیں بند کرکے ایمان لانے والے اور ان کے لفظوں کو اُگلنے اور نگلنے والے اس بنیاد اور لذت و حلاوت سے محروم ہو جاتے ہیں؟ اسی کو سچ مانتے، اسی کو حرف آخر جانتے ہیں۔ ان کے ملجا و ماویٰ، ان کے راہبر و راہنما، سب یورپ کے دانشور اور مستشرق تھے، جن کا کام ہی تشکیک پھیلانا اور ایمان کو کمزور کرنا تھا۔ پہلے یورپی مستشرقین اور پھر مقامی منحرفین سے ہمیں کافی سالوں سے مسلسل واسطہ پڑ رہا ہے۔ غصے اور نفرت کی ایک کیفیت ہوتی ہے جو بالآخر قلوب و اذہان پر طاری ہوجاتی ہے اور شدید منفی ردعمل پر ختم ہوتی ہے۔

اب کے پھر ایسا ہی ہوا۔ امریکا کے رہنے والے ایک مصری قبطی عیسائی نے جو وہاں بھی کسی اہمیت کا حامل نہیں، ایک فلم بنائی۔ سینماؤں پر دکھائی جو فلم بینوں کی توجہ سے ہی محروم رہی اور کوئی بزنس کیے بنا اُتر گئی۔ اس نے عالمِ مایوسی

میں اس کے کچھ حصے یوٹیوب پر ڈال دیے۔ بات یہیں تک رہتی تو شاید یہ مسئلہ اتنی گمبھیر صورت اختیار نہ کرتا۔ نہ کسی نے یہ فلم دیکھنی تھی نہ تبصرہ کرنا تھا۔ غیر معیاری اور نامناسب تحریروں، تصویروں، تقریروں سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ ایک مصری ٹی وی اینکر نے ظلم یہ کیا کہ اس کا ترجمہ کرکے اسے ٹی وی پر چلا دیا۔ یہاں سے احتجاج کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے ملکوں ملکوں آگ لگا دی۔ لیبیا میں امریکی سفیر سفارت خانہ جلنے کے باعث دم گھٹ کر مر گئے۔ تیونس کے علاوہ مصر اور دیگر عرب ملکوں میں جہاں امریکا کئی عشروں سے ڈکٹیٹروں کی مدد اور حمایت کرتا آ رہا ہے، ماضی کی ان تمام پالیسیوں پر لوگوں کا غصہ بھی اُبل پڑا اور احتجاج کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہم تو ہیں ہی عقیدت کے لوگ، عقیدہ کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔ حکومت نے ۲۱ر ستمبر کو ''یومِ عشقِ رسولؐ'' قرار دے کر چھٹی کردی اور عوام کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے راہنماؤں کے بغیر ہی سڑک پر آ گئی۔

کبھی اس حوالے سے غور کریں تو آپ کو ایک عجیب سی حیرت کا سامنا کرنا پڑے گا کہ اصل مسئلہ وہیں رہتا ہے اور ہم وقتی طور پر اس ایشو کو اچھال اچھال کر اپنی ''بہترین صلاحیتوں'' کا اظہار اور استعمال کر لیتے ہیں۔ حل نہیں سوچتے، بدلہ سوچتے ہیں۔ غور نہیں کرتے، نفرت کرنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بہت مضحکہ خیز اعلان کرتے ہیں جو جینے اور جیتنے کے لیے نہیں، مرنے اور مار دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ اعلان کرنے والے بھی جانتے ہیں اور سننے والے بھی کہ ان خالی لفظوں کا کوئی مطلب نہیں۔ کوئی غور نہیں کرتا کہ کچھ دنوں بعد جب یہ مسئلہ پرانا ہو جائے گا، غصہ دب جائے گا تو ان دنوں کیے گئے اعلان کس قدر بے وقعت ٹھہریں گے۔ کون یاد رکھے گا کہ ایک صاحب نے کارٹون بنانے والے کو (یہ جانے بغیر کہ وہ ایک نہیں ۱۲ر تھے)، قتل کرنے والے کو ایک من سونا دینے کا اعلان کیا تھا۔ اول تو اعلان کرنے والے کے پاس اتنا سونا ہونا ہی ممکن نہیں، پھر اس کے کہے کا کیا اعتبار، نہ دلیل، نہ وکیل، نہ اس نے کسی قابل اعتبار فورم، تنظیم، گروہ کو وہ سونا دکھایا، نہ کسی کے حوالے کیا کہ یہ میری طرف سے اعلان کردہ انعام کی امانت ہے اور اسے دے دیجیے جو یہ کارنامہ کرکے آئے۔ انڈیا کے ایک وزیر صاحب نے قتل کرنے والے کو ۶۰ر کروڑ کا انعام دینے کا وعدہ کیا۔ کوئی پوچھے کہ ہزاروں کا ہجوم دیکھ کر صرف داد پانے اور واہ واہ کے ڈونگرے برسوانے کے لیے جھوٹی کارروائی سے آلودہ ایسے اعلانات سے کیا فی الواقعی آنحضورؐ خوش ہوں گے اور اللہ کی رضا اور رحمت حاصل ہوگی۔ جب لوگوں نے وزیر صاحب سے سوال کیا تو کہا کہ میرے پاس پیسے نہیں، آپ لوگوں سے چندہ کرکے جمع کروں گا۔ اب کے ہمارے وزیر ریلوے غلام احمد بلور نے ایک لاکھ ڈالر انعام (کسی کے پاس جمع کرائے بغیر) کا اعلان کیا ہے۔ ایسے اعلانات ظاہر ہے معاشرتی اور قانونی طور پر پذیرائی نہیں پا سکے اسی لیے حکومت کو ہی نہیں اے این پی کو بھی برأت کا اظہار کرنا پڑا۔ ایم کیو ایم کو اللہ موقع دے انھوں نے یہ کہہ کر استعفا کا مطالبہ کردیا کہ یہ ملک کو تنہا کرنے کی کوشش ہے۔ حضور! آپ کے شہر میں ۲۲ر لوگ جان سے گئے اور پوری دنیا میں بدنامی ہوئی۔ اس سے ملک تنہا نہیں ہوا کیا؟ خود آپ تو کسی کو بلا اجازت چھینک بھی آ جائے تو جلوس نکال لیتے ہیں۔ حضورؐ کی محبت میں بھی آگے آتے اور لوگوں کو منظم رکھتے۔

اخباری فوٹوگرافر کو دیکھ کر ''وکٹری'' کا نشان بنانے والے، نعروں کے پوز دکھا کے جعلی تصویریں بنوانے والے، بینروں پر سارا زور اپنے ناموں کو جلی حروف میں لکھوانے پر صرف کرنے والے، دینی معاملات کو کیوں اس قدر غیر سنجیدہ بنانے پر تلے رہتے ہیں۔ ایسے اعلانات سے عزت نہیں ملتی۔ غازی علم الدین اخباری اعلان پڑھ کر کرائے پر نہیں ملتے، دل اور ایمان کے مضبوط فیصلوں سے بنتے ہیں۔ دوسروں کو مارنے پر اکسانے والے اتنے ثواب والے کام کرنے خود کیوں نہیں نکل کھڑے ہوتے۔ نکلیں بھی کیسے کہ دل اس سچی آرزو اور خواہش ہی سے خالی ہوں، سوز اور درد سے آگاہ نہ ہوں۔ بس جلسے، جلوس، احتجاج میں خطاب اور شرکت کی۔ عارضی سی خبر، عارضی سی مشہوری اور عارضی سی شہرت کیسے بڑا کام کروا سکتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اعلان کرنے والے تو یہ تک جانتے نہیں تھے کہ کارٹون کس کس نے بنائے، پھر ان کارٹونوں کا کیا ہوا۔ ایک نے بنوائے، دوسرے نے چھپوائے، پھر دوسرے ممالک کے کتنے اخبارات ہیں جنھوں نے ان کو چھاپا۔ اس تعداد میں کس کس کو شامل کریں گے، کس کس کو چھوڑیں گے، کس کس کو ماریں گے، کیا مارنے کے اعلانات سے ہی وہ سارے مر جائیں گے، کیا مارنا ہی واحد حل ہے، ہماری جان، مال، اولاد سب آنحضورؐ پر قربان، ان کی عزت اور حرمت کے لیے سوچنا اور کوئی مستقل نوعیت کا کام کرنا مطلوب و مقصود کیوں نہیں ہوسکتا۔ ایسے ناپسندیدہ واقعات کے بعد لازم تھا کہ کوئی مستقل ادارہ بنا دیا جاتا۔ وہی ایسے معاملات دیکھتا۔ ان کے جواب دیتا، مغربی ممالک میں علمی روابط بحال کرتا، ان معاشروں میں جا کر سیمینار، کانفرنسیں کرنے کی منصوبہ بندی ہوتی۔ وہاں کے اہلِ علم و اہلِ فکر کے ساتھ مباحثہ و مذاکرہ ہوتا۔ یہ تو دور ہی ڈائیلاگ کا ہے۔ وہاں سے ہی آپ کو ہزاروں مل جائیں گے جو ایسی حرکتیں کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوتے۔ ایک واقعے کو پورے ملک، معاشرے یا وہاں بسنے والوں کا قصور اور جرم سمجھنے کی سوچ ہی بڑی نامناسب اور ناواجب ہے۔ ردِعمل میں صرف غصہ اور سخت جملے ''ایسا..... کرنے والا واجب القتل ہے اور ہم گستاخی کی اجازت نہیں دیں گے، گستاخی برداشت نہیں کریں گے۔'' اب تک کیا نتیجہ دے پائے ہیں۔ ایک دو دن کے مظاہروں کے بعد خالی بیان اور عارضی اعلانِ جنگ بندی، جگ ہنسائی اور بے وقعتی کو جنم دیتا، مذاق بنا دیتا ہے۔

کیا کوئی یہ سوچنے پر آمادہ ہوگا کہ اِس فلم کے خلاف (جو کسی نے دیکھی بھی نہیں) احتجاج کے نام پر ۸؍ارب کا سامان و اسباب جلا دیا گیا۔ خاکے والے سانحے پر پاکستان، الجزائر، افغانستان، کینیا اور لیبیا میں ۲۶؍مسلمان اپنی جانوں سے گئے تھے۔ ناموسِ رسالتؐ کے لیے ایک خاکے کا کام کیے بنا ہم نے اس بار اکیلے اپنے ہی بھائیوں کی ۲۶؍لاشیں گرا دیں۔ زخمیوں کی تعداد کا مت پوچھیں۔ ۸؍ارب کا تو سامان ہی لوٹ ڈالا۔

لوگ بھولے نہ ہوں گے کہ ۱۹۸۹ء میں سلمان رشدی نے ایک ناول لکھا تھا، جس میں کچھ گستاخانہ جملے تھے، اس بدبخت کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ان جملوں کی مذمت میں لوگوں نے دنیا بھر میں اپنے ایمان کو پرچم بنا لیا اور نعرے لگاتے سڑکوں پر آگئے۔ کچھ تو پاکستان میں اپنی جانوں سے گئے۔ ان غریبوں کے نام کیا تھے، وہ کون تھے، بھلا کس کو یاد ہیں۔ رشدی کی موت کے فتوے جاری ہوئے اور ایران نے سرکاری طور پر اس کی موت کی سزا اور انعام کا اعلان کیا تھا۔ یہی معاملہ بنگلہ دیش کی ایک دریدہ دہن تسلیمہ نسرین کے ساتھ بھی پیش آیا۔ دونوں زندہ ہیں، گھومتے پھرتے ہیں۔ اعلان کرنے والے بھی زندہ ہیں۔ کیا اپنے اعلانات کی بے اثری اور بے وقعتی اور بے توقیری سے آگاہ نہ ہوں گے؟ کیا انھیں اپنے اعلانات یاد بھی ہیں، ہم وہ کیوں کہتے ہیں جو کرنا ہمارا مقصد نہیں ہوتا۔ ہم کس کو دکھانا، بتانا اور سنانا چاہ رہے ہوتے ہیں؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اس حوالے سے سر جوڑ کر سوچا اور ایسا فیصلہ کیا جائے کہ خالی اعلان نہ کرنے پڑیں؟ ایک حل تو قرآنی تعلیم (جاہلوں سے اعراض کرو) ہوسکتا ہے، دوسرا حل ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے کسی اعلان کے بغیر پیش کیا تھا۔ فرانسیسی معاشرے میں آنحضورؐ کے خلاف تحریر پڑھی اور پھر پوری عمر انہی کے ہاں رہ کر انہی کی زبان میں سیرت پر ایسا عمدہ اور مدلل لٹریچر تیار کیا کہ دنیا میں خود ایک حوالہ بن گئے۔ کتنے ہی لوگ ان کے دلائل کی عمدگی اور خوبصورتی کی وجہ سے ایمان کی لازوال دولت سے ہمکنار ہوئے۔ وہ پاکستان آئے تو خطبات بہاول پور سے نوازا، جو ہمیشہ ان کے کام کی وقعت، اہمیت اور وسعت کو بڑھاتے رہیں گے۔ اِدھر جنوبی افریقہ میں ایک احمدیدات نے آخری سانس تک عیسائی مشنریوں کا پیچھا کیا۔ دلائل سے انھیں ہمیشہ مات دی، فاتح کہلائے اور اسی اعزاز کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک اسی سلسلے کے گل سرسبد ہیں۔ علم، فہم اور تدبر ایسا کہ ہزاروں نہیں لاکھوں غیر مسلم بھی سننے آتے ہیں۔

اس طرح کے کام کرنے والے تھوڑے، مگر اثرات بہت بھاری ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ ارب مسلمانوں یا ۵۴؍اسلامی ممالک میں نہ سہی کیا اس ۱۸؍کروڑ آبادی

والے ملک میں کوئی ایک فرد، ادارہ سوچنے پر آمادہ نہیں ہوگا؟ حکومتوں کو چھوڑیں وہ نہ قتل کے اعلان کرتی ہیں اور نہ پیچھا۔ یہ کام تو اہل دل اور اہل فہم کو خود ہی کرنا ہوگا۔ سرپرستی چاہے کوئی کرے۔

آنحضورؐ کی محبت میں ایک مستقل ادارے کے لیے ایک ارب روپے کا فنڈ ہی قائم کردیں۔ ۱۰؍ذہین ترین نوجوان سکالرز ڈنمارک کے لیے، ۱۰؍ناروے کے لیے، ۱۰؍سویڈن کے لیے، ۱۰؍فرانس کے لیے، ۱۰؍امریکا کے لیے چن لیے جائیں۔ وہ ان ممالک کی زبانیں سیکھیں، کلچر اور روایات پر عبور اور ان کے لٹریچر تک رسائی حاصل کریں، پھر اپنی عمریں، زندگیاں اسی کام پر وقف کردیں۔ مظاہرے ہوتے رہیں، ریلیاں چلتی رہیں، دکانیں لٹتی رہیں، لوگ گرتے رہیں، مگر وہ خاموشی سے اپنے کام میں مگن رہیں۔ ۸؍سال، ۱۰؍سال، ۲۰؍سال وہ کتنے ہی لوگوں کے دل و دماغ بدلنے اور ان تک ہدایت کا پیغام پہنچانے، ان کے الفاظ، انہی کے ماخذ، انہی کے ذرائع اور انہی کے اذہان بدلنے کے لیے کیا کچھ نہ کرسکیں گے۔ کارٹون بنانے والا ایک ہو یا ۱۲، وہ بُرے بلکہ بہت بُرے، ان کو دوبارہ چھاپنے والے ان سے بھی بُرے، فلم بنانے والا ایک ہو یا دو، امریکی ہو یا مصری، مگر کیا ہماری ساری عمر انہی بُروں کے بارے میں سوچتے اور انھیں بُرا کہتے گزر جائے گی اور ہم ان کروڑوں امریکی اور یورپی انسانوں کے لیے کچھ نہیں سوچیں گے، جنھوں نے نہ کارٹون بنائے، نہ کارٹون بنانے کا سوچا۔ بظاہر یہ واقعہ نئے حادثوں کو ''جنم'' دے رہا ہے اور حادثوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ کیا یہ حادثہ، حادثہ ہی بن کر رہ جائے گا، اقبالؒ نے ایسے ہی تو نہیں کہا تھا:

اس موج کی فرقت میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

کیا ہمارے کام اور سوچیں ایک بار پھر ساحل سے ٹکرائے بغیر ہی رہ جائیں گی۔ سچ بتاؤں تو میں پچھلے کئی روز سے ایک خبر کے انتظار میں ہوں۔ اس نوجوان کے بارے میں جو گھر سے کلمہ پڑھتے ہوئے، سڑک پر درود شریف پڑھتے اور نعرے لگاتے بڑے جلوس کا حصہ بنا ہوگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساری، محبت، ایمان ایک طرف رکھ کر بینک لوٹنے والوں میں شامل ہوگیا۔ تبت سنٹر، الائیڈ بینک اور کے ایف سی کو لوٹا اور مالِ غنیمت میں ایک ایل سی ڈی پا کر مطمئن اور شانت ڈاکو کی طرح اپنے کندھے پر رکھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ منظر کیمرے نے محفوظ کیا۔ معاصر عزیز پاکستان نے شائع کیا۔ ہزاروں لوگ اس کے گواہ بنے۔ اللہ کے ہاں جانے اور آنحضورؐ کے سامنے شرمسار ہونے کی بات تو بہت دور کی ہے۔ خدا جانے ایسے بے حس لوگ کسی ایسے دن اور لمحے پر یقین بھی رکھتے ہیں کہ نہیں۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ جس گھر میں لوٹ کا یہ مالِ حرام گیا ہوگا اب تک اس گھر کے سربراہ کا، اس کا والدہ کا، کسی بہن بھائی، کسی عزیز رشتے دار حتیٰ کہ ہمسائے اور دوست کا بھی بیان اور فون نہیں آیا کہ ہم نہ اس کے جرم میں شامل ہیں نہ اس سے فائدہ اٹھانے والوں میں۔ افسوس ہے ہر اُس گھر پر، جس میں آنحضورؐ کے نام پر لوٹ کا مال چھپا لیا گیا۔ سرکار کو بہت کام ہوں گے۔ پولیس کو ایسے لٹیروں کے گھروں تک پہنچنے سے کس نے روکا جنھوں نے ہمیں پوری دنیا کے سامنے شرمسار کیا ہے۔ یاد رکھیے معصوم لوگوں کی موٹر سائیکلوں اور چھوٹی چھوٹی کاروں کو توڑنے والے لڑکوں کو کسی سیاسی جماعت یا کسی کالعدم تنظیم کے کھاتے میں ڈال کر اپنی ذمہ داری سے فارغ نہ ہوجائیں۔ میڈیا اور اخبارات میں سے کچھ تو اہل دل نکلیں جو ان کا پیچھا کریں۔ وہ جنھوں نے نہ اپنے والدین کی تربیت کا احساس کیا نہ انھیں اساتذہ کی تعلیم کا پاس رہا۔ اپنے ہی ملک کے اداروں، بینکوں، دکانوں اور ہوٹلوں کو لوٹتے اور اپنے اندر کی meanness کا اظہار کرتے رہے۔ معاشرے نے اجتماعی طور پر بیدار ہو کر ایسی ناخلف اولادوں سے برأت کا اظہار نہ کیا، انھیں سزا سے ہمکنار نہ کیا، تو یقین مانیے آنے والے دنوں کسی ایسے ہی جلوس، جلسے کے اختتام پر ہم اور آپ پھر ماچس کے سرے کی طرح دکھ اور تکلیف سے جلتے رہنے کا عذاب سہیں گے اور بھول جائیں گے کہ اللہ اور رسولؐ کی محبت رہنے کو ہمیشہ ایسا دل منتخب کرتی ہے جس کے لیے وہ پہلی محبت ہو.....

■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

۲۰۰۰ روپے کی کتب کے انعامات

مرتب: لیفٹیننٹ کرنل (ر) مبشر احمد (دوالمیال، چکوال)

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر ۱۸ر سے ۲۸ر سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ ستمبر میں چھپنے والے اسلامی کوئز کے درست جوابات

کوئز نمبر ۱: (الف) ریاض الجنۃ (ب) مسجد اقصیٰ کوئز نمبر ۲: (الف) غزوۂ بدر (ب) سورۃ الانفال

درست جوابات دینے والوں کے نام

حافظ احمد رضا (فیصل آباد)، محسن رضا (گوجرانوالہ)، ہمایوں شریف (لاہور)، زاہد اعوان (شیخوپورہ)
نوید صابر (لاہور)، رضوان احمد (حافظ آباد)، حافظ محمد عثمان (بہاولنگر)، مریم علوی (فیصل آباد)
سدرۃ المنتہیٰ (فیصل آباد)، اسما علوی (فیصل آباد)، حسام اللہ علوی (فیصل آباد)
نصرت منیر (نواب شاہ)، عمار عبدالرحمن (کراچی)، عمران فاروق (ڈیرہ اسماعیل خان)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

۱۔ رضوان احمد (حافظ آباد) ۲۔ مریم علوی (فیصل آباد) ۳۔ نصرت منیر (نواب شاہ) ۴۔ عمران فاروق ملوانہ (ڈیرہ اسماعیل خان)

اسلامی کوئز ۱

''حضرت آمنہؓ یثرب جاتے وقت محمد ﷺ کو ساتھ لے گئی تھیں اور اس سفر سے واپسی پر آپ راستے میں اچانک انتقال فرما گئی تھیں۔ نصف سفر ہی مکمل ہوا تھا کہ سڑک کے کنارے ایک گاؤں میں جہاں مکانات ایک دوسرے سے فاصلے پر بکھرے ہوئے تھے، آپ کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ مغموم بچہ جو بمشکل ۷ر سال کا تھا اسے سیاہ فام غلام لڑکی مکے لے آئیں۔ اس لڑکی اُم ایمن نے اپنے کم عمر آقا کی بڑی خدمت کی۔''

سوال ۱۔ حضور ﷺ کی والدہ ماجدہ کی تدفین جس گاؤں میں ہوئی اُس کا نام بتائیں؟
سوال ۲۔ حضور ﷺ کو مکہ لانے والی غلام لڑکی کا نام بتائیں؟

اسلامی کوئز ۲

''جس طرح حضرت حمزہؓ نے زبیر ابن مطعم کے چچا طعمہ کے سر پر وار کر کے دو ٹکڑے کر کے زمین پر گرا دیا تھا میں نے بھی اپنے نیزے کا توازن درست کیا اور پوری طاقت سے حمزہؓ پر دے مارا۔ یہ حمزہؓ کی رانوں کے درمیان لگا۔ وہ غیض و غضب میں آ گئے اور واپس پلٹے تاکہ مجھ پر حملہ کر سکیں مگر قوت جواب دے گئی تھی۔ وہ زمین پر ڈھیر ہو گئے اور موقع پر ہی جان دے دی تھی۔''

سوال ۱۔ حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے والے شخص کا نام بتائیں؟
سوال ۲۔ حضرت حمزہؓ کس غزوہ میں شہید ہوئے؟

آپ کے جوابات ہمیں ۱۵ر تاریخ تک مل جانے چاہئیں

انعامات کے لیے تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

۴۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور

مدیر اُردو ڈائجسٹ

325۔ جی III، جوہر ٹاؤن لاہور

ہیڈ آفس: بیرون منصورہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk